ہر گھر کی زینت
ماہنامہ
دوشیزہ
کراچی
October
2014
عید الاضحیٰ مبارک
WWW.PAKSOCIETY.COM

بانی
سہام مرزا

ماہنامہ
دوشیزہ
کراچی

مُدیرِ اعلیٰ ـــــ منزہ سہام

مُدیر ـــــ کاشی چوہان

نائب مُدیر ـــــ دانیال شمسی

منیجر مارکیٹنگ ـــــ زین العابدین

قانونی مُشیر ـــــ جی ایم بھٹو (ایڈووکیٹ ہائی کورٹ)

انکم ٹیکس ایڈوائزر ـــــ مخدوم اینڈ کمپنی (ایڈووکیٹ)

MEMBER APNS CPNE
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز

اکتوبر 2014
جلد:42 ☆ شمارہ:10
قیمت:60 روپے

خط وکتابت کا پتا
110، آدم آرکیڈ شہیدِ ملت روڈ
بہادر شاہ ظفر روڈ۔ کراچی
فون: 021-34939823-34930470
ای میل: pearlpublications@hotmail.com

منیجر ایڈمن اینڈ سرکولیشن: محمد اقبال زمان ☆ کمپوزنگ/گرافکس: محمد کاشف ☆ عکاس: موسیٰ رضا/مرزا محمد یاسر

الٹراوائلٹ ... کاشی چوہان 07

زادِ راہ منورہ نوری خلیق 08

محفل مدیر 10

باتیں ملاقاتیں

دل کی باتیں ... دلشاد نسیم 31

فہیم برنی سے ذیشان فراز 35

منی اسکرین علی رضا عمرانی 33

ناول

تیرے عشق نچایا بینا عالیہ 38

آئینہ، عکس اور سمندر عقیلہ حق 204

مکمل ناول

کہانی تم بھی ہو! فرزانہ آغا 166

رحمٰن، رحیم، سدا سائیں اُمِ مریم 90

ناولٹ

میرے پرندۂ دل نعمان اسحٰق 136

افسانے

میٹرو بس دردانہ نوشین خان 60

کمہار بینا تاج 80

عیدالاضحٰی مبارک

تم میرے ہو — نوشین اقبال نوشی — 126
ٹیڑھی تحریر — منیبہ چوہدری — 162
اِک تیرے جانے... — نصرت سرفراز — 158
آ گہی کا پل — مومنہ بتول — 199

انتخابِ خاص

صندوقچی — واجدہ تبسم — 229

رنگِ کائنات

اِک ذرا بکر منڈی تک — معین کمالی — 243

دوشیزہ میگزین

دوشیزہ گلستاں — اسماء اعوان — 234
نئے لہجے — قارئین — 238
یہ ہوئی نابات — زین العابدین — 240
لولی وڈ بولی وڈ — ڈی خان — 246
نفسیاتی الجھنیں — مختار بانو طاہرہ — 250
کچن کارنر — نادیہ طارق — 252
حکیم جی! — محمد رضوان حکیم — 255
بیوٹی گائیڈ — ڈاکٹر خرم مشیر — 257

افسانے

کالا جُوتا — فصیحہ آصف خان — 120
اماں کا بکرا — نسیم سحر — 74

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری
پاکستان (سالانہ)......720 روپے
ایشیا' افریقہ' یورپ......5000 روپے
امریکہ' کینیڈا' آسٹریلیا......6000 روپے

پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: سٹی OB-7 تالپور روڈ۔ کراچی
Phone : 021-34939823-34930470
Email : pearlpublications@hotmail.com

الٹراوائلٹ شعاعیں

الٹروائلٹ شعاعیں دیکھی ہیں آپ نے؟

بالکل ایسی ہی شعاعیں ہمارے اور آپ کے درمیان بھی کھنچ چکی ہیں۔ جب دلوں میں گنجائش ختم ہو جائے۔

زبان! وہ کام کرنے لگے جو تلوار نہ کرے......

تو پھر کیا رہ گیا درمیان...... صرف یہ الٹروائلٹ شعاعیں...... جو رستے میں آیا، پھٹ جائے گا، کٹ جائے گا۔

شہر میں پھوٹتے ہنگامے، شدید عوامی احتجاج...... ہمیں کس سمت لیے چلا جا رہا ہے۔

کبھی غور کیا ہے......

اگر حالات نہ سنبھلے تو اِس سرزمین میں گل کھل سکیں گے۔ انسانیت سانس لے سکے گی۔ آزادی اپنا تشخص برقرار رکھ پائے گی؟

سوچیے نا...... ہم مل کر سوچتے ہیں۔

شہر میں آدمی تو قتل نہیں ہوتا۔ صرف سر کاٹے جاتے ہیں۔ صرف آوازیں ذبح کی جاتی ہیں۔ اور اب تو قربانی کا تہوار بھی آن پہنچا ہے۔

کیا ہونے والا ہے؟ کبھی سوچیے نا...... غور کریں۔

قربانی کس کی ہونے والی ہے۔

میری، آپ کی یا مادرِ وطن کی۔

اب غور کرلیں اور جاگ جائیں۔

ورنہ تعصب کی یہ الٹراوائلٹ شعاعیں ہمیں پھاڑ کھائیں گی۔

کاشی چوہان

زادِ راہ

ایک مسلمان اچھی طرح سے جانتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے حضور اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس تک ہر نبیؑ اسلام کی دعوت ہی لے کر آیا کیونکہ یہی دعوت عقل و دانش کی بنیاد پر ہے اور یہی تعلیم عقیدے و عمل میں رچ بس جانے والی ہے جس کے بعد تجربے اور......

زندگی کو آسان، باعمل اور ایمان افروز بنانے کا روشن سلسلہ

ہمیں کیسا گھر بنانا چاہیے؟ یہ جاننے کے لیے ہماری نگاہ بجس نبیؐ کے گھر کی طرف جاتی ہے جن کا ہمیں اتباع کرنا ہے۔ اس اتباع اور اس پیروی کے لیے ہم دیکھتے ہیں کہ آغاز میں آپ ﷺ صادق اور امین کہلائے۔ عرب، یمن، حبش، نجد اور شام کے جہاں تجارت میں چرب زبانی چلتی تھی، وہاں ان سب کو ایمان داری، سچائی اور امن کے معنی سمجھا دیئے۔ حرب الفجار، حلف الفضول اور تنصیب سنگِ اسود کے تمام واقعات اسی امن اور سچائی کی کاوشوں کے عنوان تھے۔ اب شادی کا وقت آیا تو وہ جوان جو اخلاق اور کردار کے اعلیٰ ترین معیار پر فائز ہو، جو اپنے اعلیٰ اطوار سے دیکھنے والوں کے لیے مشعلِ راہ بن گیا تھا جس پر دس قبیلوں کی دوشیزاؤں کی نظر تھی۔ اس نے اخلاق اور کردار کے معیار پر ہی اپنے سے پندرہ سالہ بڑی خاتون کے حق میں فیصلہ کیا اور یہ شادی عمل میں آئی اور ایک گھر بن گیا۔ آپ ﷺ کی ذمے داریاں بہت بڑھ گئی تھیں۔ ابھی تک آپ ﷺ تنہا تھے مگر اب ایک گھر بن گیا تھا لہٰذا کاروباری تعلقات بڑھ کر گھر تک آنے لگے تھے۔

یہ گھر اس ہستی کا تھا جو اپنی بھلائی سے زیادہ، دوسروں کے بارے میں سوچتا تھا۔ آپ ﷺ نے حلف الفضول میں جو حلف اٹھائے تھے، اب اپنا گھر بن جانے کے بعد ان سب پر عمل کر کے ان سب لوگوں کو عافیت کا یقین دلاتے تھے۔ یہ گھر دراصل وہ گوشۂ عافیت تھا جہاں نبوت سے بہت پہلے ہی تقویٰ اور خشیتِ الٰہی کی ابتداء ہوگئی تھی۔ تنصیب کعبہ کے عمل سے آپ ﷺ نے جس ہولناک جنگ کی تباہی کو روک کر ان سب سرداروں کو امن کا درس دیا تھا، اب وہ درس اسی گھر سے جاری ہوگیا تھا۔

یہی وہ ہدایات ہیں جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاءؑ کو مبعوث فرمایا اور اسی ہدایت پر عمل کر کے یا نہ کر کے انسان دو جماعتوں میں بٹتے گئے۔ دو قومیں بنتے گئے۔ اسی ہدایت اور اسی تعلیم کی تکمیل حضور اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس پر ہونے والی تھی جس کی دعوت اللہ تعالیٰ کے آخری نبیؐ نے لفظوں سے بھی دی اور عمل سے بھی۔ اس ہدایت پر عمل کرنا اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے اور اس عمل کا اتباع کرنا رسول اللہ کی اطاعت ہے اور یہی اتباع،

یہی پیروی زندگی اور آخرت میں فلاح اور نجات کا ذریعہ بن جانے والی ہے ورنہ ہمارا شمار ان ہی میں ہوگا جنہیں ”وَالذینَ کفَرُوا و کذّبوا بآیتنا أولٰئِکَ اصحٰبُ النَار“ میں ہوگا۔ اپنی زندگی میں ہر کام کرنے کے لیے ہمیں پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ اس وقت اللہ تعالیٰ کے آخری نبی ﷺ نے کیا انداز اختیار کیا تھا اور کس طرح زندگی گزاری۔ اس موقع پر سب سے زیادہ اہمیت ایک ”گھر“ کی ہے جہاں سے ہماری تمام ذمے داریوں اور ایکٹی وٹیز کا آغاز ہوتا ہے۔

یہاں آنے والوں کو خیر اور بھلائی کی تعلیم اور امن پسندی‘ وسعتِ اخلاق اور پاکیزہ اطوار کے درس کی ہدایت عمل سے ملتی تھی۔ اللہ تعالیٰ کے آخری نبی ﷺ یہ کبھی نہیں کہتے تھے کہ تم یہ کرو بلکہ اپنے عمل سے سکھا دیتے تھے کہ تمہیں یہ کرنا ہے۔ مؤرخین نے آپ ﷺ کے بارے میں واقعات کو کچھ اس طرح سے لکھا ہے کہ آپ کے لیے گوشہ نشین اور مسلسل جستجو کرنے والے انسان کا تصور بن جاتا ہے‘ لیکن جب ہم بہت ڈوب کر آپؐ کی حیاتِ مقدس کے ہر شعبے کو پڑھتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ﷺ بازار بھی جاتے تھے۔ خرید و فروخت بھی کرتے تھے۔ آپ ﷺ مذاق بھی کرتے تھے۔ خورد و نوش کی اچھی چیزوں سے خوش بھی ہوتے تھے کیونکہ آپ ﷺ کا مقصدِ حیات ہی ایک کامل ترین تعلیم کو عمل کی شکل میں پیش کر کے اس کائنات کو سنوارنا تھا جس کے لیے محض گوشہ نشین نہیں بلکہ ایک الوالعزم انسان کی ضرورت تھی جو ہدایت دینے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو اور ہدایت منوانے کی صلاحیت بھی۔ جو جو کچھ زبان سے کہے‘ خود اس پر عمل کر کے بتائے کہ یہی ہدایت لائقِ عمل ہے۔

☆☆......☆☆
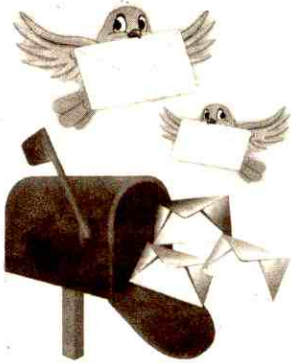
محبتوں کا طلسم کدہ' خوب صورت رابطوں کی دلفریب محفل

خط بھجوانے کے لیے پتا: ماہنامہ دوشیزہ ڈائجسٹ۔ 110 'آدم آرکیڈ' شہید ملت روڈ/بہادر شاہ ظفر روڈ۔ کراچی
E-mail:pearlpublications@hotmail.com

پیارے ساتھیو!

عید قرباں کی آمد آمد ہے۔ امید ہے عید کی تعطیلات میں پرچہ آپ کے ہاتھوں میں ہوگا۔ آپ کو اس ماہ کا پرچہ کیسا لگا، آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔ آیئے سب سے پہلے دیکھتے ہیں اس ماہ ہمارے ساتھیوں کی کیا خبریں ہیں۔

☆ ہماری دوست لکھاری شمسہ فیصل گزشتہ ماہ ایک بہت پیارے سے بیٹے کی والدہ بن گئی ہیں۔

☆ ہماری لاڈلی لکھاری عقیلہ حق اِن دنوں اپنے بھانجے ارسلان اختر کی طبیعت کی خرابی کے باعث بہت پریشان رہیں۔ قارئین سے ارسلان کی صحت یابی کے لیے دعا کی استدعا ہے۔

☆ غزالہ جلیل راؤ کا نیا ناول ''جانیا اور جگنو کا آنگن'' خزینہ علم وادب کے زیرِ ادارت شائع ہوگیا ہے۔

☆ ہماری سینئر لکھاری اور ہر دلعزیز سنبل کی خالہ، افسر سلطانہ حج کی ادائیگی کے لیے روانہ ہوگئیں۔ افسر سلطانہ کو ہماری طرف سے بہت بہت مبارک باد۔

☆ سب کی پیاری اور ہر دلعزیز رضوانہ کوثر کے بیٹے حسن جمال کو 14 اکتوبر کو سال گرہ کی بہت بہت مبارک باد۔

☆ ہماری بہت عزیز ساتھی فصیحہ آصف خان کو ان کی شاعری پر تقیبی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ فصیحہ کے دو عدد ناولٹ کے مجموعے ''جیون جھیل میں چاند کرنیں'' اور ''عشق کا کوئی انت نہیں'' نواب سنز پبلی کیشنز کے تحت شائع ہوگئے ہیں۔ (مبارک باد قبول کریں فصیحہ)

کراچی سے ایک عرصے بعد ہماری بہت بہت پیاری شمع حفیظ کی محفل میں آمد ہے۔ لکھتی ہیں، ڈیئر کاشی، جیتے رہو، خوش رہو۔ آج اتنے عرصے بعد محفل میں آئی ہوں کہ اب سمجھ نہیں آ ئی کہاں سے شروع کروں۔ چلو پہلے رسمی کارروائی نمٹا لیتے ہیں۔ کیسے ہو کاشی؟ ارے نہیں، آج یہ سوال بے کار ہے، تم جیسے بھی ہو' دوشیزہ' کے صفحات پر بہ خوبی جھلک رہے ہو۔ ویسے سچ یہی ہے تمہارے اصرار نے مجھے محفل دوشیزہ میں دوبارہ آنے پر مجبور کیا۔ سو اصرار کرنے پر شکریہ، ورنہ جو جمود مجھ پر طاری تھا شاید کبھی نہ ٹوٹتا۔ کاشی جی...... تعریف تو تمہاری کرنی ہی

پڑے گی۔ 'دوشیزہ' کو نک سک سے خوب سنوارا ہے تم نے، خوش رنگ پیراہن والی نکھری ستھری دوشیزہ اپنی ہر ادا میں یہ احساس دلاتی ہے کہ کسی نے اس کا 'Make Over' بڑے چاؤ سے، بڑی کاوشوں اور محنتوں سے کیا ہے۔ تمہاری محنت و کاوش کو سلام، اداریہ بھی کمال کا لکھ رہے ہو۔ اتنی کم عمری میں اتنی پختگی؟ شاباش کاشی، چلو آؤ کمر پر تھپکی دوں...... گڈ بوائے۔

اب بات کرتے ہیں ایوارڈ فنکشن کی، اگست کے شمارے میں تمہاری 'قلمکاریاں' تقسیمِ انعامات کی تقریب کے حوالے سے عروج پر تھیں، تفصیل جان کر اچھا لگا لیکن دوشیزہ کا ایوارڈ نمبر **2** خاصے کی چیز رہا۔ پڑھ کر لطف آ گیا۔ میری جانب سے تمام ایوارڈ یافتگان کو دلی مبارکباد اور اب شروع کرتی ہوں پیاری سی فرزانہ آغا سے فرزانہ جی، کیا بات ہے آپ کی رنگِ محفل اور وہ بھی افسانوی انداز میں۔ سچ مژدۂ جانفزا لگا، آپ کے پاس اتنا ذخیرہ الفاظ ہے کہ اس کے برجستہ استعمال پر رشک آتا ہے۔ سدا خوش رہیے۔ آپ تقریب میں فراز کو بھی ساتھ لائیں۔ اچھا کیا۔ کاش میں آپ سے مل پاتی۔ دردانہ نوشین خان آپ ایئر سروس سے نالاں نظر آنے کے بعد تیاری اور خواری کے مراحل طے کرتی دکھائی دیں۔ ایک بات ضرور کہوں گی دردانہ اتنی رقم خرچ کر کے آپ کتاب تو چھپوا لیتیں لیکن خوشیوں بھری اس محفل نشاط سے جو لمحے آپ نے کشید کیے وہ لاکھوں پر بھاری ہیں اور ان کی یادیں آپ کی تنہائی میں بار بار خوشبو بن کر مہکیں گی۔ رفعت سراج، آپ کی رفعتوں کو سلام، آپ نے ایک بہترین استاد ہونے کو ثابت کیا۔ تقریب میں کاشی کی تعریف نہ کر کے غیر جانبدار ہونے کا احساس دلا کر بے شک آپ نے اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کیا لیکن آپ کی جہاندیدگی نے شفقت و محبت سے کاشی کو سراہ کر بھی اپنے تاثرات اچھے پیرائے میں بیان کیے، بے شک جذبوں کے درمیان فاصلہ نہیں ہوتا، اس سے کسی کو انکار نہیں۔ شائستہ عزیز، یعنی ہر دل عزیز اور میری من پسند لکھاری، آپ نے حسبِ سابق خوش گفتاری اور سلیقے سے محفل کے راز فاش کیے اور صبیحہ شاہ کے گھر پر جمی محفل کا احوال بھی خوب برجستگی سے تحریر کیا۔ گجروں سے لے کر دوستوں تک اور گانوں سے لے کر کھانوں تک ہر لمحہ واقعی نشاط انگیز تھا، شاید سبھی پڑھنے والے میری طرح لطف لے چکے ہوں گے۔ دلشاد نسیم، اتنا اختصار، بھئی کمال ہو گیا بہت خوب...... فرحت صدیقی، چاہت و خلوص میں ڈوبے میٹھے بولوں سے مہکتے تاثرات ویسے آپ کی 'موتیوں کی لڑی' بھی بے حد چمکدار تھی۔ رضیہ مہدی آپ کو تصاویر میں دیکھ کر دل شاد ہوا، اعتبار کریں رضیہ جی، رابطہ نہ ہونے کے باوجود میں آپ کو آج بھی اپنی جملہ دعاؤں میں یاد رکھتی ہوں اور دل سے آپ کی عزت کرتی ہوں، کاشی سے گفتگو کے سے اسٹائل میں کیا گیا آپ کا تبصرہ بھی بہت خوب رہا۔ اللہ آپ کو صحت کاملہ اور عمرِ خضر عنایت کرے۔ آمین۔

ناہید فاطمہ حسنین، سادگی اور پرکاری کا حسین سنگم، سادہ اور آسان الفاظ میں دلچسپ اندازِ بیان سے مرصع تبصرہ، بہت خوب! سنبل حسبِ معمول خوشگواریت کا احساس دلاتی لڑکی، (خوش ہو جاؤ میں لڑکی کہہ رہی ہوں) عقیلہ حق وہ بھی اچھی قلمکار اور شاید سبھی کی اچھی دوست ہیں۔ اندازِ بیاں رمی رہا مگر تاثرات اچھے لگے۔ عقیلہ بے فکر رہو یار۔ تم انشاء اللہ ہر سال ایوارڈ حاصل کرو گی۔ گارنٹی مجھ سے لے لو۔ نیر شفقت شاید یہ نام کا اثر ہے کہ نیر کو دیکھتے ہی ان کی شخصیت میں محبت و شفقت کا عنصر بدرجہ اتم محسوس ہوتا ہے۔ اپنے دل کا حال سنانے کے بعد اپنے تاثرات بیان کرنے میں کسی کنجوسی سے کام نہیں لیا، مزہ آ گیا۔ نسیم نیازی پیاری سی نسیم نے اپنی بات،

اپنی ہی 'اُلجھن سلجھن' سے شروع کی اور پھر رائٹرز سے میل ملاقات پر تمام کی۔ کاشی جی! اور کیا لکھوں خط کی طوالت قلم تھام رہی ہے۔ آج اتنے دن بعد آئی ہوں تو کیا سب کہہ دوں؟ بُری بات، محفل میں دوسروں کو بھی جگہ ملنی چاہیے میں بھی اب ہر ماہ حاضری لگاتی رہوں گی، ٹھیک ہے نا۔

ھ: عزیز ترین شمع جی! آپ کے بغیر سچ مچ کچھ خلا تھا کہ چاہ کر بھی سمجھ نہ آ رہا تھا مگر اب آپ آ گئی ہیں تو غیر حاضری قابل قبول نہ ہوگی۔ ہم سب نے آپ کو miss کیا۔ سلامت رہیے اور باقاعدہ رہیے۔

✉: کراچی سے، ہم سب کی پیاری، سنبل صاحبہ کی بھرپور پنج ماہی آمد ہے، لکھتی ہیں آج پورے پانچ ماہ بعد خط لکھ رہی ہوں وجہ تمہیں معلوم ہے مستقل تبصرہ کروانا ہے تو اس شکایت کا ازالہ کر دو۔ تمہارے اداریے کمال کے ہوتے ہیں نثر میں شاعری کوئی تم سے سیکھے خصوصاً آسمانی پری تو لاجواب تھا۔ دلشاد بھی دل کی باتیں خوب کہہ رہی ہیں۔ تیرے عشق نچایا تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے رکا نہیں اور تھینکس عالیہ! ماہین کو لگام دینے کا، خواہ محبت کی ہی سہی، کیونکہ وہ جن چکروں میں تھی وہ نا قابلِ برداشت تھے۔ خار مغیلاں بڑا اچھا چلا اور خصوصاً اینڈ کہ انسان زندوں کی حفاظت کرلے مگر مُردوں کی کیسے کرے؟ رحمٰن رحیم میں جوگر ہیں چھوڑ دی تھیں۔ اُم مریم نے، وہ کھل رہی ہیں ویلڈن۔ عقیلہ اب ناول کے بروں کو لگام دینا شروع کر دیں۔ محبت رائیگاں میری اچھا ناول تھا مگر مجھے مقدس سے ویسی ہمدردی نہیں تھی جیسی باقی پڑھنے والوں کو رہی ہوگی کیونکہ شادی سے بھی پہلے اعتماد و اعتبار کا رشتہ ہے۔ مقدس نے اپنے شوہر کا اعتماد توڑا، اس کے اعتبار کا خون کیا تھا وہ سزا کی مستحق تھی اور جن کے لیے توڑا تھا وہ بھی ظاہر تھے۔ اب پہلے باتیں ہو جائیں اراکین محفل سے، وہ تمام لوگ جنہوں نے میرے لیے دعائیں کیں ان کو جزاک اللہ، شکریہ کہہ کر میں آپ کا عمل کھوتا نہیں کروں گی۔ ایڈیسن اللہ تمہیں صبر عطا فرمائے (آمین) اور تمہارے والد کو اپنے نیک و پسندیدہ بندوں میں جگہ دے کر ان کے درجات بلند کرے (آمین) ایڈیسن جنم جلی زبردست ہے خصوصاً بی جی اور شائستہ کا کردار کیا کمال لکھے ہیں تم نے ویلڈن۔ رضیہ مہدی، نگہت، عقیلہ اور شائستہ تم سب کو ایوارڈ مبارک ہوں اور عقیلہ تمہیں دو کتابوں کی اشاعت بہت مبارک ہو میری کتابیں کہاں ہیں؟ رفعت سراج، صائمہ حیدر کو گھر مبارک، ناہید فاطمہ، سیما غزل کو ایوارڈ مبارک۔ سجاد احمد بابر بہت شکریہ اتنی عزت واحترام دینے کا ساحل ابڑو کا خط پڑھ کر شدید حیرت ہوئی۔ وہ ہماری کہنہ مشق رائٹر کو مطالعہ وسیع کرنے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ وہ اس مقام پر ہیں، جس پر انہیں آپ جیسے کسی بھی شخص کی سند کی ضرورت نہیں ہے اور آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے عقیلہ نے لفظ کہانی درست لکھا تھا۔ کہانی کا انداز بیانیہ تھا۔ جو کہ آپ کا تھا، افسانے کا انداز واقعاتی ہوتا ہے۔ مجھے بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ آپ لوگ ایک آدھ تحریر کے بعد خود کو اتنی توپ چیز سمجھنے لگتے ہیں کہ بڑے بڑے رائٹرز کے منہ آتے ہیں آپ کی تحریر انتہائی خشک تھی۔ لوگ فلسفے کے دقیق مسائل حل کرنے کے لیے ڈائجسٹ نہیں لیتے انہیں کچھ چاہیے ہوتا ہے۔ ہر شخص کی پسند ناپسند ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اس کے پیچھے لٹھ لے کر پڑ جایا جائے آپ کو سوری کرنا چاہیے عقیلہ سے۔ مئی میں نشاط کا ماں ری زبردست تھا۔ وہ جس ماحول میں لکھتی ہیں وہ بولتا ہے۔ ان کی تحریر، میں وراثت شاندار تھی بابر نایاب موضوع اچھا مگر پیش کرنے کا انداز بوجھل تھا۔ عامر زمان فلسفہ کم ہوتا تو اچھا ناولٹ تھا فلسفہ اور غیر ضروری طوالت تحریر کو بوجھل اور پڑھنے والے کو بور کر دیتی ہے۔ مومنہ کی پہلی تحریر آثار اچھے ہیں۔ آگاہی زبردست، نینی مام بہتر۔
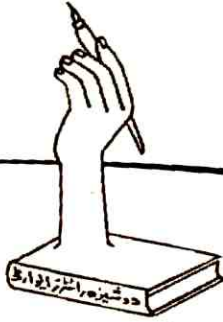
دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ
ستمبر 2014 کا نتیجہ: قارئین نے مندرجہ ذیل تحریر کو پسند کیا ہے
"تجسیم سے تقسیم تک" رفعت سراج
آپ کی نظر میں اس ماہ "دوشیزہ" کی بہترین تحریر کون سی ہے؟
دوشیزہ
اکتوبر 2014
عنوان:
قلم کار:
نام:
پتا:
ماہنامہ دوشیزہ کراچی

جون دلشاد کی عرضی دل کو چھوگئی، سلامت رہے دوستانہ ہمارا۔ فاروق اچھے رائٹر ہیں۔ مگران کی تحریروں میں جدائی کی کسک ضرور ہوتی ہے۔ صفیہ کے افسانے کا اینڈ خوش آئند تھا۔ جب ہم خود کو نوکر سمجھنا بند کریں گے تو دوسرا بھی سمجھے گا۔ حافظہ مون میری رائے بھی دیگر کی طرح عثمانی کے لڑکے میں کچھ تھا ہی نہیں کیا کہوں۔ گونگی چیخیں صنفِ نازک قربانی کی بکری آئیم ٹائیرڈ پڑھ پڑھ کر۔ مینا تاج تم نے اپنے اندر سے ہٹ کر لکھا۔ مگر سیماب کی بات درست تھی کہ وہ دونوں دوغلے تھے۔ محبت محبّ سے نبھائی مگر شادی کسی اور سے کی۔ اجلے لوگ کا میسیج اچھا مگر انداز خشک تھا۔ پڈنگ عورت کی نفسیات کو اجاگر کرتا افسانہ تھا۔ ترقی اردو پڑھ کر تو میں اتنا براہنس رہی تھی کہ میری پانچ سالہ بیٹی بار بار مجھ سے پوچھ رہی تھی ماما کیا ہوا؟ جولائی سہام مرزا کے لیے حمیرا راحت کی نظم اور طلعت نظامی و دلشاد کے مضامین ان کی محبت کے ثبوت تھے۔ شائستہ دیر آید درست آید بہت زبردست تھی۔ اتنا اچھا لکھتی ہو تو اتنا کم کیوں لکھتی ہو۔ جلد باز تربیت کی خرابی بیان کرتا ایک اچھا ناولٹ تھا۔ صدف تمہارا افسانہ اچھا تھا اگر آخری حصہ مکالمہ نہ ہوتا۔ کھائی ہوئی ہڈی کسی کی پلیٹ میں ڈالنا بدتمیزی کی سُپر لیٹوُ ڈگری ہے۔ اینڈ یہ ہوتا کہ نمیرہ گھر آ کر بتاتی اور عمیس شرمندہ ہوتا تو بڑا شاندار اینڈ تھا مگر تم نے یہ کہاہاں میں نے یہ کہا اس نے یہ جواب دیا، نے افسانے کا حسن مجروح کر دیا۔ اسماء تم بہت اچھا لکھ رہی ہو، نئی قمیض بھی زبردست تھی جیسے کو تیسا۔ روگ ہمارے معاشرے کا روگ ہے۔ نسیم سکینہ کی تحریر حساس تھی۔ پرسنل سیکریٹری ٹھیک تھی۔ شاد جی افسانے اتنے خشک اور بوجھل انداز میں مت لکھا کریں پلیز۔ بن باس پڑھ کر شبِ زندگی ذہن میں آیا اور مجھے نہیں پتا کہ اس سلسلے میں علماء کیا کہتے ہیں۔ پلیز ایسے حساس موضوعات اٹھائیں تو اسلامی حوالے سے بات بھی کریں اور حل بھی دیں۔ یہ نہیں کہ پہلا شوہر اپنی مرضی سے چلا گیا۔ ثمینہ طاہر نے ایک خودغرض لڑکی کا انجام خوب دکھایا۔ منشا یاد کی سزا کمال کی تھی۔ ڈنر بالجبر ایک اور طرح کا ہوتا ہے جو پاکستان میں عام ہے کہ کتنا ہی کھایا پیا ہوا ہو۔ ہمارے پاکستانی بھائی اس پر بھی ہمیں زبردستی حلق تک ٹھنسا دیا جاتا ہے۔

کاشی ایوارڈ کی تقریب کا جو تم نے لحہ بہ لحہ کا احوال لکھا ہے کمال تھا، کچھ نہیں چھوڑا۔ تصاویر کمال کی ہیں انداز جدا۔ مگر مجھے ایوارڈ بجیانے دیا تھا۔ اگست تسنیم جی کا راحت دیدار زبردست، احمد سجاد کا ہجوم زبردست زبان و بیان روانی و سلاست جس ماحول میں لکھا گیا ہے وہ ماحول نظر آیا۔ اور اینڈ بہت اچھا تھا۔ غزالہ جلیل کا افسانہ اچھا تھا بقول عقیلہ کے کچھ گمان گناہ ہوتے ہیں۔ فرح تمہارا افسانہ کمال تھا۔ ہم لوگ یونہی اپنی انا پر بیٹیوں کو بھینٹ چڑھا دیتے ہیں مگر یار ہر عید پر ایسا دکھی افسانہ' ہتھ ہولا' رکھا کرو یار عید پر، سویرا کا افسانہ روایتی عید افسانہ تھا۔ صدف آصف کا ناول اچھا تھا ان ساسوں کے لیے جو بہوؤں کو جینے نہیں دینا چاہتیں۔ مرزا عباس کا پدمنی کمال تھا اور بادشاہی پھوپی بھی زبردست تھا۔ زین کی نئی تصویر اچھی ہے کچن کارنر، نفسیاتی حل اور بیوٹی گائیڈ سب کمال ہیں۔ اور ان سب میں تمہاری محنت ہے۔ جو کہ منہ سے بولتی ہے خصوصاً تم نے کارنر شاعری اور بکس کے اشتہارات کم کر کے بہت نیک کام کیا ہے۔ اس سے تحاریر کو زیادہ جگہ ملنے لگی ہے، ویلڈن! اور جس طرح سے تم ہم رائٹرز کو عزت دیتے ہو وہ جزاک اللہ۔ آج کل کے نفسا نفسی کے دور میں اتنا مان، اتنی عزت، خوش رہو اور خوشیاں بانٹو۔ اور اپنا بہت خیال رکھنا اور دعاؤں میں یاد رکھنا ہماری دعاؤں میں تم موجود ہو۔

ھ: ارے سنبل جی! خبردار کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ تبصرہ آپ کا ہو تو بھلا کون کاٹ پائے گا مگر......

✉: لودھراں سے احمد سجاد بابر لکھتے ہیں ستمبر کا شمارہ بولتے ٹائٹل سے مزین تھا، دل نے پھر سرگوشی کی کاشی بھائی، آخر یہ ٹائٹل والی لڑکیاں کہاں پائی جاتی ہیں؟ معاشرے میں تو نظر آتی نہیں ہیں' اور پھر ہر مرتبہ پہلے سے خوب تر۔ واقعی دوشیزہ سرورق کے لحاظ سے سب سے آگے ہے، حالیہ مہینوں میں بہت محنت کی گئی ہے اس پہلو پر۔ اداریہ ''بول کہ لب...... '' اس بار پھر کمال کی تحریر تھا جس میں ادبیانہ رنگ بھی تھا اور افسانے کی ملکوتی فضا بھی لیکن ہر سطر میں درد ہلکورے لے رہا تھا، وہ درد جس سے ہم پہلو تہی نہیں برت سکتے ''دوشیزہ محفل'' کا رُخ کیا، جیسے جیسے خطوط کو پڑھتا گیا، سر تشکر اور عاجزی سے جھکتا چلا گیا، میرا سر کیوں نہ جھکے جب 'چراغِ سرِ راہگذر' سی رضیہ مہدی میری ستائش کریں، عقیلہ حق جیسی 'ادب کی ہمالیہ' میری تحریر کے لیے تحسین آمیز تبصرہ کریں، 'محبتوں کی سفیر، حرف گر، حرف شناس' رضوانہ کوثر جی مجھے سندِ قبولیت سے نواز دیں۔ پھر میرا سر کیوں نہ جھکے؟ ادب کا بڑا نام، 'حرمت قلم کی امین' دردانہ نوشین مجھے تھپکی دے دیں، ایک بہت اچھے قلمکار، اچھے انسان، عادل بھائی کی نوکِ قلم کی جنبش سے میرے لیے کچھ رقم ہو، ابھرتے ہوئے لکھاری، چھوٹے بھائی، نعمان اسحق کی محبتیں مجھے میسر ہوں تو پھر اس سر نے تو اللہ کے حضور سپاس گزار ہونا ہی ہے نا کہ یہ سب کچھ تو اُسی کے کرم سے ہو رہا ہے، ''کِشتِ فکر'' کی آبیاری ہم سے بھلا کیونکر ممکن ہو، یہ تو اس کی دین ہے۔ جس جس رائٹر، قاری نے میرے ناولٹ ''ہجوم'' کو سراہا، میں خاص طور پر، عاجزی سے، بہت جھک کر ان سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں، حنا رضوان، حمیرا خان، رانا زاہد، نورین ناز، روبینہ شاہین...... آپ سب کا بھی بے حد شکریہ کہ آپ سب نے ناولٹ توجہ سے پڑھا اور آپ کو اچھا لگا، روبینہ جی، میں آپ کی امیدوں پر پورا اترنے کے لیے اور زیادہ ارتکاز سے کام لوں گا۔ منزہ جی، کامیاب تقریب کی روداد کا بقیہ حصہ پڑھا، مہمانوں کے تاثرات خاصے کی چیز تھے، ''سدا بہار'' فرزانہ جی کا بیانیہ بھی افسانوی رنگ سے جگمگا رہا تھا، ''ہم سب کی اپنی'' سُنبل جی کے کیا کہنے، منفرد ڈھب سے بات کہہ گئیں، رضیہ صاحبہ کے تاثرات حسبِ روایت محبت سے گندھے تھے، وہ اچھی رائٹر تو ہیں ہی ساتھ میں برگد کے چھتنار درخت جیسی ٹھنڈی میٹھی چھایا ان کا خاص وصف ہے، تقریب کی تصاویر دیکھ کر ہر لحہ یہی ہوک اُٹھتی تھی کہ ہمیں بھی شرکت کے لیے جانا چاہیے تھا، اب کچھ بات پرچے کی تحریروں کی ہو جائے۔ نسیم نیازی کا ناولٹ ''محبت، شام بخیر'' دھیرے دھیرے، ایک سبھاؤ میں آگے کو بڑھتا رہا، اس ناولٹ کی خاص بات اس کا نیچرل اور فطری اختتام تھا، نسیم نیازی نے قطعی روایتی اختتام کرنے کی کوشش نہیں کی۔ عادل حسین کا ''ایک اور پتھر...... '' ایک نئی سوچ اور نیا تھیم لیے ہوئے تھا۔ صاعقہ رفاقت ''تُو پاس ہے، پھر بھی....'' لے کر آئیں، اس افسانے کے دو پہلو تھے، اگر اسے عام قاری کی نظر سے دیکھا جائے تو آخر میں وہ متوجہ کرنے میں کامیاب رہا۔ تمثیلہ زاہد کی تحریر میں دلکشی اور چاشنی موجود تھی حمیرا جی ہم آپ سے اس سے زیادہ کی امید رکھتے ہیں۔ رفعت سراج ''تجسیم سے تقسیم تک'' لیے ہوئے میگزین کا حصہ تھیں، ان کا نام دیکھ کر ہی پرچے کی قامت دوچند ہو جاتی ہے، اندازِ بیاں جداگانہ اور اسلوب وہ جوان کی پہچان ہے، عام سی کہانی کو بُنت سے خاص بنا دینا ان کا ہی وصف ہے، ایک الگ سی تحریر تھی جو انسانی نفس کی بھول بھلیوں میں گردش کرتی ہوئی انسانی فطرت کی گتھیاں سلجھا رہی تھی۔ عظمیٰ شکور کا ''میرے نام کا چاند'' پڑھنے کے لحاظ سے مناسب تھا، ان میں پوٹینشل نظر آ رہا ہے مجھے، رُوشا نے عبدالقیوم اپنے افسانہ ''سفید کُرتا'' کے ساتھ کافی لمبے تعطل بعد نظر آئیں، مختصر

افسانہ میں کلاسیکل رنگ نمایاں تھا، کافی اچھا لکھا ہوا تھا۔ کاشی بھائی آپ فرزانہ آغا سے زیادہ لکھوایا کریں، دیکھیں کہ سالِ رواں اختتام کی طرف جارہا ہے اور اس سال ان کی کوئی تحریر نہیں شامل کی گئی، اگر وجہ ان کی مصروفیت ہے تو ان سے رخواست ہے کہ ضرور وقت نکالیں، یہ ہمارے دل کی آواز ہے، کچھ تو لائیں (چاہے رانگڑھوں پر ہی سہی...... ہاہاہاہا)۔ کاشی بھائی، دعاؤں، نیک تمناؤں کی جوت جگائے اجازت چاہوں گا۔

ھ: لیجیے احمد! فرزانہ جی کی تحریر شاملِ اشاعت ہے۔ تبصرہ ہمیشہ کی طرح خوبصورت ہے۔ خوش رہو۔

✉: کراچی سے اپنے تفصیلی تبصرے کے ساتھ عادل حسین رقم طراز ہیں۔ لکھتے ہیں ستمبر کا دوشیزہ ایوارڈ نمبر 2 کی صورت جلوا گر ہوا۔ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ماڈل بہت بھلی معلوم ہورہی تھی۔ ساتھ میں اپنے قومی ہیرو کی تصویر دیکھ کر خوشی بھی ہوئی۔ کاشی جی آپ کا اداریہ ہمیشہ کی طرح بہت جاندار، اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمیں اپنے احتساب کی اشد ضرورت ہے۔ اللہ پاک درندگی کا مظاہرہ کرنے والوں کو عبرت ناک سزا دے۔ زادِ راہ ہمیشہ ہی قلبی سکون کا سبب بنتا ہے (سبحان اللہ) دوشیزہ کی محفل میں داخل ہوئے تو آپ کی باتوں نے سوچنے پر مجبور کردیا۔ اللہ پاک سعادت آپا، عصمت آپا کے بیٹے نوید اور غزالہ جلیل راؤ صاحبہ کو مکمل صحت اور تندرستی نصیب کرے۔ دردانہ نوشین خان اور رضوانہ پرنس صاحبہ کو مبارکباد اور عقیلہ حق جی کو (**Lion**) براڈ کاسٹر کلب کی صدارت بھی بہت مبارک، خطوط سب کے بہت محبت بھرے تھے۔ ہمیشہ کی طرح اللہ اس محفل کو اور ان محبت بھرے لوگوں کو یونہی سلامت رکھے۔ (آمین) میرے افسانے کو شامل دوشیزہ کرنے پر شکریہ، حفصہ خان سے ملاقات بھی بہت اچھی رہی۔ اور منی اسکرین پر تبصرے پڑھ کر معلومات میں اضافہ بھی ہوا۔ سمیع اللہ خان صاحب سے ملاقات بہت زبردست تھی۔ مجھ سمیت پوری قوم سمیع اللہ صاحب کے کارناموں کی دل سے قدر کرتی ہے۔ ایسے لوگ صدیوں میں پیدا ہوا کرتے ہیں۔ کامیاب انٹرویو پر مبارکباد، تقریبِ ایوارڈ کی رُوداد اتنے ڈھیر سارے سینئرز لوگوں کے قلم سے مزید مزا پیدا کرگئی۔ سب نے یادوں کی خوب بارات سجائی۔ دردانہ نوشین جی کی آشوبِ انتظار اور فرحت صدیقی صاحبہ کی وہ موتیوں کی لڑی بھی بہت خوبصورت لگیں۔ بینا عالیہ جی، عقیلہ حق صاحبہ اور اُم مریم جی اپنے ناولوں میں خوب چھائی ہوئی ہیں۔ تینوں ناول بہت مزیدار چل رہے ہیں۔ ہر قسط اگلی قسط کے انتظار میں بے چین کیے رکھتی ہے۔ رفعت سراج صاحبہ کا نام کسی تعریف کا محتاج نہیں۔ تجسیم سے تقسیم تک بھی بہت خوبصورت افسانہ۔ حمیرا خان صاحبہ کا عید فسانہ بھی ایک اور خوبصورت افسانہ، خوبصورت طرزِ تحریر کی اعلیٰ مثال، تمثیلہ زاہد صاحبہ کا لاسٹ میسج بھی اچھا لگا۔ محبت نام ہی قربانی کا ہے شاید! بس انداز مختلف ہوا کرتے ہیں۔ یہ بھی قربانی کی اچھی مثال، سفید کرتا روشانے عبدالقیوم صاحبہ کی حالاتِ حاضرہ کی اچھی تصویر، ویری نائس، سباس گل جی کا کڑوی روٹی حال سے جڑا ایک اچھا افسانہ، زندگی واقعی سستی ہوگئی ہے لیکن ایسا بھی نہیں کہ ہر ماں طاہرہ کی ماں جیسی ہی سوچ رکھتی ہو۔ بلکہ میری سوچ تو طاہرہ کی ماں کے بارے میں بھی یہ نہیں ہے۔ ماں کیسی ہی ہو ماں ہوتی ہے۔ نہ تو خود اپنی غربت سے تنگ آکر کسی اولاد کا گلا گھونٹ سکتی ہے نہ ہی سودا کرسکتی ہے۔ سباس جی یہ میری سوچ ہے۔ اور یہ صرف سوچ کا اختلاف ہی ہے۔ افسانے کی خوبصورتی اور آپ کے قلم کی سچائی سے ہرگز نہیں۔ بحرحال کڑوی روٹی حالات کی جیتی جاگتی تصویر تھی۔ اور ہاں یہ بھی تو سچ ہے کہ ایسے چیک اِن غریبوں کے لیے بس چیک کی صورت ہی ہوتے ہیں، فوٹو سیشن کے لیے۔ عظمیٰ شکور صاحبہ کا میرے نام

کا چاند بھی عید کے حوالے سے ایک اچھی کوشش، صاعقہ رفاقت صاحبہ کا تو پاس ہے، پھر بھی...... محبت کو اپنی نادانی سے کھو دینے والے کی داستان، محبت کی ناقدری بھی تو ناشکری ہی ہے۔ اچھا لگا صاعقہ جی کا یہ افسانہ بھی۔ اِس بار ناولٹ نسیم نیازی صاحبہ کا محبت شام بخیر کی صورت تھا۔ ایک خوبصورت تحریر، ایک مضبوط ارادوں کی مالک حساس لڑکی کی کہانی۔ جسے فیصلے کرنا بھی آتا ہے اور محبت کرنا بھی۔ انتخاب خاص ہر بار کی طرح اس بار بھی شاندار، اور جاوید اصغر صاحب کا شیخ جی کیا کمال کی چیز تھا۔ کئی بار لبوں پر ہنسی نہیں بلکہ بھرپور قہقہے آتے رہے۔ دوشیزہ گلستان بھی اسماء اعوان جی کی محنت کا عکاس نئے لہجے، نئی آوازیں میں سب نے اچھا کلام پیش کیا۔ بس صفحات مزید بڑھا دیے جائیں تو بہتر ہے؟ زین جی بھی خوب جواب دے رہے ہیں۔ نائس، لولی وڈ، بولی وڈ سے فلمی دنیا کی کچھ معلومات مزید مل گئیں۔ مختار بانو طاہرہ جی کے لیے دل سے دعائیں۔ نادیہ طارق اور ڈاکٹر خرم مشیر کے صفحات ہمارے لیے جلد کارآمد بننے والے ہیں (انشاء اللہ) اس بار حکیم جی (محمد رضوان) بھی موجود تھے۔ اچھا سلسلہ ہے یہ بھی۔ میرے افسانے پر آپ سب کی رائے کا انتظار ہے۔ آخر میں اجازت سے پہلے سب لکھنے اور پڑھنے والوں کو سلام اور دعائیں۔ مجھے بھی اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ کوئی غلط ہوگئی ہو یا کسی کا دل دکھا ہو تو معذرت، کاشی جی پورا پرچہ نہایت شاندار ہے۔ ڈھیروں مبارک، اپنا بہت خیال رکھیے گا۔

ھ: عادل تم نے اپنا خیال پیش کیا۔ مگر حقیقتیں اس سے بھی بدتر ہیں۔ تبصرہ شاندار ہے۔

✉: کراچی سے یہ آمد ہے نیر رضاوی صاحب کی۔ لکھتے ہیں، محترم کاشی صاحب، السلام علیکم! دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ دوشیزہ سے وابستہ ہر شخص کو حفظ و امان میں رکھے (آمین) آپ نے جو میری تحریروں کو پذیرائی بخشی اور جس محبت سے مجھے مخاطب کیا میں اس کا نہایت شکر گزار ہوں۔ سمیع اللہ خان صاحب سے ملاقات بہت اچھی رہی سمیع اللہ صاحب کل بھی قومی ہیرو تھے اور آج بھی قومی ہیرو ہیں اور ہمیشہ قومی ہیرو رہیں گے۔ قومی ہیروز سے ملاقاتیں ہوتی رہیں تو جوش و جذبے کو تقویت ملتی رہتی ہے۔ لیکن افسوس کہ نئی نسل کا رجحان الیکٹرانک میڈیا کی طرف زیادہ ہے اور الیکٹرانک میڈیا خسارے کا سودا کرنے کو تیار نہیں ہے۔ کوئی ایسا پروگرام نہیں جس میں مستقبل کے درخشندہ ستاروں کو ماضی کے ہیروز سے متعارف کرا سکے۔ الیکٹرانک میڈیا کو چاہیے کہ اعلیٰ کارکردگی دکھانے والوں کو متعارف کرواتا رہے۔ دوشیزہ کا ہر لکھنے والا بہت عمدہ تحریریں دوشیزہ کے ذریعے ہم تک پہنچا رہا ہے۔ سورج کو چراغ دکھانا بے کار ہے اور جہاں بہت سارے سورج جمع ہو جائیں تو وہاں ایک چراغ کیا معنی رکھتا ہے؟ شاعری پسند آجائے تو جلد شائع کر دیجیے گا۔ عین نوازش ہوگی۔

ھ: پیارے بھائی! شکر ہے آپ تبصرہ تو کرنے لگے۔ جگ جگ جیئں۔ آپ کی شاعری اس ماہ شاملِ اشاعت ہے۔

✉: مسز نوید ہاشمی، کراچی سے شاملِ محفل ہیں، لکھتی ہیں۔ امید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ جولائی کا افسانہ میں ہاری بے حد شاندار حساس تحریر تھی۔ جلد باز فوزیہ احسان رانا کی سبق آموز کاوش تھی۔ بے حد پسند آئی۔ ماضی، حال اور میں صدف آصف کی تحریر ایک دل کو چھو لینے والا افسانہ تھا۔ ایک عورت اپنے آپ کو مار کر گھر بناتی ہے۔ روگ مدیحہ اصغر کا بہت دردناک کہانی تھی۔ ہر بیٹی والا چاہتا ہے خدا میری بچی کے جلد سے جلد سہرے کے پھول کھلا دے۔ خواہشوں کے سراب ثمینہ طاہر بٹ کی پسند آئی۔ سزا محمد منشا یاد کی اچھی لگی۔

اگست میں کاشی چوہان نے سچ کا آئینہ دکھا کر ہماری آنکھیں کھول دیں۔ فوجی بھائیوں کے لیے ان کی تحریر اور سوچ کو سلام۔ خدا کرے ہر پاکستانی کے دل میں ایسی ہی محبت پیدا ہو جائے۔ ہر خوشی میں اپنے فوجی بھائیوں کو بھی یاد رکھیں۔ 27 ویں دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ تقریب پڑھ کر سچ میں ایسا لگا کہ میں اُس تقریب میں شامل ہوں۔ سب رائٹرز کی تصویریں دیکھ کر میں نے سب کو سب سے پہلے اپنے لیپ ٹاپ پر محفوظ کیا۔ فرزانہ آغا کافی اسمارٹ ہیں۔ مینا تاج، نیئر شفقت، دلشاد نسیم، رضوانہ پرنس، دردانہ نوشین خان، تمثیلہ، محمد تقی، ایڈیسن ادریس مسیح، عقیلہ حق سب سے پیاری فاطمہ ثریا بجیا کی تصویر لیپ ٹاپ پر محفوظ کر لی۔ اپنے بھائی کاشی چوہان کو ایوارڈ لیتے دیکھ کر سچ بڑی خوشی ہوئی بعض رشتے خون کے نہ ہوتے ہوئے بھی دل سے جڑے ہوتے ہیں۔ آپ سب کے نام میرے دل پر نقش ہو گئے ہیں۔ زین العابدین بیٹا مجھے آپ بہت پسند آئے۔ کاشی چوہان نے ایوارڈ کی لمحہ بہ لمحہ روداد کو اس خوبصورتی سے تحریر کیا کہ مجھے ایسا لگا میں وہاں موجود ہوں اور اپنی آنکھوں سے سب دیکھ رہی ہوں۔ ایک اچھا قلم کار وہی ہے جو اپنی تحریر میں جکڑ لے، قید کر لے۔ پھر منزہ کا سہام سپاس نامہ، سید شاہد حسن صاحب کی تقریر، محمود شام صاحب کا اظہار خیال، مہتاب اکبر راشدی صاحبہ کا حسنِ بیاں کمال تھا۔ اب شدت سے انتظار ہے دوشیزہ ستمبر کا جس میں دوشیزہ ایوارڈ پانے والی لکھاریوں کی یادگار باتیں ہوں گی۔ آج ستمبر ہو گئی ہے دوشیزہ ابھی تک نہیں ملا ہے۔ پہلے بھی 15 اگست کو ملا تھا اس لیے دوشیزہ کی محفل میں شامل نہیں ہو سکی تھی۔ بہانہ فرح اسلم قریشی کا افسانہ جو اگست میں تحریر کیا گیا۔ خوبصورت تحریر تھی۔ انا اور ضد نے کیسے ایک بچی کی جان لے لی۔ عید اور تیری دید سویرا فلک کی تحریر اچھی لگی نت نئی فرمائشیں اور فرمائشوں کے پورا نہ ہونے پر منہ پھلا لینا اپنی اوقات سے بڑھ کر خرچ کرنا بعض وقت کتنا بھاری پڑتا ہے۔ زندگی مسکرا اٹھی، صدف آصف کی تحریر بے حد شاندار تھی۔ رشتوں سے جڑی محبتوں کی کہانی مجھے بے حد پسند آئی۔ بدنمی مرزا حیدر عباس تحریر ایک آئینہ تھی۔ خوبصورتی کے چکر میں پڑنے والے مرد اپنے آپ کو بیوی کا نوکر بنا لیتے ہیں۔ کچن کارنر بے حد شاندار تھا۔ نادیہ طارق نے عید کے حساب سے مزیدار ڈشز بتائی تھیں۔ نئے لہجے نئی آوازیں میں فرح علی کراچی، تمثیلہ لطیف، عمار حسین انصاری، سباس گل، شعبان کھوسہ کے کلام اچھے لگے۔ خط بے حد لمبا ہو گیا ہے۔ معافی چاہتی ہوں جو سمجھ آئے رہنے دیں جو نہ پسند آئے کاٹ دیں۔ میں نے اپنے قلم کو روکا نہیں کیونکہ اتنی شاندار ایوارڈ کی کامیابی پر میرا قلم جو نا چاہے تو پھر جب رکا جب تھک گیا لکھتے لکھتے۔

ج: اچھی آپا! سلامت رہیے۔ آپ کے بھائی نے آپ کا دوشیزہ اور سچی کہانیاں کے حصول کا مسئلہ سالانہ ممبر شپ کے ذریعے حل کر دیا ہے۔ آپ کا تبصرہ اچھا لگا۔

✉: روبینہ شاہین کراچی سے رقم طراز ہیں۔ محترم برادر کاشی چوہان ہمیشہ خوش رہیے۔ اس ماہ کا شمارہ دیکھا آنکھوں کو اچھا لگا سرورق ہی تمام تر خوبصورتی سے روشن تھا۔ اندرونی صفحات کی جانب بڑھی تو ابتدائیہ بول کہ لب آزاد میں کاشی برادر نے بڑی خوبصورتی سے محروم اور مظلوم طبقے کی بات کی ہے۔ اور ان کے دُکھ درد آنسو سب لفظوں کی صورت میں ڈھال دیے۔ رفعت سراج کی تحریر بہت ہی منفرد ہے۔ واقعی یہ وراثتوں کے مسائل خون کے رشتوں کو تقسیم کر دیتے ہیں۔ نسیم نیازی کی تحریر 'محبت شام بخیر' میں چاہت و پیار کے جذبوں کی بڑی مہارت سے عکاسی کی گئی ہے۔ حمیرا جی کی تحریر ہلکی پھلکی مسکراتی تخلیق ہے اب بات کروں گی تمثیلہ زاہد کی تخلیق

لاسٹ میسیج کی جو بہت ہی حساس جذبوں سے بجی محبت و چاہت کی لذتوں سے لبریز تخلیق ہے۔ روشانے عبدالقیوم نے اپنے افسانے 'سفید کرتا' میں بڑے ہی اعلیٰ انداز میں ماں کے جذبے کی عکاسی کی ہے۔ بہت ہی اُداس کرنے والی تخلیق ہے۔ مگر سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ عادل حسین صاحب کی کاوش ایک اور پتھر ہماری معاشرتی ناہمواریوں اور سماجی ناانصافیوں کے خلاف احتجاج ہے جو کہ بہت بھرپور ہے۔ واقعی برائی کو ختم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ابابیلوں کو معمولی کنکر ہی تو عطا کیے تھے۔ ہم میں بھی ہمت ہو تو یہ برائیوں کے بت ڈھیر ہو جائیں گے۔ اور سباس گل کی تحریر کڑوی روٹی بہت ہی خاص لگی۔ اس میں بے رحم بھوک کی مجبوریوں کو مصنفہ نے قلم بند کیا ہے۔ انتخابِ خاص 'رشتہ' ممتا کی قوت اور محبت کے گرد گھومتی تحریر ہے۔ سمیع اللہ صاحب اور حفصہ کا انٹرویو بہت دلچسپ ہے۔ منی اسکرین بھی اچھا ہے۔ دوشیزہ میگزین بھی بہت دلچسپ رہا۔ یہ ہوئی نا بات، نئے لہجے نئی آوازیں بہت عمدہ ہیں۔ رنگ کائنات بھی مسکراہٹوں کا خزانہ ہے۔ اور سب سے بڑھ کر دوشیزہ ایوارڈ کی باتیں اور ایوارڈ یافتہ مصنفین کی باتیں اور تصویریں بھی اس شمارے کو اسپیشل بنا گئیں۔ یعنی ستمبر کا شمارہ بہت کامیابی سے قارئین تک پہنچا۔ آپ سب کو اور کیپٹن آف دا شپ یعنی ایڈیٹر صاحب کو بھی مبارک باد۔ اب اجازت۔

✍: روبینہ جی! اختصار سے بات کرنا کہاں سے سیکھا۔ دریا کو کوزہ میں بند کرنے لگی ہیں اب آپ۔ سلامت رہیے۔

✉: شاہ کوٹ سے ہماری بہت اچھی لکھاری ساتھی حمیرا خان لکھتی ہیں۔ امید ہے آپ اور ہمارے باقی دوست خیریت سے ہوں گے۔ ہمارے یہاں آج کل ہر طرف سیلاب نے اودھم مچا رکھا ہے۔ اتنے لوگوں کے آنسو بہیں، اتنے گھر اجڑیں تو دل خود ہی اجڑا اجڑا سا لگنے لگتا ہے۔ سو ہمارے دل کا حال بھی آج کل کچھ ایسا ہی ہے۔ کوئی اسے حکومت کی نااہلی کہہ رہا ہے تو کوئی قدرتی آفت...... ہم بس یہی دعا کر سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی امان میں رکھے آمین۔ دوشیزہ ایوارڈ نمبر دو میرے سامنے رکھا ہے تو چلیے اس کی بات کرتے ہیں۔ اس بار کی ماڈل کا میک اپ مجھے بہت پسند آیا یوں کہیے کہ بڑی سادگی سے حسن کو سنوارا گیا ہے۔ اشتہارات کی لمبی قطار کو پھلانگتے ہم لسٹ پر پہنچ گئے۔ اپنا نام دیکھ کر، امی اور بھائی کے چہرے پر میری کہانی دیکھ کر آنے والی خوشی اور مسکراہٹ سے یقیناً دل خوش ہو گیا مگر ایک گڑبڑ ہو گئی۔ کاشی آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ میرا اشارہ کس طرف ہے۔ ''بول کہ لب آزاد ہیں تیرے...... '' کیا سچ میں کاشی؟؟؟ ابھی تک ایسے بہت سارے موضوع ہیں جن پر قلم اٹھانے کی اجازت تو دور کی بات، بات تک کرنا بے شرمی میں شمار ہوتا ہے اور کچھ ''عقلمندوں'' کی نظر میں تو یہ معاشرے میں بگاڑ کا سبب بن سکتا ہے۔ یہ بھی کتنے مزے کا لطیفہ ہے نا کہ جو کام ہو رہے ہیں وہ بگاڑ کا سبب نہیں لیکن ان کا ذکر بگاڑ کا سبب سمجھا جاتا ہے، خیر جی چلنے دو۔ دوشیزہ کی محفل میں جتنے بھی خطوط پڑھتی ہوں ان میں ایک بات مشترکہ طور پر نظر آتی ہے اور وہ ہوتی ہے کاشی کی تعریف اور اچھے طریقے سے ویلکم کرنے پر شکریہ، باقی سب کی طرح میں بھی اس بارے میں کچھ کہنا چاہوں گی۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن سے بات کر کے نئے سرے سے توانائی کا بھرپور احساس ہوتا ہے۔ کچھ کرنے کا بلکہ بہت کچھ کرنے کا دل کرنے لگتا ہے اور ہم مثبت انداز میں سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ کاشی آپ بھی ان لوگوں میں سے ایک ہیں۔ جب بھی آپ سے بات ہوتی ہے، آپ کے لہجے کی اپنائیت (جو ہو سکتا ہے آپ کی عادت ہی ہو اور ہم ایویں......) گرم جوشی اور کچھ

خواتین کی محبوب قلم کار

کئی دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ یافتہ **رفعت سراج**

رفعت سراج، جن کے جادوگر قلم کی کاٹ سے کون واقف نہیں۔

رفعت سراج، وہ قلم کار، جن کو قلم کی حرمت کا پاس، زندگی سے زیادہ عزیز ہے۔

رفعت سراج، وہ قلم کار جنہیں اپنی تحریر سے دھڑکنیں بے ترتیب کرنے کا ہنر خوب آتا ہے۔

گلابی کاغذ اور زرد پھول کے بعد......

نئے شاہکار ناول کے ساتھ، آپ کے روبرو

بہت جلد ماہنامہ ''دوشیزہ'' ڈائجسٹ میں ملاحظہ کیجیے۔

بس تھوڑا سا انتظار اور......

کرنے کا جذبہ جو آپ کے اندر موجود ہے۔ وہ آپ کی آواز کے ذریعے میں اپنے اندر اترتا محسوس کرتی ہوں اور دل کرتا ہے کچھ کروں، کچھ خاص، بہت خاص۔ میں نے یہ بات اپنے گھر والوں کے ساتھ بھی شئیر کی ہے (میرے گھر میں سب آپ سے واقف ہیں) ایک بات اور کہنا چاہوں گی۔ آپ کی آواز ریڈیو کے لیے ایک دم فٹ ہے۔ آپ ریڈیو پروگرام کریں، وہاں بھی موسٹ فیورٹ رہیں گے، آزما کے دیکھ لیں۔ منزہ صاحبہ سے ایک بار ہی فون پر بات ہوئی ہے مگر اندازہ ہوگیا کہ وہ کتنی نائس کتنی مہذب ہیں۔ اگر کراچی اتنا دور نہ ہوتا تو میں یقیناً آپ لوگوں کے ساتھ کام کرنے کو بہت انجوائے کرتی۔ کاشی آپ کے لیے ایک شعر ذہن میں آرہا ہے۔

جن سے مل کر زندگی سے عشق ہو جائے وہ لوگ ☆ آپ نے شاید نہ دیکھے ہوں مگر ایسے بھی ہیں

شاعر سے معذرت کے ساتھ کچھ تبدیلی کرنا چاہوں گی۔

جن کو فون کرکے لکھنے کو جی چاہے وہ لوگ ☆ اور تو شاید نہ دیکھیں ہوں مگر کاشی تو ہے

خدا کرے زندگی کے لیے آپ کی گرم جوشی ہمیشہ اسی طرح قائم رہے اور آپ اسی طرح کامیابیاں اور محبتیں سمیٹتے رہیں آمین۔ رضوانہ کوثر صاحبہ سالگرہ کی بہت ساری مبارک باد۔ یاسمین اقبال صاحبہ اللہ تعالیٰ آپ کو صبر عطا فرمائے۔ اپنے کبھی بھلائے نہیں جاسکتے مگر یہاں بھی آپ کے بہت سے اپنے موجود ہیں، ویلکم بیک۔ عقیلہ حق صاحبہ کاشی کے انٹرویو کا آئیڈیا مجھے بھی پسند آیا، صدر چنے جانے پر مبارک باد۔ سباس گل کا افسانہ ''کڑوی روٹی'' بہت ہی تلخ مگر خوبصورت تحریر تھی۔ میں نے کچھ اس سے ملتے جلتے کردار حقیقت میں دیکھے ہیں۔ عادل حسین کا ''ایک اور پتھر'' بھی حقیقت کی عکاسی کرتی اچھی تحریر تھی۔ ''کہیں دیر نہ ہو جائے......'' کی تلوار سر پر لٹک رہی ہے سواس ماہ کے لیے بس اتنا ہی۔ انشاء اللہ بشرطِ زندگی اگلے ماہ پھر ملاقات ہوگی۔

✍ : بہت پیاری حمیرا! کاشی چوہان کے لیے اتنا کچھ لکھ دیا...... میرے اندر جو بچہ بیٹھا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ واقعی کیا یہ سب تمہارے لیے ہی لکھا ہے؟ آپ کے لیے ایک سطر '' جو لوگ خود اچھے ہوتے ہیں، وہ سب کو اپنی آنکھ کے اینگل سے اچھا ہی دیکھتے ہیں۔'' اگلے ماہ تبصرے کا انتظار رہے گا۔

✉ : ہماری بہت اچھی لکھاری ملتان سے فصیحہ آصف خان محفل میں شریک ہیں، لکھتی ہیں۔ پچھلے ماہ عدیم الفرصتی کے سبب خط احاطۂ تحریر میں نہ آسکا۔ معذرت قبول کریں۔ ایوارڈ نمبر **1** میں منزہ سہام کو دیکھ کر کئی اشعار ذہن میں گردش کرنے لگے۔ جن کو اس وقت تحریر کرنا ممکن نہیں۔ بس دعا ہے کہ منزہ آپ سدا خوش رہیں۔ اس کے بعد بھائی کاشی نے مدلل و احترام کے انداز میں تفصیلی جائزہ لے کر رپورٹ پیش کی کہ میں خود کو اس محفل کا حصہ سمجھنے لگی۔ کاشی بھائی بہت خوب۔ اب ستمبر کے دوشیزہ پر ایک نظر۔ جس طرح پچھلے شمارے میں تصاویر نے دوشیزہ کا حسن دوبالا کیا۔ اسی طرح اس ماہ بھی دلکشی و دلفریبی عروج پر دکھائی دی۔ اور آپ سب کی کاوشوں کا منہ بولتا ثبوت بھی۔ سرورق پسند آیا۔ خاص طور پر ماڈل کی آنکھیں۔ کاشی بھائی نے نام کے مسلمانوں کا خوب جائزہ لیا۔ زادِراہ کے بعد دوشیزہ کی محفل میں قدم رنجا فرمائے۔ پھولوں کی مہک، روشن آنکھوں اور اپنائیت لیے یہ محفل ہمیں جی جان سے پسند ہے۔ دردانہ نوشین کو مبارک ہو۔ غزالہ جلیل کے لیے دعائیں، اب ذرا بات ہو جائے سویٹ بینا عالیہ سے، ان کا ناول واقعی لاجواب ہے۔ اور وہ جس چابک دستی سے اسے آگے بڑھا رہی ہیں۔ دلچسپی بڑھتی جارہی ہے۔ بینا جی آپ نے مجھ ناچیز کو یاد کیا بے حد شکریہ، خوش رہیں، محترمہ رضیہ مہدی، حنا

رضوان، عادل حسین، نعمان اسحاق، رضوانہ کوثر، حمیرا خان، صالحہ صدیقی، سویٹ فریدہ فری، احمد سجاد بابر نے اپنے مشاقانہ قلم سے الفاظ کے ہیرے دمکائے، عقیلہ حق کی کیا بات ہے، عقیلہ جی ایک سوال کا جواب دیجیے گا۔ آپ کو لکھنے کے لیے اتنا ٹائم کیسے مل جاتا ہے؟ گر ہمیں بھی بتائیں۔ دردانہ نوشین صاحبہ نے سب کو فرداً فرداً اپنی محبت سے آگاہ کیا۔ بلکہ سبھی نے اس دلربا محفل میں شمولیت کر کے چار چاند لگائے۔ اللہ پاک آپ سب کو مشکلوں سے دور رکھے، منی اسکرین پر تبصرے درست معلوم ہوئے۔ اپنے علاقے کے فلائنگ ہارس سمیع اللہ خان کے بارے میں تازہ ترین جان کر اچھا لگا۔ دوشیزہ تقریب ایوارڈ پر فرزانہ آغا، دردانہ نوشین، رفعت سراج، شائستہ عزیز، دلشاد نسیم، فرحت صدیقی، رضیہ مہدی، باجی نگہت غفار، ناہید فاطمہ، سنبل، عقیلہ حق، نیئر شفقت اور اپنی جانِ عزیز نسیم نیازی نے بھرپور انداز میں دلی کیفیات کا اظہار کیا۔ واقعی یہ محفل ایسی ہوگی کہ جو حاظرین کو مدتوں نہ بھولے گی۔ 'تیرے عشق نچایا' بلال کی ملک مصطفیٰ سے ملاقات بلاوجہ نہیں۔ اُم فروا کی عزت کے رکھوالے آ گئے۔ دل پذیر جذبوں سے گندھی یہ تحریر وقت بیتنے کا احساس نہیں دلاتی۔ بلکہ تشنگی بڑھا دیتی ہے۔ بہت خوب بینا جی۔ رفعت سراج کے دل میں اتر جانے والے جملوں سے سجی تحریر 'تجسیم سے تقسیم تک' بدترین رویوں کی، تلخ سچائیوں کی تحریر تھی۔ شکر ہے نسیم تمہارا قلم بھی رواں ہوا، محبت شام بخیر، آخر میں افسردہ کر گیا۔

بہر حال ایک مشرقی لڑکی کی بھرپور عکاسی کی گئی۔ روایات کو محبت پر قربان نہ کیا۔ اور دوشیزگی کا علم بلند رکھا۔ بہت اچھی تحریر لگی۔ عید فسانہ، لاسٹ میسیج، مناسب انداز میں تحریر کی گئیں۔ سباس گل کی کڑوی روٹی، تلخ حقیقتوں سے پردہ اٹھانے والی تحریر تھی اور امیر انسان کیا جانے روٹی تو انسان کو بھی نگل جاتی ہے۔ میرے خیال میں اس شمارے کی سب سے بہترین تحریر کڑوی روٹی ہی ہے۔ صاعقہ رفاقت نے بھی رُلایا۔ پری آخر کار اُڑ گئی، روتا چھوڑ کر۔ معاشرے کے منہ پر ایک طمانچہ، ایک اور پتھر عورت ہونا ہی جرم ٹھہرا۔ پتھر تو ساری عمر برسیں گے۔ زباں سے بھی اور ہاتھوں سے بھی۔ رام لعل کا رشتہ ادبی چاشنی لیے دلگداز تحریر لگی۔ باقی تمام سلاسل بہترین رہے۔ تبصرہ مکمل ہوا کسی حد تک۔ دوشیزہ اب باقاعدگی سے مل رہا ہے۔ سب کو ڈھیروں سلام۔

ھ: فصیحہ جی! سلامت رہیے۔ کمال تبصرہ کیا آپ نے۔ شکایتیں جلد رفع ہونے والی ہیں۔ تھوڑا سا انتظار اور۔

✉: گلشن اقبال کراچی سے ہماری لکھاری ساتھی نسیم سحر پہلی بار محفل میں تشریف لائی ہیں، لکھتی ہیں۔ آپ کا تبصرے کے لیے حکم سر آنکھوں پر ستمبر کا شمارہ پڑھا اچھا لگا۔ ایوارڈ تقریب کا دوسرا حصہ بھی مزیدار رہا اور دوسری بار بھی یہی خیال آتا رہا کہ کاش ہم بھی وہاں ہوتے، خیر پیوستہ رہ شجر سے اُمید بہار رکھ...... اس لیے ہم دوشیزہ کے شجر سے وابستہ اور پیوستہ رہیں گے۔ (انشاءاللہ) سمیع اللہ صاحب کو دیکھ کر مجھے ہمیشہ معین اختر یاد آتے ہیں جو نہیں اڑنے والا گھوڑا کہا کرتے تھے۔ سچ میں ہمارے یہی کھلاڑی تھے جن کی عزت آج بھی ہے، ورنہ آج کل کے تو...... خیر چھوڑیں سبھی جانتے ہیں جناب۔ کہانیوں پر کیا تبصرہ کریں جب شمارے میں رفعت سراج ہوں تو پھر کسی کا چراغ کیسے جلے گا۔ ان کی کہانی مختصر مگر انتہائی اچھی تھی اس کے بعد سباس گل کا 'کڑوی روٹی' بہترین رہا۔ نسیم نیازی کا محبت شام بخیر، تمثیلہ زاہد کا لاسٹ میسیج، عظمیٰ شکور کا میرے نام کا چاند، صاعقہ رفاقت کا تُو پاس ہے پھر بھی، اور عید فسانہ بھی ایوریج تھا۔ بس اتنا کافی ہے۔

ھ: اچھی نسیم! آپ کا مشورہ سر آنکھوں پر، اُمید ہے اب آپ کو شکایت نہیں ہوگی۔ تبصرے کا شکریہ۔

✉: دوشیزہ کی محفل میں رانا زاہد حسین شیخوپورہ سے رقم طراز ہیں دوشیزہ کا ایوارڈ نمبر 2 اپنی مثال آپ تھا۔ اس شمارے میں خاصے کی چیز سمیع اللہ خان صاحب کا انٹرویو تھا۔ میری تحریر عیدی ہو تو ایسی پر حمیرا خان صاحبہ نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ مصنف نے جلد بازی میں تحریر مکمل کر کے بھجوائی حمیرا خان صاحبہ آپ تو غائب کا علم بھی جانتی ہیں۔ آپ کو پسند نہیں آئی میں آپ کی رائے کا احترام کرتا ہوں۔ روبینہ شاہین صاحبہ آپ کھل کر میری تحریر پر تنقید کریں میں ساحل ابڑو کی طرح آپ کو مطالعے کی تلقین نہیں کروں گا۔ تنقید ہی تو رائٹر کی تحریر کو نکھارتی ہے۔ مجھے تو خوشی ہے آپ نے میری تحریر کو تنقید کے قابل سمجھا۔ اب ذکر ہو جائے ایوارڈ نمبر 2 کی تحریروں کا۔ رفعت سراج صاحبہ کا افسانہ تجسیم سے تقسیم تک پڑھا اس پر کیا تبصرہ کروں، رفعت سراج کا تو نام ہی کافی ہے۔ حمیرا خان کا عید فسانہ روایتی سی تحریر تھی۔ سفید کرتا اچھی تحریر تھی مگر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے بندے کی خواہش اُس وقت پوری ہوتی ہے جب وہ خود نہیں رہتا۔ علی کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ عادل حسین کا ایک اور پتھر چوہدریوں، جاگیرداروں کا اصلی چہرہ بے نقاب کرتی ہوئی تحریر تھی۔ مختصر سی تحریر کافی پُر اثر تھی کاشی بھائی میرے افسانے آپ کے پاس ہیں اُن کا نمبر کب آئے گا۔

دل گداز تحریریں، زندگی کی تصویریں، آپ کا اپنا ''سچی کہانیاں''

پاکستان کا کثیر الاشاعت میگزین جس میں ایسے سلسلے موجود ہیں جو عوام کے اپنے ہیں۔ عوام جنہیں پسند کرتی ہے۔

تین مرد، تین کہانیاں

سچی کہانیاں کا وہ خاص سلسلہ، جس میں مرد ہی نہیں، خواتین بھی مردوں کے اس معاشرے میں اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات بیان کرتی ہیں۔

کار جہاں دراز ہے

پاکستان کی صحافت کا ایک عظیم ستون، نصف صدی سے جن کی خدمات کا ملک اور بیرون ملک اعتراف کیا گیا۔ 'جاوید راہی' کے قلم سے 'ہر ماہ جرم وسزا کی وہ سچائیاں جن کو پڑھ کر آپ کی عقل دنگ رہ جائے گی۔

پلیٹ فارم

اسٹیشن پر جنم لینے والی کہانیاں، جن میں ملن اور جدائی کی وسل بھی شامل ہے۔ ہر ماہ ایک یادگار سچی کہانی۔

شعلہ سامان تحریریں

محبت اور نفرت کی دھیمی دھیمی آنچ میں لو دیتی ہوئی کہانیاں، جن میں زندگی کے سب رنگ شامل ہوتے ہیں۔ آپ ہی کے اردگرد سے موصولہ، خاکستر کردینے والی تین کہانیاں۔

سچ بیانیاں

اپنے دیس سے، اپنے شہروں سے موصولہ وہ سچ بیانیاں جن کو پڑھ کر اپنی مٹی کی خوش بو، آس پاس محسوس ہوتی ہے۔

خصوصی کہانی

آخری صفحات پر ہر ماہ، آپ کے پسندیدہ لکھاریوں کے قلم سے ایک خصوصی سچی کہانی۔

اس کے علاوہ سلسلے وار ناول

ہم شکل: سچی کہانیاں میں پہلی بار، برصغیر کے نامور لکھاری **ایم اے راحت** کے قلم سے ایک سنسنی خیز سلسلے کی پہلی کڑی۔

ناگن: ہزاروں سال کی تپسیا پر پھیلا، زندگی کا نیا رنگ، **اعجاز احمد نواب** کے قلم سے۔

مکھنی: ایک ایسی دوشیزہ کی داستان جو خیال اور حقیقت کی قید سے آزاد تھی۔ ایک مافوق الفہم اسرار بھری عجوبہ داستان۔

سخن آباد: آپ کی سخن فہمی، اہلِ ذوق کے لیے تسکین افزاء سلسلہ۔

مسئلہ یہ ہے

قرآنی آیات کی روشنی میں آپ کے مسائل کا حل، سچی کہانیاں کا وہ عظیم سلسلہ جو عوام کی بھلائی کے لیے پہلے شمارے سے فیض پھیلا رہا ہے۔

آپ ایک بار پڑھ کر تو دیکھیے، ہمیں اُمید ہے آپ کو اگلے ماہ تازہ شمارے کا انتظار ہو گا

ﮯ: پیارے زاہد! آپ کو ابھی بہت محنت کی ضرورت ہے۔ اُمید ہے آپ سمجھ گئے ہوں گے۔

✉: تسنیم منیر علوی دبئی سے محفل میں موجود ہیں، لکھتی ہیں۔ پیارے بیٹے کاشی بے شمار دعائیں اور سلام اُمید ہے اپنی گونا گوں مصروفیت میں مزید اضافے کے بعد تم میں 'پھرتی' بھر گئی ہوگی۔ ستمبر کا رسالہ آج صبح بھائی نے پاکستان سے بھیجا۔ ورنہ یہاں اکتوبر میں ملتا۔ سوچا ایک افسانہ بھی لکھا رکھا ہے۔ ساتھ ہی خط بھی روانہ کردیتے ہیں۔ تمہارا اداریہ پڑھ کر قوم کی سفا کی پر رونا آیا۔ محفل میں راحت دیدار کی پسندیدگی پر دوستوں کی شکر گزار ہوں اور جنہوں نے اعتراض کیا ان کی سب سے زیادہ مشکور ہوں، شاید اس طرح ہماری اصلاح ہوجائے۔ ویسے کاشی ہمارے آس پاس ''نستعلیق'' لوگوں کا جمعہ بازار لگا ہوا ہے۔ اگر ایک ادبی منگیتر اور سہی...... تقریب کا آنکھوں دیکھا حال ہم نے بڑی محنت سے ترتیب دیا تھا۔ سارے نکات تقریب میں بیٹھے بیٹھے لکھے مگر...... وہ تم نے رقم کرکے سچی بات تاریخ رقم کردی۔ دراصل کچھ ہماری جلد بازی ہمیں تاثرات ہی لکھنے چاہیے تھے۔ کیا تھا کہ ہم منبر میں جا کر کچھ نہ کہہ سکے۔ مگر تمہیں یہ تو علم ہوگا آخر شاعر وادیب ہوکر خاموش لوگ بلا کے خطیب ہوتے ہیں۔ فرزانہ سے ہماری محبت تو فوٹو گرافرز کی آنکھ نے محفوظ کرلی اور کچھ ہمارے کیمرے کی آنکھ میں بھی قید ہیں فرزانہ، اب رہائی مشکل ہے۔ پیاری سنبل جیتی رہو اور اپنی 'نزاکت' سے اگر پردہ اٹھادو تو بہت سوں کا بھلا ہوگا۔ عقیلہ، کامیابیاں مبارک ہوں۔ تقریب میں مسکراتی ہوئی تصویر ہمارے پاس یادگار ہے۔ نیئر شفقت شاید تم ہمیں اور ہم تم کو ڈھونڈتے رہے۔ اور پھر جدا ہوگئے۔ پھر بھی کوئی بات نہیں، محفل میں ملیں گے۔ ستمبر کے افسانے ابھی ادھورے ہیں اس لیے تبصرہ بھی قرض ہے ہاں البتہ رفعت سراج کا افسانہ پڑھا، دل کو چھو گیا۔ کیا زورِ بیاں اور الفاظ پر گرفت ہے۔ خوب بہت خوب...... ایک افسانہ یا ناولٹ جو تم بنادو جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے (پرانے وقتوں کی تقریروں میں خوب استعمال ہوا ہے) دراصل اپنے بڑوں سے سنی سنائی تقسیم ہند کے وقت کی ایک اسٹوری ہے۔ خدا کرے ہمارے قارئین کے قریب سے گزر جائے اور دل میں جگہ پائے، تبصرہ قرض ہے۔ اس وقت جلدی ہے۔ جمعہ ہفتہ یہاں ڈاک میں مسئلہ ہوتا ہے۔ مجلس ادارت میں سب کو سلام، منزہ کو بہت دعائیں، زین کے سوال جواب دلچسپ ہیں، پھر ملیں گے۔ اللہ حافظ۔

ﮯ: تسنیم جی! تبصرہ تو محبتوں کی مضبوطی کا بہانہ ہے۔ خدا آپ کو بہت ساری خوشیاں دے اور زورِ قلم اور زیادہ ہو۔ آپ کی آمد سے محفل میں دیکھیے کیسا چراغاں بپا ہے۔

✉: لاہور سے ہماری نئی ساتھی، راحت وفا راجپوت کی اولین آمد ہے، لکھتی ہیں۔ محترم ایڈیٹر صاحب سدا مثلِ گلِ خنداں رہیں آپ کی محفل میں پہلی بار شامل ہورہی ہوں۔ اگرچہ آپ کے رنگِ فسانہ میں کچھ عرصہ پہلے میری تحریر چھپ چکی ہے۔ افسانہ بھیج رہی ہوں۔ اُمید ہے کہ آپ کے معیار پر پورا اترے گا۔

ﮯ: راحت جی! خوش آمدید، اُمید ہے اب آمد کا یہ سلسلہ مستقل رہے گا۔ اب پھر سے یہ نہ ہو کہ ہم کہ ٹھہرے اجنبی......

✉: کراچی سے ہماری بہت پیاری قاری اور لکھاری مومنہ بتول عرض کرتی ہیں پیارے کاشی خوش رہو۔ ماہ نامہ دوشیزہ میں آپ کا دیا جواب پڑھا۔ اُس سے پہلے ہی میں نے اپنی اک نظم بعنوان فلسطین بھجوائی تھی پھر اک مضمون بعنوان 'بلاعنوان' پوسٹ کی براہ کرم مطلع فرمادیں کہ میری وہ کاوشیں شامل اشاعت ہیں۔ مزید برآں

میں تبصرہ تو اس سے پہلے والے خط میں کر چکی ہوں مگر ماہ ستمبر کے دوشیزہ ایوارڈ پڑھ کر بہت لطف آیا۔ تمام لکھنے والوں کے خوبصورت تاثرات اچھے لگے اب مزید اک اور افسانہ پوسٹ کر رہی ہوں براہ کرم اس کو بھی قریبی اشاعت میں جگہ دیں۔

ھ: مومنہ جی! افسانہ تو باری آنے پر شائع ہو جائے گا۔ مگر تبصرہ کہاں ہے بھئی۔ اب ایسے آنے پر جرمانہ ہوگا۔

✉: کراچی سے ہماری قاری اور لکھاری ساتھی جیجل میتلو عرض کرتی ہیں۔ محترم کاشی چوہان صاحب السلام وعلیکم! سدا خوش رہیے (آمین) اللہ تعالیٰ سے دُعا واُمید ہے کہ دوشیزہ کے سب عاشق خوش وخرم ہوں گے۔ تمام خواتین و حضرات آمین۔ دھرنوں کی ہل چل، سیاست دانوں کی بلیم بازیاں اور سیلاب کی تباہ کاریاں...... اُف خدا! میرے پاکستان پر رحم کر۔ ہمیں ہمارے ملک میں امن وخوشحالی کے ساتھ رکھ۔ آمین ثم آمین۔ بس بھیا آج کل میرے سر پر یہی چیزیں سوار ہیں۔ ایسے حبس اور ٹینشن میں ایک ٹھنڈا اور مہکتا ہوا کا جھونکا دوشیزہ اور اس کے سلسلے، کہانیاں، افسانے شاعری لگتے ہیں۔ ورنہ تھکے ہوئے اعصاب کو چین ہی نہ ملے کہیں۔ دوشیزہ ایوارڈ نمبر **2** میں سب کے اظہارِ خیال اچھے تھے۔ سب ایوارڈ یافتگان کو مبارک ہو۔ ایسی کوئی شام کا دیدار ہمیں بھی ہو جائے تو کیا کہنے۔ لکھاریوں سے، منزہ سے ملنے کا بہت شوق جی میں جاگ رہا ہے۔ اب تبصرہ ہو جائے کاشی جی کہیں گے ارے تو یہ کیا تھا۔ بھئی افسانے سب اچھے لگے۔ لیکن نسیم نیازی، صاعقہ رفاقت، سباس گل اور حمیرا خان کی تحریریں بہت خاص لگیں۔ معصومہ منصور، ریحانہ آفاق، نیئر رضاوی کی شاعری بہت پسند آئی۔ سلسلے وار ناول بہت اچھے جا رہے ہیں۔ شیخ جی نے بھی مسکراہٹیں بکھیر دیں۔ زین جی تو آج کل بہت شوخ ہو رہے ہیں، کیوں جی؟ اللہ آپ کو بہت خوش رکھے آمین۔ آخر میں سب کو سلام۔

ھ: بہت اچھی جیجل جی! آپ کے لیے بھی ہم دعا گو ہیں۔ آپ کا تبصرہ اس بار لیٹ کیوں ہوا؟

✉: فرح عالم، اسلام آباد سے کئی ماہ بعد شاملِ محفل ہیں۔ لکھتی ہیں، ستمبر کا شمارہ ایک طویل انتظار کے بعد ملا وجہ تو آپ سب کو معلوم ہی ہے کہ جب شہر یرغمال بنا لیا جائے تو پھر تمام شہر باسی بھی اُن دیکھے عتاب کا شکار ہو جاتے ہیں۔ نقشے کے تحت بنائے جانے والے اس جدید شہر میں شاید چور راستے نہیں رکھے گئے، وگرنہ ہمیں اتنی پرابلم نہ ہوتیں۔ خیر جی بات ہو رہی تھی دوشیزہ کی، کنٹینروں کی رکاوٹوں کو عبور کرتے ہم تک دوشیزہ پہنچ گیا۔ ٹائٹل بلاشبہ آؤٹ کلاس تھا اور پھر سمیع اللہ صاحب! واہ واہ...... کیا کہنے۔ فہرست پر نظر ڈالی۔ ارے اتنے پیارے پیارے نام...... واقعی یہ یادگار ہوگا۔ اداریے پر آئے 'بول کہ لب...... کاشی بھائی صرف ایک لفظ زبان سے بے اختیار نکلا۔ زبردست! سکۂ رائج الوقت صرف پانچ ہزار روپے...... خدا کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ زادِ راہ سے ہوتے ہوئے محفل تک آ گئے۔ محفل کا آغاز حسبِ حال تھا۔ جس سے ہم اور ہمارا شہر سبزہ زار واقعتاً گزر رہا ہے۔ جنیّں بھیا، بینا عالیہ، رضیہ مہدی، عادل حسین، رضوانہ کوثر، حمیرا خان، احمد سجاد بابر، عقیلہ حق، دردانہ نوشین خان، روبینہ شاہین کے تبصرے بہت زبردست رہے اور پھر سے سوال میں حفصہ خان کی معصوم صورت دل میں اُتارتے ان کے جوابات سے محظوظ ہوئے۔ ارے واہ آ گے رفعت سراج کے نئے ناول کا مژدہ تھا۔ رفعت سراج کے قلم کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ اس سے پہلے رفعت گلابی کاغذ پر زرد پھول اپنے قلم سے بکھیر چکی

ہیں، کچھ رائٹرز کے بارے میں صرف یہی کہنا کافی ہوتا ہے کہ نام ہی کافی ہے۔ رفعت سراج بھی ان ہی میں ایک ہیں۔ محفل کے بعد منی اسکرین تک پہنچے۔ کنیز اور مانگ واقعی شاندار ڈرامے ہیں۔ اس کے بعد خاصے کی چیز رہی سمیع اللہ خان کا انٹرویو، واہ کاشی بھائی۔ کیا کمال انٹرویو تھا۔ یادگار ترین، اب باری تھی ایوارڈ نمبر **2** کی۔ فرزانہ آغا نے رنگِ محفل، دردانہ کا تیرے عشق نچایا، رفعت سراج کا، مجھے کچھ کہنا ہے، شائستہ عزیز کی یادوں کی چھما چھم، دلشاد نسیم کی ایک یادگار تقریب، فرحت صدیقی کی موتیوں کی لڑی، رضیہ مہدی کی ایک روشن شام، ناہید فاطمہ کی رائٹرز کی قوس وقزح، سنبل کی ایوارڈ تقریب اور ہم وغیرہ نے ہمیں جہاں اس تقریب کا احوال سنایا وہاں اس میں شامل نہ ہونے کی کمی کا احساس بھی دل میں ہچکولے لیتا رہا۔ اِسے جس انداز میں آپ لوگوں نے پیش کیا وہ اپنی مثال آپ تھا۔ رائٹرز کو اس نفسا نفسی کے دور میں آپ نے جو مان دیا ہے ایسی مثالیں اب کہاں ملتی ہیں بھیا؟ خدا آپ سب کو سلامت رکھے۔ آیئے اب چلتے ہیں ناولز پر تبصرے کی طرف۔ تیرے عشق نچایا کی گیارہویں کڑی میں کہانی ذرا سی آگے بڑھی ہے۔ دیکھیے اب بینا صاحبہ کیا کرتی ہیں۔ آئینہ، عکس اور سمندر میں بھی انیسویں قسط نے پارہ بھر دیا ہے۔ گویا یہ قسط عقیلہ صاحبہ نے زبردست تحریر کی۔ ناول تیزی سے اپنے انجام کی جانب رواں واں ہے۔ اب سب سے فیورٹ ناول کی بات کروں گی۔ رحمٰن، رحیم، سدا سائیں کا چھٹا حصہ پڑھا۔ کیا زبردست لکھتی ہیں اُم مریم ...... سچ میں مریم جی میں آپ کی تحریر کی بہت بڑی فین ہوں۔ اس وقت یہ ناول پرچے کی جان ہے۔ اس کے بعد نسیم نیازی صاحبہ کا، محبت شام بخیر پڑھا۔ نسیم متاثر کرنے میں ناکام رہیں۔ پانچ یا چھ سین میں ناولٹ کا اختتام ہوگیا۔ قطعی طور پر زبردستی میں لکھی گئی تحریر لگی۔ (نسیم جی! آپ کی تحریر مائے نی! آج بھی میرے حافظے میں محفوظ ہے۔ پلیز مائنڈ نہ کیجیے گا) اب آیئے رنگ فسانہ کی جانب، رفعت سراج نے تجسیم سے تقسیم میں واضح کر دیا کہ لیجنڈ لکھاری اور اعلیٰ پائے کی تخلیق کیا ہوتی ہے۔ سباس گل، تمثیلہ زاہد، عادل حسین اور روشانے عبدالقیوم نے خوبصورت افسانے تحریر کیے۔ جبکہ حمیرا خان، عظمیٰ شکور، صاعقہ رفاقت کے افسانے بس گزارہ لگے۔ انتخاب خاص میں رام لعل کا رشتہ اور رنگ کائنات میں جاوید اصغر کے شیخ جی نے بھی رنگ جمایا۔ باقی نیا سلسلہ حکیم جی! آگے چل کر بہت سوں کا بھلا کرنے والا ہے۔ دیگر مستقل سلسلے بھی ہمیشہ کی طرح لاجواب رہے، اب اجازت پھر ملیں گے اگر خدا لایا۔

ھ: فرح صاحبہ! اتنے دنوں بعد آپ کی آمد ہوتی ہے۔ ہمیں معلوم ہے ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی ہوگا۔ مگر یہ مان لیجیے اس محفل میں ہم اور ہمارے قارئین آپ کے بھرپور تبصرے کا انتظار کرتے ہیں۔

☒: ساہیوال سے ہماری بہت عمدہ لکھاری نیئر شفقت محفل میں موجود ہیں، لکھتی ہیں پیارے کاشی بھیا، خوش رہو۔ اُمید ہے خیریت سے ہوں گے۔ پہلے اگست اور پھر ستمبر کے ایوارڈ نمبر کی کاپی بھیجنے کا بہت بہت شکریہ۔ آپ کا بھی اور منزہ جی کا بھی، کیا یہ سلسلہ مستقل نہیں ہوسکتا۔ (لوکر لوگل) ایک مرتبہ پھر اپنے ساتھ ساتھ عائشہ کا افسانہ بھی بھیج رہی ہوں۔ عائشہ کے پچھلے افسانے کے بارے میں آپ نے کچھ نہیں بتایا۔ وہ **Excited** ہو رہی ہے کہ شائع ہوگا یا نہیں۔ اور میرے تاثرات شائع کرنے کا بہت شکریہ۔ عیدِ قرباں کی پیشگی مبارکباد سب کو۔ اور میں اکتوبر کے دوشیزہ کا انتظار کر رہی ہوں۔ بھیجو گے نا۔ منزہ جی اور سب اسٹاف ممبران کو سلام۔

دنیا میں کس جگہ
دوشیزہ
کے چرچے نہیں
آپ دوشیزہ کے خریدار بن کر ملک کو
زرِمبادلہ دیجیے
اندرون ملک =/720 روپے
ہر ملک، ہر شہر اور ہر محلے میں دستیاب ہے
زرِسالانہ
کویت 55امریکی ڈالرز
ایران 55امریکی ڈالرز
سعودی عرب 55امریکی ڈالرز
سری لنکا 55امریکی ڈالرز
یو اے ای 55امریکی ڈالرز
جاپان 55امریکی ڈالرز
مصر 55امریکی ڈالرز
لیبیا 55امریکی ڈالرز
یونان 55امریکی ڈالرز
ڈنمارک 55امریکی ڈالرز
فرانس 55امریکی ڈالرز
جرمنی 55امریکی ڈالرز
برطانیہ 55امریکی ڈالرز
ہالینڈ 55امریکی ڈالرز
ناروے 55امریکی ڈالرز
پولینڈ 55امریکی ڈالرز
امریکہ 65امریکی ڈالرز
کینیڈا 65امریکی ڈالرز
افریقہ 65امریکی ڈالرز
آسٹریلیا 65امریکی ڈالرز
آج ہی رابطہ کیجیے
110 آدم آرکیڈ، شہید ملت روڈ/ بہادر شاہ ظفر روڈ۔ کراچی
فون نمبرز: 021-34939823,34930470

ھ: نیرؔ جی! عائشہ کے افسانے آپ کی نظر سے گزرے ہیں، تب ہی تو ہم تک پہنچے ہیں۔ یقیناً عائشہ شفقت بھی بہت جلد دوشیزہ کے صفحات پر جگمگانے والی ہیں۔ بس تھوڑا سا انتظار......

✉: شاہانہ اشتیاق کراچی سے پہلی بار محفل میں شریک ہیں۔ لکھتی ہیں، دوشیزہ میں پہلی بار شرکت کر رہی ہوں۔ امید ہے میرے خط کو ضرور شائع کیا جائے گا۔ کاشی بھائی میں آپ کو آپ کی شاعری کی کتاب 'اور تم' کے حوالے سے جانتی ہوں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ کسی پرچے میں مدیر بھی ہیں۔ اور اس پرچے میں جس کے زمانے بھر میں چرچے ہیں۔ دوشیزہ ڈائجسٹ گزشتہ **30** سال سے ہمارے گھر میں زیرِ مطالعہ ہے۔ میری دادی مطالعے کی شائق تھیں۔ اس کے بعد اُن کی بہو یعنی میری والدہ بھی ادب سے شغف رکھتی تھیں۔ والدہ کے بعد یہ شوق ہم بہن بھائیوں کے خون میں بھی آ گیا۔ دوشیزہ آج بھی پورے عروج پر ہے۔ مگر ہم آج سے دس سال پرانے پرچے دیکھتے ہیں تو لگتا ہے کہ پہلے کام ہوتا تو تھا مگر اُسے سجایا نہیں جاتا تھا۔ آج دوشیزہ کسی بھی اینگل سے دیکھیں تو بہت زبردست لگتا ہے۔ چلیے یہ تو ہماری محبت ہے مگر دوشیزہ، دوشیزہ ہے۔ اس کا مقابلہ کسی سے نہیں۔ ہمیں فخر ہوتا ہے کہ ہمارے گھر میں اتنا اعلیٰ پائے کا پرچہ آتا رہا ہے۔ اب میں تھوڑا سا ذکر کروں گی ایوارڈ نمبر کا۔ کاشی بھائی میری بات کو تعریف میں مت لیجیے گا۔ یہ حقیقت ہے کہ دوشیزہ کے **27** ویں ایوارڈ نمبر کی مثال نہیں ملتی۔ آپ کی محفل کی روداد اتنی زبردست تھی کہ سچ مچ ہم خود کو اُسی محفل کا حصہ محسوس کر رہے تھے۔ اِن دنوں دوشیزہ میں عقیلہ حق صاحبہ کا آئینہ عکس اور سمندر، بینا عالیہ کا تیرے عشق نچایا اور اُمِ مریم کا رحمٰن رحیم سدا سائیں قسط وار شائع ہو رہے ہیں۔ تینوں ناول زبردست جا رہے ہیں۔ خاص طور پر رحمٰن، رحیم سدا سائیں اور آئینہ عکس اور سمندر کا جواب نہیں۔ اس کے علاوہ سالگرہ نمبر **2** یعنی ماہِ ستمبر کے شمارے میں فرزانہ آغا، رفعت سراج، دردانہ نوشین خان، شائستہ عزیز، عقیلہ حق وغیرہ نے کمال کے تاثرات قلم بند کیے۔ افسانوں میں رفعت سراج نے کمال کر دیا۔ ایک عرصے بعد آئیں اور چھا گئیں۔ باقی مستقل سلسلے بھی خوب ہیں۔ باقی تبصرہ اگلے ماہ۔

ھ: شاہانہ! سچ پوچھو تو آپ نے بھی کمال کر دیا ہے۔ امید ہے اگلے ماہ آپ کا تبصرہ ضرور محفل کا حصہ بنے گا۔

SMS کے ذریعے محفل کا حصہ بننے والے قارئین

علیشا بانو، حیدرآباد۔ رافعیہ ناز، لاہور۔ حجاب بٹ' شیخوپورہ۔ رمیز علی، کوئٹہ۔ مہناز امام بخش، لیاری ،کراچی۔ رمشاء صادق، کراچی۔ نیہا علی، کوٹری۔ محمد دانیال اکرام، چیچہ وطنی۔ نایاب مسکان، ملتان۔ طیبہ بانو، سدرہ بانو، حویلیاں۔ دعا حنیف، کاموں کے۔ محمد نواز عارف، کراچی۔ آئینہ بخش رواں، خیبر پختونخوا۔ منتہیٰ عقیل احمد، ننکانہ صاحب۔ نازش شیر محمد، ہزارہ۔ شفق ناز، واہ کینٹ۔ نمرہ انیس، کوٹری۔ سونیا سکندر علی، ٹنڈو آدم۔ شبانہ زمان، سکھر۔

لیجیے جناب یہ تو تھے وہ خطوط جواب تک ہمیں موصول ہوئے۔ اگلے ماہ تک آپ سے اجازت چاہتے ہیں۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا اور ان کا خاص طور پر جو آپ کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ اجازت لینے سے پہلے، آپ سب کو عیدالاضحیٰ کی بہت بہت مبارک باد قبول ہو۔

آپ کا ساتھی
کاشی چوہان

دل کی باتیں

دلشاد نسیم

موسمِ خزاں

قارئین دوشیزہ کے لیے خوبصورت سوغات

میں جب بھی کچھ لکھنے کے لیے قلم اٹھاتی ہوں سب سے پہلے اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں کہ چاہے بہت نہ سہی لیکن جتنی بھی مجھے میسر ہے لفظوں کی یہ دوستی میرے پاک رب کی عطا ہے۔ میرے ہاتھ میں قلم اُس کو تحفۂ عظیم ہے۔ اس کی رضا ہے، جو میں تھوڑا بہت لکھ پڑھ لیتی ہوں۔ لفظوں کا تانا بانا بُن لیتی ہوں۔ مجھے احترام کرنا سکھایا۔ انسانیت کا سبق دیا، پہچان دی، شناخت سے نوازا......اور میری شناخت میرا ملک، میری سرزمین ہے۔ میرا وطن میرا پاکستان...... جہاں چاروں موسم بہاریں دیتے ہیں کہ اللہ پر ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔ لیکن صد افسوس کچھ عرصے سے ہمارا ملک عجیب سے بحران کا شکار ہے۔ ہم اپنی خود غرضیوں میں بھول گئے کہ پاکستان کا مطلب کیا اور اِس کی آزادی کی قیمت کیا تھی...... یہ ماہ، یعنی ماہِ ستمبر ہمارے قائد محمد علی جناح کی وفات کا مہینہ ہے۔ ہر سال کی طرح اس سال بھی یہ دن سادگی اور روایتی انداز میں ایک پریڈ اور سلامی کے ساتھ گزر جائے گا۔ یہ بات اب پرانی ہوگئی ہے کہ ہمارے قائد نے ایسے پاکستان کا خواب نہیں دیکھا تھا۔ یہ سوچ کر میری تو آنکھیں بھر آتی ہیں۔ اور پھر سارے منظر دھندلا جاتے ہیں۔ میرے وطن کی فلک بوس، برف پوش چوٹیاں اور حسین آبشاروں کا ترنم نوحے پڑھنے لگتا ہے، سمندر کی لہریں گھٹ گھٹ کے ساحل سے ٹکرا ٹکرا کے لوٹ جاتی ہیں۔ میری دھرتی کی مسموم و مغموم فضا بین کرتی پھر رہی ہے، افسردگی ہے، جہاں بھی دیکھوں دکھ ہے، خوف ہے، ایک خاموش احتجاج ہے۔ بچوں کی سوال کرتی معصوم نظریں، ہمیں ہماری ہی نظر میں مجرم بنانے کو کافی ہیں۔ وہ پوچھتی ہیں، کیا یہ وہ پاکستان ہے جس کی خاطر سنا ہے بزرگوں نے خون بہایا تھا...... اور اگر یہ سچ ہے تو پھر آج یہ کیا ہو رہا ہے؟ جو ہاتھ پکڑتا ہے اسے ہی کاٹ دیا جاتا ہے۔ ایسی خانہ جنگی جس کا مہذب معاشرے میں تصور نہیں ملتا۔ کیوں آزاد ملک سے شخصی آزادی چھینی جا رہی ہے۔ اقتدار کی جنگ، زبان کی لڑائی، فرقہ پرستی، صوبوں کی جنگ......

آنے والی نسلیں اس بات کا حساب ضرور لیں گی کہ ہم نے ان کو بھوک افلاس اور اپنے ملک سے نفرت کے سوا کیا دیا ہے۔ ہر سیاستدان اپنی دوکان چمکانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہے۔ دھرنا راج ہے تو کہیں اسلام کے نام پر کرسی کا بیوپار ہو رہا ہے۔ حکومت کی جنگ میں معصوم رعایا پس رہی ہے چاند کو روٹی کہتی ہے اور پیٹ پہ پتھر باندھ رہی ہے۔ ان غریبانِ وطن کے آنسو کون پونچھے گا......؟

دوستو! یہ کبھی نہ بھولیے گا کہ گھر ہماری پہچان ہوتا ہے۔ خدانخواستہ یہ پہچان نہ رہی تو ہم بھی کہیں کے نہ رہیں گے اور اس سے بھی پہلے ہمارے حکمرانوں کو سوچنا چاہیے کہ اگر وہ خود کو پاکستانی کہتے ہیں تو کیا سمجھتے بھی ہیں؟ اگر سمجھتے ہیں تو اس کا ثبوت دینا ہوگا، ان کو سوچنا ہوگا کہ کرسی بچانے کے لیے کرسی بنانے والے غریب عوام کا خون بہانا کہاں کی دانش مندی ہے۔ سیانے کہتے ہیں یہ اللہ کا نظام ہے۔ جیسی عوام ہوتی ہے، ویسے حکمران ہوتے ہیں اور یہی نہیں قدرتی آفات، زلزلے، سیلاب، قحط سالی یہ سب وہ علامات ہیں کہ جنہیں دیکھ کر لوگ استغفار پڑھتے ہوئے یہ سوچتے ہیں کہ حکمرانوں کو اب کوئی اچھا سا فیصلہ...... کر لینا چاہیے۔ سوچنا چاہئے کہ یہ ملک ہے، قربان گاہ نہیں۔ ہم اپنی آنے والی نسلوں کے سامنے سر اٹھاتے ہوئے شرمندہ ہوں گے......

موسمِ خزاں

سنو!
بہت تیرگی ہے
اندھیرا چاروں جانب یوں بہہ رہا ہے کہ جیسے
ہاتھ کھولے اماوس کھڑی ہو
محبت منہ سر لپیٹے کسی کونے میں گم ہو چکی ہو
سنو
یہ کون سا موسم ہے
کھلتا نہیں
ساون ہوگا...... جبھی تو دھرتی جل تھل ہے
نہیں شاید بھادوں......
کہیں برس رہا ہے پانی
کہیں ترسا رہا ہے پانی
یا پھر بہار کا موسم......
مگر اب کے آنگن میں کیسی بہار اُتری ہے
منظر چہک رہے ہیں، نہ فضا ہی ذرا بھی نکھری ہے
سرخی ناچ رہی ہے
جانے خون کی ہولی ہو رہی ہے
اور جو یہ بھی نہیں ہے تو پھر خزاں ہوگی
زندگی کی آخری سانس لیتے پتوں جیسے وجود
بڑے بڑے آہنی پیروں تلے روندے جا رہے ہیں
ہاں ہاں! یہ خزاں ہی ہے
آہ...... اگلی خزاں تک
جانے کتنے پتے اور روندے جا چکے ہوں گے
جانے!!

☆☆......☆☆

منی اسکرین پر پیش کیے جانے والے مقبولِ عام ڈراموں پر بے لاگ تبصرہ

علی رضا عمرانی

اس وقت پاکستان میں تقریباً بیسیوں چینل عوام کی دسترس میں ہیں۔ اس الیکٹرانک خوشحالی میں جہاں عوام کے پاس معیاری ڈراما دیکھنے کا کال نہیں، وہیں ڈراموں کی بہتات نے بہتر سے بہترین، معیار اور کوالٹی کے لیے چوائس آسان کردی ہے۔ منی اسکرین میں ہم مقبولِ عام ڈراموں پر بے لاگ تبصرہ شائع کریں گے۔

مریم کیسے جیے

یہ ڈرامہ ایک غیر معمولی عورت کی کہانی پر بیسڈ کرتا ہے۔ یہ ڈرامہ ARY ڈیجیٹل پر دکھایا جارہا ہے۔ مریم کے ساتھ ہونے والے غیر معمولی واقعات نے اس ڈرامے کی ریٹنگ میں بے تحاشا اضافہ کردیا ہے۔ پبلک نے ڈرامے کو سراہا ہے۔ اس ڈرامے کی کاسٹ میں حنا الطاف، شگفتہ اعجاز، ثناء عسکری، عمران اسلم، حسن احمد، محمود اختر، صائمہ قریشی اور دردانہ بٹ وغیرہ شامل ہیں۔

چپ رہو

اس ڈرامے میں ایک حساس موضوع کو موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ''چپ رہو'' نام میں ہی کہانی کا مرکزی خیال چھپا ہوا ہے، جس میں ایک ایسی لڑکی کو دکھایا ہے جو اپنے بہنوئی کی ہوس کا شکار ہوچکی ہوتی ہے۔ اس کی ماں اپنی بیٹی کے ساتھ ہونے والی زیادتی کے باوجود اسے خاموش رہنے کا حکم دیتی ہے۔ رامین بہن کی زندگی بچانے کی خاطر زبان پر تالا لگائے رکھتی ہے۔ ڈرامے میں دوسری طرف رامین کا منگیتر آذر روایتی سوچ کا مالک لڑکا دکھایا گیا ہے، جو ایسی لڑکی سے شادی کا تصور بھی نہیں کرسکتا، جس کا پہلے کسی اور سے تعلق رہا ہو۔ وہ اکثر اپنا یہ فلسفہ رامین کے سامنے دہراتا ہے، جس پر وہ مسلسل ذہنی دباؤ کا شکار رہنے لگتی ہے۔ درحقیقت اس کہانی میں ہماری لڑکیوں کے لیے کافی سبق موجود ہیں۔ اگر وہ اپنے اوپر ہونے والے ظلم کے خلاف آواز نہیں اٹھائیں گی تو ظالم کو شہہ ملتی رہے گی۔

اے آر وائی ڈیجیٹل کی پیشکش ہے۔ اس کے ڈائریکٹر یاسر نواز ہیں جبکہ کہانی سمیرا افضل نے تحریر کی ہے۔ اداکاروں میں، سجل علی، فیروز خان، ارجمند

رحیم، یاسر نواز وغیرہ شامل ہیں۔اس کی چند اقساط پیش کی جا چکی ہیں۔

''صدقے تمہارے''

یہ ہم ٹی وی کی نئی سیریل کا نام ہے، جس کی سب سے خاص بات اس میں مائرہ خان کا جلوہ گر ہونا ہے، جو کچھ عرصے سے ڈراموں کی دنیا سے دور تھیں۔اس کی کہانی روایتی فارمولوں پر مبنی ہے۔جسے مومنہ درید پیش کر رہی ہیں۔اس کو خلیل الرحمٰن قمر نے تحریر کیا ہے۔جن کا ڈرامہ ''پیارے افضل'' کامیابیوں کی منازل طے کرتا ہوا اختتام پزیر ہوا۔

مائرہ خان نے اس ڈرامے میں بطور ہیروئن، گاؤں کی ایک گوری کا کردار نبھایا ہے۔جس کو ایک فلم ساز عدنان ملک سے محبت ہوجاتی ہے۔ان دونوں کی ملاقات گاؤں میں ہونے والی ایک شادی میں ہوتی ہے، جہاں سے یہ ٹریجک لو اسٹوری شروع ہوتی ہے۔اس ڈرامے کے لیے مائرہ نے خصوصی طور پر غرارہ سوٹ زیب تن کیا ہے۔اس میں روایتی محبت کے تمام سین پیش کیے گئے ہیں۔کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ کہانی میں کامیاب ڈرامہ سیریل ''ہمسفر'' اور ''داستان'' کے مناظر کو یکجا کر کے پیش کیا گیا۔

''خدانہ کرے''

''خدا نہ کرے'' اے آر وائی ڈیجیٹل سے پیش کیا جانے والا ایسا ڈرامہ ہے جو ان لڑکیوں کو حوصلہ فراہم کرتا ہے جو

اپنی مرضی کے برخلاف ہونے والے فیصلوں پر انکار نہیں کر سکتیں۔اس ڈرامے کے مرکزی کرداروں میں سونیا خان اور گلوکار و اداکار جنید خان ہیں۔ان کے علاوہ صلاح الدین تنیو اور سلمان شاہ وغیرہ شامل ہیں۔حالیہ برسوں میں روایتی ساس بہو کے ظلم وتشدد اور آنسو پر مبنی سیریل کے مقابلے میں اس ڈرامے کی کہانی منفرد ہے۔روایتی سی شادی شدہ ماحول میں دو پریمیوں کے ملن کی تیاری ہو رہی ہوتی ہے کہ اچانک دلہن بنی سونیا خان، مولوی صاحب کے پوچھنے پر شادی سے انکار کر کے، اپنی واضح ناپسندیدگی کا اظہار کر دیتی ہے۔سونیا نے کئی بار اس طرح کے کردار ادا کیے ہیں، جو ایک متوسط طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔تاہم ان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر بار ان میں حقیقت کا رنگ بھرنے میں کامیاب ہوگئی ہیں۔

☆☆......☆☆

کامیاب اور معروف ہدایت کار

فہیم برنی

ذیشان فراز

☆وہ نام جو شناخت کا باعث ہے؟
♥:فہیم برنی۔
☆گھر والے کیا کہہ کر پکارتے ہیں؟
♥:فیمی۔
☆وہ مقام جہاں آنکھ کھولی؟
♥:لاہور۔
☆زندگی کس برج(star) کے زیر اثر ہے؟
♥: کیپری کورن۔
☆علم کی کتنی دولت کمائی؟
♥:ایم بی اے۔
☆ کتنے بھائی بہن ہیں؟
♥:ایک بھائی ایک بہن۔
☆موجودہ کیریئر (مقام) سے مطمئن ہیں؟
♥:جی بالکل۔
☆وجہ شہرت کون سا پروگرام بنا؟
♥:ڈرامہ سیریل منزلیں۔
☆تعریف یا تنقید کس حد تک ہوتی ہے؟
♥: زیادہ تر تعریف ہی ہوتی ہے۔ تنقید پر زیادہ توجہ دیتا ہوں۔

☆ہدایت کاری کے لیے مزاج کے برعکس موڈ بنانا ضروری ہے؟
♥: میں جب ایک بار سیٹ پر آ جاؤں تو سب کچھ بھول جاتا ہوں۔ پھر میری ساری توجہ اپنے کام پر ہوتی ہے۔ موڈ خود بخود بن جاتا ہے۔
☆اس زندگی میں سب سے مشکل کام کون سا ہے؟
♥:لڑنا۔
☆کوئی خواہشِ ناتمام؟
♥:ایسی کوئی خواہش نہیں ہے۔
God Is Very Kind To Me
☆کون سی چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے؟
♥: کسی کی نہیں۔
☆اپنی کون سی عادت پسند ہے؟
♥: تمام عادتیں پسند ہیں۔
☆محفل پسند ہیں یا تنہائی پسند؟
♥: بہت **Social** ہوں۔
دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی، فرصت کے رات دن۔
☆کون سا ملک پسند ہے؟
♥: پاکستان! اپنا ملک اپنا ہی ہے۔

☆ لباس جگ بھاتا پہنتے ہیں یا من بھاتا؟

♥: من بھاتا، میں کہیں سے بھی شاپنگ کرسکتا ہوں، بس چیز میرے معیار اور پسند کی ہو۔

☆ اردو والے "سفر" کا ذریعہ کیا ہے؟

♥: پلیز یہ سوال نہ پوچھا کریں اپنے انٹرویو میں۔

☆ دن کا آغاز کیسے کرتے ہیں؟

♥: قرآن شریف پڑھ کر۔

☆ کون سے معاشرتی رویے جو دکھ کا باعث ہیں؟

♥: جھوٹ۔

☆ دولت، عزت، محبت، شہرت ترتیب دیں؟

♥: صحت، دولت، محبت، عزت، شہرت۔

☆ پہلی ملاقات میں ملنے والے کی کس بات سے متاثر ہوتے ہیں؟

♥: میں بہت بار ملنے کے بعد بھی بہت کم متاثر ہوتا ہوں۔

☆ غصے میں کیا کیفیت ہوتی ہے؟

♥: خاموشی۔

☆ لوگوں کی نظر میں آپ کی شخصیت؟

♥: لوگ بتا سکتے ہیں۔

☆ موت خوف کا باعث؟

♥: نہیں، سب کو مرنا ہے۔

☆ فراز کے اس خیال پر کس حد تک یقین رکھتے ہیں کہ دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا؟

♥: سو فیصد۔

☆ کون سا تہوار اہتمام سے مناتے ہیں؟

♥: تمام، مجھے خوش ہونے کا موقع چاہیے ہوتا ہے بس۔

☆ اگر ہدایت کار نہ ہوتے تو؟

♥: تو بھی ہدایت کار ہی ہوتا۔

☆ کامیابی میں کس کا ہاتھ ہے؟

♥: میں ٹیم ورک پر یقین رکھتا ہوں۔ میری ٹیم ہی میری کامیابی کی ضمانت ہے۔

☆ پسندیدہ موسم؟

♥: سردی۔

☆ پسندیدہ کھانے؟

♥: سبھی کچھ شوق سے کھاتا ہوں۔

☆اخبار، میگزین پڑھنا عادت ہے یا ٹائم پاس؟
♥: میں اپنے اردگرد سے باخبر رہنے کے لیے اخبار پڑھتا ہوں۔
☆اگر کبھی موقع ملے تو عوام کے لیے کیا کریں گے؟
♥: سب کی جائز خواہشات اور حقوق پورے کروں گا۔
☆کیا آپ اچھے راز داں ہیں؟
♥: بالکل ہوں۔

☆کامیابی کا راز؟
♥: اصول پسند ہوں۔ کام سے محبت اور انکساری۔
☆موجودہ دور کی بہترین ایجاد؟
♥: ہر وہ چیز بہترین ایجاد ہے جو انسانیت کی خدمت کے لیے بنی ہے۔
☆کبھی زندگی سے بے زاری ہوئی؟
♥: خدا نہ کرے۔
☆موسیقی روح کی غذا ہے؟
♥: بالکل ہے اور ہر طرح کی موسیقی، ہر بندہ

☆جوڑے آسمان پر بنتے ہیں؟
♥: جی ٹھیک بات ہے۔
☆زندگی کے معاملات میں آپ تقدیر کے قائل ہیں یا تدبیر کے؟
♥: دونوں کا۔
☆شہرت، رحمت یا زحمت؟
♥: رحمت! لوگ بہت پیار کرتے ہیں۔
☆آئینہ دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟
♥: آج بھی ویسا ہی ہوں۔

الگ طرح کی خوراک سے اپنی روح کو سیر کرتا ہے۔
☆شوبز کی دنیا کی سب سے بڑی خرابی؟
♥: یہاں جھوٹ اور منافقت بہت ہے۔
☆خودستائشی کے کس حد تک قائل ہیں؟
♥: ایک حد تک ہر انسان کو ہونا چاہیے۔
☆حرف آخر کیا کہیں گے؟
♥: خوش رہیں دوسروں کے لیے آسانیاں پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ دیوار نہ بنیں، لوگوں کو رستہ دیا کریں۔

☆☆......☆☆

عشق کی راہداریوں، طبقۂ اشرافیہ اور اپنی مٹی سے جُڑے لوگوں کی عکاسی کرتے سلسلے وار ناول کی بارھویں کڑی

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

ملک قاسم علی جہان آباد کے مالک تھے۔ ان کا شمار ضلع خوشاب کے جانے مانے زمینداروں میں ہوتا تھا۔ ان کے دو بیٹے ملک عمار علی اور ملک مصطفیٰ تھے۔ عمار علی ریاست کے امور میں دلچسپی لیتے تھے جبکہ ملک مصطفیٰ علی چھوٹی بہن امل کے ساتھ تعلیم کے سلسلے میں لاہور رہائش پذیر تھے، ملک عمار علی کی شادی ان کی کزن ماہین سے ہوئی تھی۔ وہ اٹھارہ سالہ لڑکی خود سے عمر میں کئی سال بڑے ملک عمار علی کو ذہنی طور پر قبول نہ کرسکی تھی۔ وہ کانوینٹ سے پڑھی ہوئی اور خاصے آزاد خیالات رکھتی تھی، جو لائف بھرپور طریقے سے انجوائے کرنا چاہتی تھی۔ امّ فروا امّ زارا اور اسماعیل بخش مولوی ابراہیم کی اولادیں ہیں۔ ام فروا کی شادی بلال حمید سے ہوئی ہے جو میڈم فیری کے لیے کام کررہا ہے۔ میڈم فیری کا تعلق اس جگہ سے تھا جہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ بلال حمید اُم فروا کو پہلی بار میکے لے کر آیا تھا کہ میڈم فیری کی کال آگئی......

میڈم فیری نے بلال عرف بالو کو باور کرایا کہ جلد اُم فروا کو ان کے حوالے کردے۔ بلال حمید کے لیے یہ ناممکن سا ہوگیا تھا کیونکہ وہ اُم فروا سے واقعی محبت کرنے لگا تھا۔ ماہین اپنے دیور مصطفیٰ علی میں دلچسپی لینے لگی تھی۔ امل کی تعلیم مکمل ہوتے ہی اُس کی شادی اُس کے کزن محمد علی کے ساتھ ہونے کی تیاریاں ہونے لگی تھیں لیکن امل کے خیالات کسی اور طرف بھٹکنے لگے تھے۔

ماہین اپنے بچپن کے دوست کاشان احمد سے ملتی ہے تو پتا چلتا ہے کاشان بچپن ہی سے اُس میں دلچسپی لیتا تھا مگر کبھی محبت کا اظہار نہ کرپایا۔ ماہین اپنے آئیڈیل کے اس طرح بچھڑ جانے پر دکھی ہے۔ کاشان احمد ملک سے باہر جانے سے پہلے ماہین سے محبت کا اظہار کردیتا ہے۔ ماہین ملک عمار علی سے ویسے ہی ناخوش ہے اس پر کاشان احمد کا اظہار محبت اُس کی زندگی میں ہلچل مچا دیتا ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

بس اب یہ سب کرنے کی آپ کو اجازت نہیں دوں گی۔'' ماہین نے ہاتھ کے اشارے سے روکنے والے انداز میں کہا۔ وہ بڑی بڑی آنکھوں کو انگاروں کی طرح لال کیے اس چھوٹی سی لڑکی کی اتنی لمبی زبان کو دیکھ رہے تھے۔ جو منہ کے اندر رُک ہی نہیں رہی تھی۔

''آپ نے دو ماہ سے مجھے اس جنگل میں قید کیا ہوا ہے۔ میں بھی جیتی جاگتی انسان ہوں۔ میں کیوں نہیں
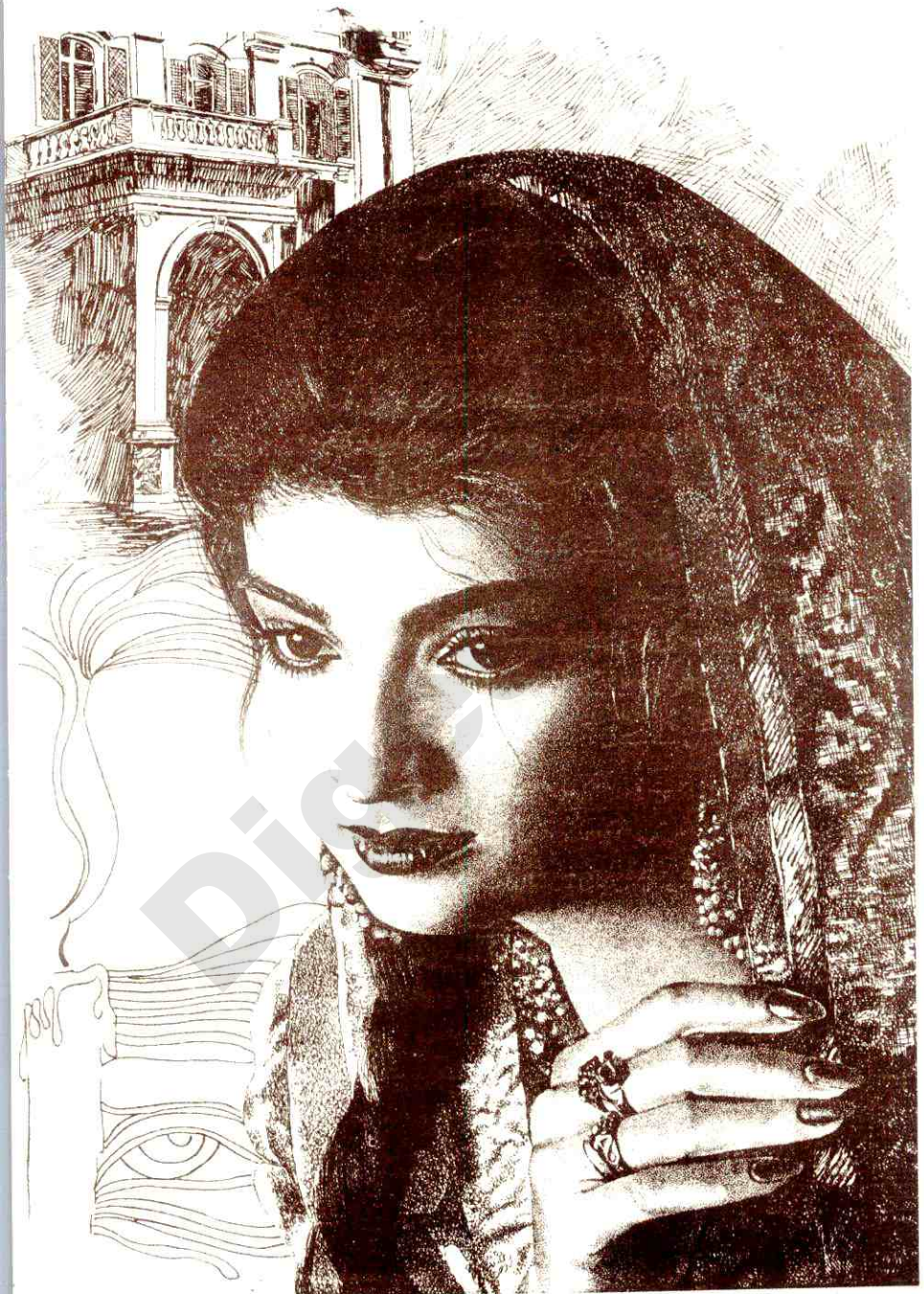
اپنی زندگی اپنے طریقے سے گزار سکتی۔ آپ کی زوجیت میں آتے ہی اپنی خوشی سے جینے کا حق مجھ سے چھین لیا گیا ہے۔ آج آپ بتا ہی دیں ایسا کیوں کر رہے ہیں آپ۔ اب اور یہ سب نہیں چلے گا۔'' آج جانے کیوں پہلی بار اُس پر یوں پاگل پن کا دورہ پڑا تھا۔ ملک عمار علی اب بھی اُسے گھور رہے تھے۔

''میں آپ کے نکاح میں کیا آئی آپ تو فاتح عالم بنے مجھے تسخیر کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔'' وہ تیز آواز میں غرائی۔

''ماہین تم حد سے بڑھ رہی ہو۔''

''عمار کس نے مجھے حد سے بڑھنے پر مجبور کیا ہے۔ صرف آپ نے۔'' وہ ملک عمار علی کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے بولی۔ ماہین کا چہرہ اور آنکھیں گلابی ہو رہی تھیں۔

''ماہین خاموش ہو جاؤ۔ بہت سُن لی تمہاری بکواس۔'' آرے کی طرح تیز بھاری گڑگڑاہٹ بھری آواز میں وہ بولے۔

''عمار میں نے بھی آپ سے کہہ دیا ہے مجھے ماسٹرز کرنا ہے۔ آپ مجھے صبح لاہور چھوڑ آئیں۔ اگر آپ نہیں جاسکتے تو ڈرائیور کے ساتھ مجھے بھیج دیں۔''

''تم کہیں نہیں جاسکتیں۔ اسی حویلی میں رہوگی۔'' ملک عمار علی کی آواز میں تلوار جیسی کاٹ تھی۔ اب کی بار وہ اُن کی بھاری بھرکم آواز سے سہمنے کے بجائے اُسی تیزی سے بولی۔

''میں یہاں ہرگز نہیں رہوں گی۔ آپ لوگوں نے مجھے قید کر رکھا ہے۔ میں اب اور اس قید خانے میں نہیں رہ سکتی اور نہ ہی آئندہ کوئی مجھے مجبور کرے گا۔'' وہ ست روی کے ساتھ، تحمل مزاجی سے تمام مسائل حل کرنا چاہتی تھی لیکن ملک عمار علی اُس کی ذاتی خوشی، اس کی اپنی مرضی کو مفلوج بنا رہے تھے۔

''آپ مجھے اب جبر میں رکھ کر مجبور نہیں کر سکتے۔''

''اپنے مجازی خدا کے سامنے زبان چلاتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آ رہی۔''

''نہیں آ رہی یہاں تک آپ مجھے مجبور کر کے لائے ہیں۔ ایسا مجھے بہت پہلے کر لینا چاہیے تھا جبکہ آپ لوگوں نے میرے ممی ڈیڈی سے وعدہ کیا تھا شادی کے بعد آپ مجھے پڑھنے دیں گے۔'' ماہین بیڈ سے اُٹھی اور پیروں میں چپل اڑستی واش روم کی جانب بڑھ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''ممی ڈیڈی آپ نے مجھے کہاں بھیج دیا جہاں میرے پاس آپ سب میں سے کوئی بھی نہیں ہے۔ مجھ پر کیا بیت رہی ہے آپ نہیں جانتے۔'' تب ماہین کی آنکھوں کا پانی شاور کے پانی کے ساتھ ساتھ بہنے لگا۔

دو دن تک ملک عمار علی اور ماہین میں کوئی بات چیت نہیں ہوسکی تھی۔ وہ جب بھی اپنی خواب گاہ میں آتے ماہین وہاں سے نکل جاتی۔ یا تو وہ مراد محل کی وسیع و عریض لائبریری میں چلی آتی یا میوزک روم میں خود کو بند کر لیتی۔

آج کافی دنوں بعد اچھی نیند نے ماہین کو اپنی پناہوں میں لیا تھا۔ شام سات بجے وہ اُٹھی۔ اس دوران ملک عمار علی خواب گاہ کے دو تین چکر لگا چکے تھے۔ ماہین نے نیم وا آنکھوں سے دیکھا تو وہ اب بھی دکھائی دے رہے تھے۔ وہ کمرے میں آہستہ روی سے چہل قدمی کر رہے تھے۔ دیوار گیر ونڈو گلاس کی طرف بڑھتے تھوڑی دیر باہر کے بڑھتے ملگجے اندھیرے پر نظریں گاڑتے۔ یہ ونڈو پائیں باغ کی طرف کھلتی تھی، جہاں پھل کے درخت

پھلوں سے لدے ایک دوسرے سے راز و نیاز کرتے دکھائی دیتے۔ درختوں کے پتوں میں چھپے پرندے کبھی تو بے تحاشا شور مچاتے اور کبھی گہری خاموشی میں چلے جاتے۔ ابھی بھی کچھ پرندے درختوں کی چوٹیوں پر چکریاں کاٹ رہے تھے۔ شاید ابھی اُن کا دل اپنی اپنی خواب گاہوں میں جانے کو نہیں کر رہا تھا۔ اس وقت پائیں باغ کا ماحول پُراسرار سا دکھائی دے رہا تھا۔ بے شمار درختوں کا یوں بنا جنبش کیے ساکن ایستادہ ہونا، ایسا ہو کا عالم دل میں بے نام سی بے قراری برپا کر رہا تھا۔

ملک عمار علی کافی دیر تک کھڑکی میں کھڑے رہے۔ کھڑکی کا شیشہ بند تھا، پھر بھی پرندوں کی چہچہاہٹ خواب گاہ کی ساکن خاموشی میں مضمحل سا ارتعاش برپا کر رہی تھی۔ پھر باہر رہ جانے والے اپنے ساتھی کو زور زور سے آوازیں دیتے۔

ماہین نے پوری آنکھیں کھول کر دیکھیں۔ عمار علی بازوؤں کو کمر کی طرف پیچھے باندھے۔ کافی دیر سے کھڑکی کے سامنے کھڑے ہوئے تھے۔ ماہین بستر سے اٹھی، دوپٹا گردن کے گرد لپیٹا۔ پاؤں میں سلیپر اڑسے اور واش روم کی جانب جانے لگی۔ ملک عمار علی نے نہایت سرعت سے پلٹ کر ماہین کی طرف دیکھا۔ اُن کا چہرہ تفکرات کی موٹی سلوٹوں سے اٹا ہوا تھا۔ بڑی بڑی شہد آگیں آنکھیں گلابی ہو کر تھکان سے چور دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ کب سے کھڑکی کے پاس کھڑے تھے۔ ماہین اُن کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی۔

ان دونوں میں اکثر چھوٹی موٹی تکرار ہوتی رہتی تھی۔ ایک آدھ دن سے زیادہ ناراضگی نہیں چلتی تھی۔ لیکن اب کی بار ایسا نہ ہوا۔ زیادہ تر ملک عمار علی ہی اُسے مناتے تھے۔ وہ ماہین کی ناراضگی تھوڑی دیر کے لیے بھی سہار نہ پاتے تھے۔ اس بار دو دن بیت چکے تھے دونوں کو ایک دوسرے سے بات کیے۔ ملک عمار علی ہمیشہ منہ پھٹ ماہین کی بدتمیزیاں اگنور کر جاتے۔ بچی ہے ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے، عمر سے ہی انسان میں میچور پن آتا ہے۔ ہمیشہ سے اسلام آباد میں رہنے والی ٹین ایج لڑکی اس پسماندہ گاؤں میں آ گئی ہے۔ تو اس طرح ری ایکٹ کرنا فطری سی بات ہے۔ ملک عمار علی کی اُس سے محبت ہی تو تھی کہ اس کی خطائیں وہ ناسمجھی سے تعبیر کرتے ہوئے اُس کی تلخ کلامی جان بوجھ کر پسِ پشت ڈال دیتے تھے۔ ساعتوں کے گنبد میں ماہین کی انتہائی منہ پھٹ گفتگو اُنہیں خاصا بے چین رکھتی۔ لیکن اس بار اس یخ بستگی کی چادر میں لپٹی عورت کے اندر ملک عمار علی نے اپنی طاقت، اپنی مردانگی، اپنے شوہر ہونے کے لیبل نے اُن کے تحکمانہ لب و لہجے نے ماہین کے اندر چنگاریاں بھر دی تھیں۔ اس نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ وہ اب مزید جبر نہیں برداشت کرے گی۔ وہ عمار علی کے ساتھ اب نہیں رہے گی۔ ممی ڈیڈی کی خواہشوں کی بھینٹ اس نے خود کو چڑھا لیا تھا۔

سوچوں کے ڈستے ناگ اس کا تن من جھلسا رہے تھے۔ موتی دھند زدہ سفیدی ماہین کی آنکھوں کے سامنے کپکپا رہی تھی۔ وہ دیر تک شاور لیتی رہی۔ تازہ پانی نے اُسے خاصا فریش کر دیا تھا۔ بلیک اورنج سوٹ میں وہ کھلی کھلی لگ رہی تھی۔ بال تولیے سے خشک کرتے ہوئے اب وہ بالوں میں برش کر رہی تھی۔ ملک عمار علی صوفے پر بیٹھے انگلیوں میں سلگتا سگریٹ پکڑے اُسے دیکھ رہے تھے۔ اُس کے بالوں سے نکلتے پانی کے ننھے ننھے قطرے صبح نور کی شبنم کی طرح قالین کے شوخ پھولوں کی لمبی فرل میں گم ہو رہے تھے۔ ملک عمار علی سوچتی آنکھوں کے درمیان سگریٹ کے طویل کش لیتے دھواں اپنے اوپر چھوڑ رہے تھے۔ اوپر کی جانب اچھلتا دھواں بل کھاتا مرغولے بناتا توقف بعد غائب ہو جاتا۔ عمار علی کبھی اپنی خواب گاہ میں سگریٹ نہیں پیتے تھے کیونکہ ماہین کو

سگریٹ کی بُو بہت بُری لگتی تھی۔ اس وقت وہ جان بوجھ کر یہاں بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے تاکہ ماہین اُنہیں منع کرے، اس طرح اُن کا بات چیت کا سلسلہ دوبارہ بحال ہو جائے۔

وہ اس وقت بہت بے چین تھے۔ اس طویل خاموشی سے ایک میٹھی کسک اُن کے اندر کروٹیں لے رہی تھی اُن کی سوچ کے برعکس ماہین کچھ نہ بولی۔ وہ اب بھی بالوں میں برش گھما رہی تھی۔ اُس نے ہونٹوں پر لپ اسٹک پھیری پرفیوم اسپرے کیا، گلے میں دوپٹا ڈالا اور ملک عمار علی کے نزدیک سے گزر کر خواب گاہ سے باہر نکل گئی۔

وہ بار بار ملک عمار علی کی انا کو مجروح کر رہی تھی۔ وہ ماہین کی بے اعتنائی اس لیے نظر انداز کر رہے تھے کہ وہ اس سے محبت کرتے تھے۔ ملک عمار علی صرف اپنے دل کی سنتے تھے۔ انہوں نے ہمیشہ اپنے لیے سوچا، اپنی خوشی کو مقدم جانا۔ آج سے تین سال پہلے اس کم سن لڑکی کو کہاں سے کہاں لا کر بٹھا دیا تھا۔

رات دیر تک بڑے دالان خانہ میں جہاں پلازمہ رکھا ہوا تھا۔ ماہین بیٹی رہی۔ اس کا دل اپنے بیڈروم میں جانے کو بالکل نہیں کر رہا تھا، نہ اسے نیند آ رہی تھی۔ وہ نیشنل جیوگرافک پر برف میں پھنسے کوہ پیما پر بنی ڈاکیومینٹری دیکھ رہی تھی۔ وہ ہمیشہ ممی ڈیڈی، آیان اور ارسل کو یاد کرتی تھی۔ اس وقت وہ سبھی ماہین کو بے طرح یاد آ رہے تھے۔

'کاش وہ لوگ میرے پاس ہوتے یا میں اُن کے پاس ہوتی تب میں کس قدر خوش ہوتی'۔

اُسے اسلام آباد بھی بہت یاد آتا، مارگلہ کی پہاڑیوں میں گھرا جنت نظیر اسلام آباد، جہاں ان کا نہایت خوبصورت گھر تھا۔ جس میں ایک باربی ڈول جیسی نیلی آنکھوں والی لڑکی رہتی تھی۔

وہ کب سے اپنے سنہرے بچپن میں کھوئی ہوئی تھی۔ اچانک اُسے غیر معمولی خوبصورت آنکھوں والا کاشان یاد آ گیا۔ ''جانے شان کب لوٹے گا۔'' وہ جب سے گیا تھا ماہین کا اُس سے رابطہ نہیں ہوا تھا۔ اسے اُس کا نیا نمبر نہیں معلوم تھا نہ ہی وہ افرا آنٹی کے پاس اُن کی خیریت معلوم کرنے جا سکی تھی۔ جبکہ ماہین نے کاشان احمد سے وعدہ کیا تھا کہ میں تمہارے ممی پاپا کی خیریت معلوم کرتی رہوں گی۔'' چند روز بعد تو وہ امل کی شادی کے سلسلے میں جہان آباد آ گئی تھی۔ یاہین کو پتا ہی نہ چل سکا کب ملک عمار علی مردان خانے سے آ کر اپنی خواب گاہ میں گئے۔ وہ اپنی ہی سوچوں میں گم تھی۔

سامنے لگے دیوار گیر گھڑیال نے جب تین کا گھنٹہ بجایا تو وہ بوجھل قدم اٹھاتی اپنی خواب گاہ کی جانب بڑھنے لگی۔ جیسے ہی اس نے دروازہ دھکیلا ملک عمار علی سامنے صوفے پر نیم دراز تھے۔ وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے ہوئے تھے۔ اُن کی انگلیوں کی پوروں میں سگریٹ سلگ رہا تھا۔ سگریٹ کے سرے پر لگی راکھ سے اندازہ ہو رہا تھا کافی دیر سے سگریٹ ہونٹوں سے نہیں لگایا گیا اس وقت اُن کی شہد آگیں آنکھیں تھکی ہوئی نڈھال سی لگ رہی تھیں۔ جن میں گلابی ڈورے اترے ہوئے تھے۔ وہ دبے قدم اٹھاتی ڈریسنگ روم کی جانب بڑھ گئی۔

تھوڑی دیر بعد وہ نائٹ سوٹ پہنے اپنے بستر پر آ کر لیٹ گئی۔ سیدھی کروٹ لیتے ہی ماہین نے سیدھی ہتھیلی گال کے نیچے رکھی اور آیت الکرسی پڑھنے لگی۔ یہ تمام باتیں بچپن میں ماہین کی دادی نے اسے سکھائی تھیں، جو اُس کے ذہن میں بیٹھ چکی تھیں۔ جب آیان اور ارسل نہیں تھے اکلوتی ماہین سب بڑوں کی لاڈو تھی۔ رات کو وہ دادو کے کمرے میں جا کر اُن سے کہانیاں سُنا کرتی، وہ دادو کے بازو پر سر رکھے لیٹ جاتی۔ وہ ہمیشہ پیغمبروں کے چھوٹے چھوٹے قصے دلچسپ انداز میں سنایا کرتیں۔ اختتام پر وہ پُرزور انداز میں سمجھانے کی کوشش کرتیں۔

''دیکھا بیٹا وہ لوگ کتنے نیک، ایماندار تھے۔ کسی بشر کو تکلیف نہ پہنچاتے۔ ہر تکلیف رضائے الٰہی سمجھ کر خوشی خوشی برداشت کرتے۔ ہر لحہ عبادتِ خدا میں گزارتے۔ اللہ کی اطاعت پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرتے۔ تکالیف میں اور بیماری میں بھی رب کا شکر بجالاتے۔ بھوک پیاس پر خدا کی مرضی کہہ کر سجدہ ریز ہوتے ہوئے مالک سے معافی کے درخواستگار رہتے کہ ہم سے کوئی بھول چوک ہوگئی ہو تو ہم پر بوجھ نہ ڈالیو! بلکہ ہمارے گناہِ صغیرہ وکبیرہ معاف فرما دیجیو۔ جب ہی تو خدا پر توکل کرنے والوں کی غیب سے اللہ مدد فرماتا، انُہیں کسی نہ کسی وسیلے سے پیٹ بھر کر کھانا مل جاتا۔'' باتوں ہی باتوں میں دادو، ماہین کو چھوٹی چھوٹی حدیثیں یاد کراتی رہتیں۔

دادو کی یہ تمام باتیں اس کے دماغ میں حفظ تھیں۔ بچپن میں دادو کی یاد کرائی یہ تمام آیات وہ اکثر تنہائی میں پڑھا کرتی تھی۔ رات کو سونے سے پہلے بھی چند سورتیں ضرور پڑھتی۔ جب اکثر خدا اسے اپنے بے حد قریب محسوس ہوتا، وہ اندر سے کمرہ لاک کر لیتی۔ کمرے میں مکمل اندھیرا کر کے وہ ممی کے بڑے سے سفید دوپٹے کی بکل مارے جاءِ نماز بچھا کر نماز پڑھنے کے بعد دادو کی یاد کرائی سورتیں پڑھتی آخری میں نوافل پڑھنا شروع کر دیتی۔ قرآن پاک بھی وہ اکثر تنہائی میں پڑھا کرتی۔ یہ تمام کام وہ اپنے بیڈ روم میں دروازہ بند کیے بھاری پردے گرائے کیا کرتی تھی۔ جبکہ ممی ڈیڈی اسے تاکید کرتے کہ ماہی بیٹا نماز پڑھا کرو۔ دادو نے تمہیں نماز اور قرآن پاک تو پڑھا دیا ہے۔ بیٹا تم روزانہ ضرور تھوڑا تھوڑا پڑھا کرو۔ ورنہ بھول جاؤ گی۔ اسکول سے آنے کے بعد بس اپنے کمرے میں سوئی ہی رہتی ہو۔'' اب پھوپی ماں یہی بات اس سے کرتی تھیں۔

''ماہین پتر نماز پڑھا کرو۔ سب سے پہلا سوال نماز کے بارے میں ہوگا۔ نماز کی ہرگز معافی نہیں ہے۔'' پھوپی ماں اس کے لیے فکرمند ہو جاتیں۔

''جی اچھا۔'' وہ آہستگی سے کہتی اور بات بدل دیتی وہ ہمیشہ سے باقاعدہ نماز پڑھتی تھی۔ بچپن میں دادو نے اس طرح اس کے دماغ میں خدا اور اُس کے رسولؐ کے حکمات بٹھائے تھے۔ بچپن کی یادیں کبھی بھلائی نہیں جاتیں۔

جب صبح ملک عمار علی وضو کر کے اپنی خواب گاہ سے مسجد جاتے نماز پڑھنے تب ماہین اپنے بستر سے نکلتی دروازہ لاک کرتی اور وضو کر کے نماز پڑھتی۔ اسے سورۃِ یسین اور سورۃ مزمل دادو نے زبانی یاد کرائی تھیں۔ وہ سورۃ یسین کے ساتھ سورۃ مبین پڑھتی اور دادو کو بخش دیتی۔ اس کی زندگی میں دادو کی تربیت کا بہت عمل دخل تھا۔ اس کا آئی کیو لیول بہترین تھا جو بے حد اسٹرونگ تھا۔ اسے ایک بار سنا ازبر ہو جاتا۔ وہ نماز پڑھ کر پھر سو جاتی۔ ملک عمار علی مسجد میں فجر کی نماز کے بعد بھی گاؤں کے لوگوں سے علیک سلیک کرتے، سب کی خیر خیریت جانتے اور پھر منشی صفدر شاہ کے ساتھ کھیتوں کی طرف نکل جاتے تھے۔ یوں اُن کی چہل قدمی بھی ہو جاتی اور کھیتوں میں کھڑی فصلوں کا جائزہ بھی لے لیا جاتا۔ وہیں پر اُن کا پرانا خدمت گار رتن چاچا جو ایک ہندو تھا۔ خالص دودھ اور موٹی بالائی کی تیز میٹھے والی لسی بنالاتا۔ جب ملک عمار علی رتن چاچا کے ڈیرے تک پہنچتے تو وہ لسی تیار کیے ان کا منتظر ہوتا۔ لسی کی اس اجرت میں ملک عمار علی نے ساہیوال کی ایک زیادہ دودھ دینے والی بھوری بھینس اُسے دے رکھی تھی۔ رتن چاچا کے باپ کو ملک مراد علی نے پاکستان بننے کے وقت یہیں پر روک لیا تھا اور اُس کے خاندان کی حفاظت کا ذمہ خود اٹھایا تھا۔ جن دنوں (لوٹیاں پڑ گئی تھیں) ہندو پاک کی تقسیم ہوئی تھی رامیش مستری کی بیوی بچوں کو مراد محل کے اندرونِ خانہ بھیج دیا گیا تھا اور رامیش مستری کو مردان خانے کے تہہ خانے میں چھپا

دیا تھا، جس کے خفیہ دروازے تھے کوئی وہاں تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ ملک شاہ جہاں اور مراد علی نے اپنے گاؤں میں بسنے والے کئی ہندو سکھوں کے خاندانوں سے کہا تھا اگر آپ لوگ پاکستان میں رہنا چاہتے ہیں تو میں آپ سب کی حفاظت کا ذمہ اٹھاتا ہوں۔ یہاں چار خاندان ہی تو آباد تھے۔ تین خاندانوں نے ہندوستان جانے کو ترجیح دی۔ لیکن رامیش مستری نے یہیں رہنا پسند کیا۔ یہی وجہ تھی کہ ملک صاحبان رامیش مستری کی بہت عزت کرتے تھے جس نے اپنے پرکھوں کا دیس نہیں چھوڑا تھا۔ جانے رامیش مستری سے پہلے اس کی کتنی پیڑھیاں یہاں گزر گئی تھیں۔ ملک شاہ جہاں نے دس ایکڑ زمین رامیش مستری کے نام کردی تھی۔ اُس زمین پر اُسے دو کمروں کا پکا گھر بھی بنا دیا تھا۔ وہ میاں بیوی دن رات زمینوں پر کام کرتے، رامیش ایماندار اور محنتی آدمی تھا۔ اُس کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ ماسی نندنی اور اُس کی بیٹیوں کا مراد حویلی میں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ رامیش مستری کے دونوں بیٹے ملک مراد علی کے ہم عمر تھے۔ رامیش مستری کی وفات کے بعد اُس کے بیٹوں نے ملک شاہ جہاں کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا اور جی جان سے محنت کرتے رہے۔ مالک اُن سے خوش تھے۔ سنیل کا بیٹا رتن تھا۔ یہی پیڑھیاں آتی رہیں اور وہ ہمیشہ مالکوں کی وفادار رہیں کیونکہ بچپن سے اُن کے آباؤ اجداد یہی سبق پڑھاتے آئے تھے۔ رتن چاچا اب پورے گاؤں کے چاچا تھے۔ ایک خاص مقام تھا رامیش مستری کی فیملی کا اس گاؤں میں۔ اس خاندان کے کئی لڑکے پاکستان آرمی نیوی پولیس کے محکموں میں تعینات تھے۔ لیکن وہ لوگ ملک شاہ جہاں کی عنایتوں کو کبھی نہ بھولے۔ آج بھی ان سب کو جہان آباد کی مٹی سے پیار تھا۔ ان کے لیے شمشان گھاٹ اور مندر بھی تھا۔ انہیں کھلی اجازت تھی اپنی رسومات بلا جھجک ادا کرنے کی۔ وہ لوگ یہاں پر خوش تھے۔ ملک عمار علی کو چاچا رتن لسی پلاتے وہ پانچ دس منٹ اُن کے پاس بیٹھتے۔ تھوڑی دیر بعد وہ منشی صفدر شاہ کے ساتھ آگے بڑھ جاتے۔ جب تک وہ حویلی واپس آتے کافی دن چڑھ چکا ہوتا۔ سنہری دھوپ مراد محل کے در و بام کو اپنے لمس کی سفیدی میں جکڑ چکی ہوتی۔ وہ برآمدے میں بیٹھی ماں جی کے پاس آ جاتے۔ جھک کر اُن کے گھٹنے چھوتے اور قریب پڑا پیڑھا کھینچ کر اُن کے نزدیک بیٹھ جاتے۔ وہ دیر تک ماں جی سے باتیں کرتے۔ اُنہی کے ساتھ ناشتا کرتے۔ ملک عمار علی اکثر ماہین سے کہتے صبح کی نماز پڑھنے سے طبیعت پر بہت اچھا اثر پڑتا ہے۔ برکت ہوتی ہے۔ تم نماز پڑھ کر پھر سو جایا کرو۔" وہ مسکرا کر "اچھا" کہہ دیتی۔

آج بھی حسبِ معمول وہ دوپہر ایک بجے اُٹھی تھی۔ وہ رات دیر تک جاگنے کی عادی تھی یہاں بھی اُس کی روٹین یہی تھی۔ رات نو بجے سب کے ساتھ ڈنر کرتی۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر مہر النساء اپنی خواب گاہ میں چلی جاتیں۔ صبح وہ جلدی اُٹھتی تھیں۔ دوپہر کو سوتی نہیں تھیں ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد وہ کچھ دیر آرام کرتیں اور لان اور کچے صحن سے ملحقہ برآمدے میں آ کر بیٹھ جاتیں پھر گاؤں کی عورتیں اُن کے پاس آنا شروع ہو جاتیں۔ عورتیں اپنے مختلف مسائل اُن کے پاس لاتیں جن کو بڑی ملکانی مہر النساء حل کرنے کی کوشش کرتیں، مالی مدد کر دیتیں۔ اناج کپڑے کی ضرورت ہوتی تو وہ بھی مہیا کر دیتیں کبھی کوئی سائل ان کے ہاں سے خالی ہاتھ نہیں جاتا تھا۔

ملک قاسم رات کے کھانے کے بعد مردان خانے میں چلے جاتے۔ وہ حقہ پیتے ہوئے مزارعوں کے مسائل سنتے یا دوسرے دن کے اپنے پروگرام منشی صفدر شاہ کو بتاتے، دو گھنٹے بیٹھ کر وہ اپنی خواب گاہ میں آ کر سو جاتے۔

ملک عمار علی مردان خانے میں اپنی خصوصی آرام گاہ میں دیر تک بیٹھتے تھے۔ جب رات گئے اپنی خواب گاہ میں آتے تو ماہین غائب ہوتی۔ ایسی تین جگہیں تھیں جہاں وہ دستیاب ہو سکتی تھی۔ یا تو دیوانِ خاص میں ٹی وی

دیکھتی رہتی یا لائبریری میں مطالعہ کرتی پائی جاتی۔ اگر وہاں بھی نظر نہ آتی تو میوزک روم میں ضرور مل جاتی۔

''ماہی بہت دیر ہوگئی ہے اب آ کر سو جاؤ۔'' ملک عمار علی اُس کے قریب آتے ہوئے گلابی ڈوروں بھری آنکھیں اس کے مخملی گداز بدن پر گاڑھ دیتے اُس وقت ماہین کو شدید کوفت ہوتی، ایک تو اُن کی آمد اسے ڈسٹرب کرتی دوسرا ملک عمار علی کا تنقیدی نگاہوں سے معنی خیزی بھرے دیکھنا۔ ماہین کو گولی کی طرح لگتا۔

''یہ کوئی تک ہے اس طرح گھورنے کی۔'' وہ منہ میں بڑبڑاتی۔

''ماہی مجھ سے کچھ کہا۔'' استفساریہ پوچھتے۔

''نہیں تو۔''

''میں سمجھا شاید مجھ سے کچھ کہا ہے تم نے۔'' انداز جاسوسی لیے ہوتا۔

''آیئے بیٹھیں مل کر میوزک سنتے ہیں۔''

''مجھے نیند آ رہی ہے تم بھی اب اٹھو۔''

''مجھے نیند نہیں آ رہی اس لیے میں ابھی میوزک سنوں گی۔'' وہ لاپروائی سے کندھے اچکاتی۔

''پلیز ماہی آ جاؤ مجھے تمہارے بنا نیند نہیں آتی۔'' وہ ملتجی لہجے میں کہتے ہوئے اُسے بازو سے پکڑے اپنی خواب گاہ میں لے آتے۔ ملک عمار علی ہی نے تو اُس سے بات کرنے میں پہل کی تھی۔

''ماہی رات کو پیکنگ کر لینا صبح ہم لاہور جا رہے ہیں۔'' ملک عمار علی اُس کے قریب بیڈ پر آ کر ٹک گئے۔ اس نے خفگی بھری نظروں سے ملک عمار علی کی طرف دیکھا اور یوں ہی آلتی پالتی مارے بیٹھی ناخن فائل کرتی رہی۔

''ابھی تک ناراض ہو؟'' ملک عمار علی اُس کے مزید قریب کھسکے۔ اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ اس وقت وہ سوچ رہی تھی کہ ہم دونوں کبھی ایک دوسرے کے مزاج شناس نہیں بن سکتے۔ ملک عمار علی تم اپنی سوچ نہیں بدل سکتے۔ ہمیشہ عورت پر برتری پانا چاہتے ہیں۔ اُسے محکوم و غلام بنا کر رکھنا شاید تم جیسے وڈیروں جاگیردار لوگوں کی خصلت میں شامل ہوتا ہے۔ جسے نام عزت و ناموس کا دیتے ہو، اپنے غیرت مند ہونے کے گن گاتے ہو، خودداری گردانتے ہو۔ اور میری خصلت کیا ہے؟ میں کسی کی محکومیت کے زیر اثر نہیں رہ سکتی۔ میرے اندر بھی اسی خاندان کا خون ہے۔ پھر میں بلاوجہ کیوں کسی کی تڑی میں آؤں۔ میری اپنی زندگی ہے جسے میں اپنی مرضی اپنی خوشی اپنے طریقے سے گزارنا چاہتی ہوں۔ ایک پروف تو آپ کو مل ہی گیا ہوگا کہ میں آپ کا وارث نہیں پیدا کرنا چاہتی آپ مجھ پر جبر تو کر ہی نہیں سکتے ناں۔ بے شک آپ مجھے بانجھ ہی ڈکلیئر کرا دیں۔

ماہین کب سے سوچوں میں گم ناخن درست کرتی جا رہی تھی۔ ایک اُداس مسکان اُس کے گلابی ہونٹوں پر لرزی اور اونچی پونی ٹیل سے نکلے بالوں کی لٹ کان کے پیچھے سمیٹ دی ملک عمار علی نے اب تکیوں پر کہنیاں ٹکا کر ٹیک لگا لی تھی۔

'عمار علی تم کیا جانو میں خود نہ جان پائی اور میری جاگتی آنکھوں کے خواب کسی اور کے تصرف میں چلے گئے۔ بخدا اس میں میرا کوئی دوش نہیں میں تو کچھ پتا ہی نہ لگا پائی۔' اس وقت بے رنگ اُداسی سمٹ آئی تھی۔ ماہین کی آنکھوں کے کٹوروں میں جنہیں ملک عمار علی بغور دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے پلک جھپکنے کی دیر میں اس کا تراشا ہوا ہاتھ جھپٹ کر اپنے مضبوط ہاتھ میں جکڑ لیا۔ ماہین نے سوالیہ نگاہوں سے ملک عمار علی کو گھورا۔

''اچھا بھئی، آئی ایم سوری۔ میری ہی غلطی تھی اب غصہ ختم کرو۔ دو دن سے تم مجھ سے بات نہیں کر رہیں۔ شاید تمہیں اندازہ نہ ہو یہ دن میرے کیسے گزرے ہیں۔'' انہوں نے اُس کا دودھ جیسا گلابی ہاتھ ہونٹوں سے لگالیا۔

''ٹھیک ہے آپ کریں گے تو وہی جو آپ کی نظر میں صحیح ہوگا کیونکہ آپ کی سوچ کبھی بھی آپ کی نگاہ میں غلط نہیں ہوسکتی۔ اگر کسی کی ایگو ہرٹ ہوتی ہے تو ہوتی رہے۔ اس سے آپ کو کیا سروکار۔'' وہ بولتی چلی گئی۔ انہیں ایسا لگ رہا تھا اس وسیع وعریض کائنات کی روانی ایک نقطے پر تھم گئی ہو۔ کبھی تو وہ ماہین کی بڑی سے بڑی بدتمیزی بھی نظرانداز کر جاتے تھے اور کبھی معمولی بات کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیتے۔ اُن کے اندر کا نرم مزاج مرد اچانک غصہ ور بن جاتا۔ ''اچھا تم اپنی پیکنگ کرلو، صبح ہم لاہور جارہے ہیں تمہارا ایڈمیشن کرانا ہے ناں۔'' وہ آنکھوں میں پھیلی مسکراہٹ کے ساتھ اُسے دیکھ رہے تھے۔

''ساتھ میں صاباں مائی اور اُس کی بہو شہزادی کو بھی لے جانا۔ شہزادی کا خاوند سراج الدین تمہیں یونیورسٹی لے جایا کرے گا۔'' وہ بدستور بول رہے تھے اور وہ پوری آنکھیں پھیلائے، منہ کھولے بے یقینی سے اُنہیں دیکھ رہی تھی۔

''اُن تینوں کو ایک سرونٹ کوارٹر دے دیں گے۔ پہلے تو تمہارے ساتھ امل ہوتی تھی، اب تم اکیلی رہو گی۔ بس یہی سوچ کر تو تمہیں مزید پڑھنے سے منع کیا تھا۔ اب اگر تمہاری یہی مرضی ہے تو ٹھیک ہے تم ماسٹرز کرلو۔ مصطفیٰ علی بھی وہیں پر ہے۔ تمہارا خیال رکھے گا۔ میں بھی ہفتے میں دو دن تمہارے پاس آکر رہا کروں گا۔ مجھے ہر وقت تمہاری فکر لگی رہے گی۔''

اندیشوں بھری سوچوں سے ملک عمار علی ضرور پریشان تھے۔ اُن کے جوان بھائی کے ساتھ اُن کی خوبصورت و جوان بیوی کا تنہا رہنا......

اس وقت بات کرتے ہوئے ملک عمار علی کا چہرہ سپاٹ ہورہا تھا، چہرے پر بے ثباتی چھائی ہوئی تھی۔ اُن کی آواز میں کسی قسم کی نرمی یا کھنک موجود نہیں تھی۔ اُن کے اندر فطری شکی مزاج مرد کروٹیں بھر رہا تھا۔ وہ اچانک خاموش ہوگئے تھے۔

''تھینک یُو عمار۔'' ماہین نے اپنا سر اُن کے کندھے پر رکھ دیا۔ کچھ بھی ہو وہ ماہین کے شوہر تھے۔ اس کا خیال رکھتے تھے۔ اس سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ یہ حکم خداوندی تھا جس مالک نے ان دونوں کا ساتھ لکھ دیا تھا۔ ماہین کو خدا کی رضا پر راضی رہنا چاہیے تھا لیکن یہ اس کے بس میں نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی اُسے کبھی بھی ملک عمار علی سے محبت نہیں ہوسکتی۔ اگر وہ چاہتی بھی تو ایسا ممکن نہیں تھا کیونکہ ایسا کرنا اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ پھر وہ ایسی کوشش ہی کیونکر کرتی۔

وہ کبھی بھی ملک عمار علی کی بے پایاں محبت کے سمندر میں نہیں ڈوب سکتی تھی۔ اپنا آپ تو ملک عمار علی کی سپردگی میں دے سکتی تھی۔ لیکن اپنا دل اُس سے کوسوں دور رکھے ہوئے تھی۔ جو صرف کاشان احمد کی جاگیر بن چکا تھا۔ بنا بتائے بغیر اس سے اجازت لیے اور محبتیں تو اسی طرح ہوتی ہیں، بنا ارادہ کیے پھر ملک عمار علی اس پر زبردستی اپنی محبت کیوں مسلط کر رہے تھے اور چاہتے تھے کہ وہ بھی اسی طرح اُن سے محبت کرے۔

ملک عمار علی اسے اپنی شہ رگ سے قریب تر سمجھتے تھے۔ اب ماہین انہیں اُن کی طرح نہیں سوچتی تھی تو اسی

میں ماہین کا کیا دوش تھا۔ وہ چاہتے کہ ماہین اُنہیں اپنے دل کی آنکھ سے دیکھے، دل کی آنکھیں تو کسی اور کی ملکیت بن چکی تھیں۔ پھر وہ کیسے اپنی ان نیلگوں آنکھوں میں ملک عمار علی کے نام کے ستارے بھرتی۔ یہ حسین آنکھیں تو خود کو کاشان احمد کا مقروض بنا چکی تھیں۔

☆......☆......☆

کاشان احمد جو ایک آزاد طبع کا شخص تھا آئے دن لڑکیوں سے فلرٹ کرنا اُس کے معمولاتِ زندگی میں شامل تھا۔ شراب و شباب دونوں کا ہی وہ دلدادہ تھا۔ بقول کاشان احمد کے جانے کیوں اب یہ تمام فضولیات خود بخود چھوٹ گئی ہیں۔

سب جانتے ہوئے بھی ماہین کے دل کی دھڑکنیں بس اُسی کا راگ الاپتی تھیں۔ وہاں کاشان احمد کا بھی ایسا ہی حال تھا۔ ماہین کے فراق میں اُس نے جوگ لے لیا تھا وہ خود پر ہنستا یار تُو تو پاگل ہو گیا ہے۔ ایک ڈفری لڑکی کی خاطر تمام خوش الہامیاں گنوا دیں۔ اب کوئی خواہش اُس کے سرہانے کھڑی نہیں اونگھتی تھی۔ نہ ہی امنگیں اس کے وجود میں بے قراریوں میں سر پٹختی تھیں۔ اُس کے اندر کی ہر دھڑکن ماہین کو یاد کرتی تھی۔ اس کی طبیعت کا خاصا وہ تمام بے باکیاں، سارے بیکار شوق گم ہو چکے تھے۔ وہ وہاں صرف اپنے کام، اپنی جاب پر توجہ دے رہا تھا۔

فرقتوں کے لمحات میں کھلی آنکھوں سے وہ ساکن بیٹھا ماہین کے خیالوں سے باتیں کرتا۔ ماہین کا دھیان کاشان احمد کو پردیس میں بور نہ ہونے دیتا۔

جب سے کاشان احمد نے ماہین کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھا تھا۔ تب سے وہ نہایت پُرسکون تھا۔ گزشتہ موسموں میں وہ اکثر سوچا کرتا تھا میں ماہی سے اپنی فیلنگ کہہ دوں گا بعد میں دیر نہ ہو جائے۔

وہی ہوا جس کا اُسے خدشہ تھا۔ کاشان احمد کو پتا ہی نہ چلا اور ماہین ملک عمار علی کی بنا دی گئی تھی۔

☆......☆......☆

ماہین کا پنجاب یونیورسٹی میں ایڈمیشن ہو چکا تھا۔ اب اُسے انگلش لٹریچر میں ماسٹرز کرنا تھا۔ سسرال میں آ کر اُسے مشکل پیش آئی جہاں پنجابی بولی جاتی تھی۔ گھر کے افراد کے ساتھ تو وہ اُردو بولتی لیکن ملازمین اور مزارعوں کے ساتھ اُسے پنجابی بولنی ہوتی تھی۔ گلنار نے اُسے کافی حد تک پنجابی سکھا دی تھی۔ گلنار اس کا بہت زیادہ خیال رکھتی تھی۔

لاہور آ کر وہ خوش رہنے لگی تھی۔ بیبو اور دری سے بھی اُس کی فون پر بات ہوئی تھی۔ ریان کو اس کے لاہور آنے کی خبر دری نے دی تھی، اُس کا بھی فون آیا تھا۔ ماہین کے کم بیک پر اس کے سبھی دوست خوش تھے۔

ملک عمار علی چار دن رہ کر تین دن بعد دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے جا چکے تھے۔

صبح سراج الدین اُسے یونیورسٹی لے جاتا۔ تین چار گھنٹے وہ وہیں رُکتا۔ کلاسز ختم ہونے پر اُسے ساتھ لے کر آتا۔ اب ماہین کے اندر چھائی بے رونقی اچھے موسموں میں بدلنے لگی تھی۔ وہ مطمئن دکھائی دینے لگی تھی۔ یہاں پر کوئی ٹینشن نہیں تھی۔ ملک عمار علی کی بے مہار محبت کی شدتیں نہیں تھیں، جن سے وہ ہر لمحہ بیزار رہتی تھی۔ وہ اب اپنے ساتھ وقت گزار رہی تھی۔ اُسے اپنے ساتھ رہنا اچھا لگتا تھا۔ یہاں وہ تنہا تھی لیکن اسے بوریت کا احساس نہ ہوتا۔ وہ اپنے ساتھ رہنے پر مسرور تھی۔

خانساماں سقلین شاہ سے وہ نئی نئی ڈشیں سیکھتی۔ گلنار اور شہزادی کے ساتھ کبھی تو وہ گھر کی سیٹنگ چینج کرتی، کبھی اُن کے ساتھ جھاڑ پونچھ کرا رہی ہوتی۔ اُسے یہ سب اچھا لگتا، اُس کے لیے یہ کام تجربے سے کم نہیں تھے۔ صاباں مائی تو سارا دن اپنے کوارٹر میں رہتی یا مزارعوں کی عورتوں سے گپ شپ لگاتی رہتی۔ وہ سب بھی تو جہان آباد کی تھیں اسی لیے تو صاباں مائی کا یہاں دل خوب لگ گیا تھا۔ آرام ہی آرام تھا، کھانا بھی اچھا ملتا تھا۔ ماہین صاباں مائی سے کہتی۔

''صاباں مائی پھوپی ماں کو نہ بتانا کہ میں یہاں آپ سب کے ساتھ گھر کے کام کرواتی ہوں۔ اُنہیں اچھا نہیں لگے گا کہ نوکروں کی فوج ہوتے ہوئے تم خود کیوں کام کرتی ہو۔ میں جب اسلام آباد میں تھی وہاں بھی کچھ نہ کچھ کرتی رہتی تھی۔''

آج ماہین نے قیمہ مٹر بنائے تھے کسی کی مدد کے بغیر، بہت اچھے بنے تھے۔ تھوڑا نمک زیادہ ہو گیا تھا۔

جب ملک عمار علی آتے تو اسے خوب گھماتے، ڈنر باہر کراتے، شاپنگ بھی کراتے۔ اب وہ خوش رہنے لگی تھی۔ ملک مصطفیٰ علی کے آگے پیچھے گھومنا اس نے چھوڑ دیا تھا۔ جب سے ماہین کے دل میں کاشان احمد کی محبت کی کونپلیں پھوٹی تھیں، اب کوئی اور اس کی نظر میں سماتا ہی نہیں تھا۔ وہ فارغ اوقات میں قرآن پاک تفسیر سے پڑھتی۔ اب بھی وہ اپنے کمرے کو اندر سے لاک کر کے، اندھیرا کیے نہایت عاجزی سے بارگاہِ الٰہی میں حاضر ہوتی۔ دیر تک وہ جاء نماز پر آنکھیں بند کیے بیٹھی رہتی۔ اُس کی روح کو گونا گو سکون مل جاتا۔ جب اپنے کمرے سے باہر نکلتی تو دوپٹا گلے میں رسی کی طرح لپٹا ہوتا، اونچی سی پونی ٹیل اس کے کندھے پر جھول رہی ہوتی۔ وہ اپنے فرینڈز کو گھر پرانوائٹ کرنا چاہ رہی تھی۔ لیکن اس ہفتہ پھر ملک عمار علی یہاں پر تھے۔ جب وہ یہاں ہوتے ماہین کو اپنی نظروں کے سامنے سے ملنے نہ دیتے۔ سوموار کو ملک عمار علی نے واپس جہان آباد جانا تھا۔ ماہین نے سوچا وہ منگل کو ضرور افرا آنٹی اور احمد انکل سے ملنے جائے گی۔

☆......☆......☆

زمین پر تیزی سے جھکتی اس شام میں وہ صاباں مائی کو بتا کر سراج الدین کے ساتھ انکل احمد کے گھر ماڈل ٹاؤن آ گئی۔ راستے سے اُس نے چاکلیٹ کیک لے لیا تھا۔

آنٹی افرا اور احمد انکل اچانک ماہین کو دیکھ کر بہت خوش ہو گئے۔ اس وقت وہ دونوں لان ہی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اچانک ماہین کو اپنے سامنے دیکھ کر انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔ اُن کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی تھی۔ افرا آنٹی کتنی دیر تک ماہین کا چہرہ ہاتھوں میں لیے اُسے دیکھتی رہیں۔

''ماہین میں تمہارا انتظار کرتی تھی تم آئی ہی نہیں۔''

''اب تو آ گئی ہوں ناں۔'' شدتِ جذبات سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

''اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔ آرام سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔''

''بیٹا ہم تمہیں بہت یاد کرتے تھے۔'' انکل احمد نے محبت پاش نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''میں بھی آپ کو یاد کرتی تھی۔ میرے دماغ میں یہ بات رہتی تھی کہ مجھے آپ سے ملنا ہے۔ میں نے کاشان سے وعدہ کیا تھا کہ میں آنٹی انکل کے پاس آتی رہوں گی۔ پہلے امل آپی کی شادی کی مصروفیات رہیں پھر جہان آباد قیام بڑھ گیا تھا۔ دو ہفتے پہلے یہاں آئی ہوں۔ اب میں انگلش ماسٹرز کرنے کے لیے ایڈمیشن لے

لیا ہے۔اب مجھے یہیں رہنا ہے۔وقتاً فوقتاً آپ سے ملنے آتی رہوں گی۔''

''کاشان تمہارا پوچھتا رہتا ہے۔''

''آنٹی میں بھی اُسے مس کرتی ہوں۔میرے پاس اُس کا نیا نمبر نہیں ہے ورنہ میں اُسے فون کرتی۔''

''بیٹا اُس نے جان بوجھ کر تمہیں فون نہیں کیا۔اس رابطے پر تمہاری ازدواجی زندگی ڈسٹرب نہ ہو، وہ تمہیں ہمیشہ خوش دیکھنا چاہتا ہے۔ماہین تم بھی اُس کے لیے دعا کیا کرو کہ وہ خوش رہے۔پردیس میں ہے، اکیلا ہے۔میرا بچہ بہت دکھی ہو گیا ہے۔جب وہ فون پر بات کرتا ہے تو اُس کی آواز میں بہت افسردگی ہوتی ہے۔وہ اُداس ہے بتاتا ہے جانے اُسے وہاں اور کتنا عرصہ لگے۔فورس کر رہا ہے ہم اُس کے پاس آجائیں۔''

''یہ تو اچھی بات ہے آپ اور انکل اُس کے پاس چلے جائیں۔'' ماہین کولڈ ڈرنک کے سپ بھرتے ہوئے بولی۔

''بیٹا تمہارے انکل کی یہاں جاب ہے۔فی الحال ایسا ممکن نہیں۔''

''پھر کاشان آجائے آپ سے ملنے۔''

''کہہ رہا تھا کہ دو ماہ تک آنے کی کوشش کروں گا۔ماہین اُس کے لیے دُعا کیا کرو وہ جہاں رہے، خوش رہے، خیریت سے رہے۔''

''آمین۔'' ماہین نے دل میں کہا۔

''انکل آپ آنٹی کو لے کر آئیں ناں میرے گھر۔بہت خوبصورت جگہ ہے وہ۔آپ کا دل خوش ہو گا۔''

''کئی دفعہ لال حویلی کے سامنے سے گزرے ہیں۔بہت خوبصورت صدر دروازہ ہے۔مغلیہ دور کا بہترین نمونہ پیش کرتا ہے۔''

''جی ہاں آپ درست کہہ رہے ہیں انکل۔میری ممی کے دادا شاہ جہاں نے یہ حویلی بنوائی تھی۔انہیں بہت شوق تھا عمارتیں بنوانے کا۔انہوں نے پاکستان کے کئی مقامات پر ایسی عالی شان حویلیاں بنوائیں ہیں۔سبھی کا نقشہ ایک دوسرے سے بالکل الگ ہے۔

لال حویلی کو آپ اندر سے دیکھیں تو پورا ویلج ہے۔پھر میرے نانا ملک مراد علی نے اپنے والد کے شوق کو قائم رکھا جتنی بھی انہوں نے حویلیاں بنوائیں وہ آج بھی اپنی اصلی شکل برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ماموں جان اکثر وہاں کا چکر لگاتے رہتے ہیں۔عمار بھی سال میں ایک مرتبہ ضرور جاتے ہیں۔وادی سون سکیسر میں پہاڑوں کی چوٹی پر شاہ جہاں حویلی ہے۔وہاں گرمیوں میں جانے کا مزہ ہی اور ہے۔اُس کا نقشہ ایسے بنایا گیا ہے کہ بارہ دری کے ہر دروازے سے تیز ہوا کا گزر ہوتا ہے۔

''ماموں جان کے کئی دوست اپنی فیملیوں کے ساتھ وہاں جا کر گرمیاں گزارتے ہیں۔عمار کہہ رہے تھے ان گرمیوں میں وہاں کسی کو نہیں ٹھہرائیں گے۔بلکہ اس بار ہم خود جا کر وہاں چند روز رہیں گے۔'' انکل اور آنٹی اس کی باتوں سے خوش ہو رہے تھے۔اس کے آجانے سے اُن دونوں بوڑھے میاں بیوی کے چہروں پر خوشی آگئی تھی۔جو اپنی اکلوتی اولاد کو دوسرے ملک بھیج کر تنہائی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔

''ماہین تم نے بہت اچھا کیا جو ماسٹرز کر رہی ہو۔''

''آنٹی میں تو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتی تھی لیکن حالات ایسے بن گئے کہ ممی پاپا کو جلد میری شادی کرنا

پڑی۔''

''بیٹا اگر تمہاری شادی اتنی جلدی نہ ہوئی ہوتی تو میں تمہیں اپنی بہو بناتی۔ بہت پہلے ایک مرتبہ، رات کو کاشان میرے پاس بستر میں بیٹھا ڈرائی فروٹ کھاتے ہوئے بولا تھا۔

''ماما ماہی آپ کو کیسی لگتی ہے؟''

''کون ماہی۔''میں نے ٹی وی اسکرین پر نگاہیں جمائے بے دھیانی سے پوچھا تھا۔

''فوزیہ آنٹی کی بیٹی۔''

''بہت اچھی بچی ہے۔''میں نے اُسے کہا تھا۔

''وہ آپ کو اچھی لگتی ہے؟''

''ہاں بہت پیاری لڑکی ہے۔''

''ٹھیک ہے اگر وہ آپ کو اچھی لگتی ہے تو آپ اُس سے میری شادی کر دیں۔''تب ماہین احمد صاحب نے زور سے قہقہہ لگایا تھا۔ تو شان نے اپنے پاپا کی طرف دیکھا۔ تب تمہارے انکل نے مجھے مذاق میں کہا۔

''بھئی افرا تم کل ہی اُن کے گھر میرے چودہ سالہ بیٹے کا رشتہ لے کر جاؤ۔''

ماہین آنٹی کی بات سُن کر ہنس پڑی۔ ماحول کی گھٹن اچانک ختم ہو چکی تھی۔

اس وقت وہ دونوں ماہین کے آ جانے سے خوب ہنس رہے تھے۔ ڈنر بھی اس نے انکل آنٹی کے ساتھ کیا تھا۔ اس کا وہاں سے اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن وہ گئی ہی واپس آنے کے لیے تھی۔ گاڑی روانی سے سیاہ پتھریلی سڑک کی چھاتی روندتی آگے بڑھ رہی تھی۔ سڑک پر بے شمار گاڑیوں کا اژدھام ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ گاڑی نہر کے ساتھ ساتھ درختوں کو پیچھے چھوڑتی بھاگ رہی تھی۔ نہر کا شفاف پانی روشنیوں کے پیرہن اوڑھے روپ نکھار رہا تھا۔ اس وقت وہ سیٹ سے سر ٹیکے آنکھیں موندے ہوئے تھی۔

ملک عمار علی کی منکوحہ بن جانے کے بعد خدا نے اس کے دل میں کاشان احمد کی محبت کیوں بھر دی تھی جبکہ وہ ایک شادی شدہ عورت تھی۔ وہ خود نہ سمجھ پا رہی تھی کہ اُس کی منزل کہاں ہے؟ ملک عمار علی کو اس کا ذہن کبھی قبول نہیں کر سکتا تھا۔ جب ذہن قبول نہیں کرتا اور اُس پر کچھ مسلط کیا جائے تو کس قدر دشواری پیش آتی ہے۔ پل پل مرنے جینے کا عمل جاری و ساری رہتا ہے۔ وہ کسی کو دوش نہیں دے سکتی تھی۔ ایسا ہونا تو ماہین کے نصیب میں لکھا ہوا تھا۔ ہونی کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔

ممی پاپا امل کی شادی پر نہ آ سکے تھے۔ آیان اور ارسل کے پیپرز ہو رہے تھے۔ ماہین نے جب سنا کہ ممی ڈیڈی نہیں آ رہے تو وہ بہت ڈسٹرب ہوئی تھی۔ وہ ایک ایک دن گن گن کر گزار رہی تھی۔ ممی فون پر دیر تک ماہین سے بات کرتی رہیں۔

''جانو ہم پیپرز بنوا رہے ہیں، انشاء اللہ کوشش کریں گے جلد پاکستان آئیں۔''ماہین کو ان سب سے ملے کافی عرصہ ہو چکا تھا۔ درمیان میں ایک بار پاپا آئے تھے، اپنے بڑے بھائی کے انتقال پر۔ ایک ہفتہ وہ یہاں پر رہے تھے۔ ممی نے ماہین کے لیے خوب ساری شاپنگ کر کے بھیجی تھی۔ اُسے ان چیزوں کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ بھائیوں سے ملنا چاہتی تھی۔ اُن سے ڈھیروں باتیں کرنی تھیں اسے۔ دو سال سے اس نے انہیں نہیں دیکھا تھا۔ اب تو وہ شیطان بڑے ہو گئے ہوں گے۔ ہفتہ میں ایک دفعہ ممی کا فون ضرور آتا تھا۔ ہر مرتبہ وہ یہی کہتیں بیٹا ہم

جلدی آنے کی کوشش کریں گے۔ اگر تمہارے آنگن میں کوئی پھول کھل جاتا تو تمہارا دل بہل جاتا۔ کسی اچھی گائنا کالوجسٹ ڈاکٹر سے چیک اپ کراؤ۔''

''ممی پلیز۔'' وہ ہونٹ سکیڑ لیتی۔

''بیٹا اولاد بہت ضروری ہے۔ اولاد سے رشتے مضبوط ہوتے ہیں۔''

''مجھے رشتے مضبوط نہیں کرنے۔'' اس نے دل میں سوچا۔ ممی کی ایسی باتیں اسے بہت بری لگتی تھیں۔ وہ اندر ہی اندر بلک اٹھتی۔ سر کو خفیف سی جنبش دیتی، اس کے اندر بھنور بنتے غائب ہوتے رہتے۔ وہ اپنے اندر سسکتے خالی پن کی گٹھری اٹھائے نڈھال ہونے لگتی۔

☆......☆......☆

اس بار ملک عمار علی آئے تو اُن کے ساتھ ماں جی بھی تھیں کیونکہ وہ ماہین کے لیے بہت اُداس تھیں۔ ماہین پھوپی ماں کو دیکھ کر خوش ہوگئی تھی۔ وہ تو کب سے تنہائی کے دشت میں بھٹک رہی تھی۔ اُسے خود کے ساتھ رہنے کی عادت ہوچکی تھی۔ پھوپی ماں کے آجانے سے مرادِ دل کھل اٹھا تھا۔ ہر طرف چہل پہل تھی۔

لال حویلی کے مزارعوں کی عورتیں سارا دن دکھائی دینے لگی تھیں۔ ماں جی نے شاہ جی سے کہہ دیا تھا کہ کھیتوں سے تازہ سبزیاں منگوا کر ایک ڈش وہ بھی بنایا کریں پھوپی ماں نے پوری حویلی کی صفائی شروع کرادی تھی۔ ماہین یونیورسٹی سے آکر ہیلپ کراتی۔ پھوپی ماں منع کرتیں۔

''پُتر نوکر ہیں نا۔ تم رہنے دو۔''

مہر النساء کے آجانے سے واقعی ماہین خوش دکھائی دینے لگی تھی۔ زندگی کی رمق نظر آنے لگی تھی۔ زیست کا تھال خوشگوار ساعتوں سے بھرنے لگا تھا۔

☆......☆......☆

ملک عمار علی کے چند عدالتی کام تھے، اب وہ فیکٹری میں بھی دلچسپی لینے لگے تھے۔ ملک مصطفیٰ علی کے ساتھ اکثر فیکٹری کا چکر لگا لیتے۔ رات کا کھانا سب ساتھ کھاتے۔ اس روز کھانے کے ٹیبل پر ملک عمار علی کہہ رہے تھے کہ کیوں نا گھر کی سیٹنگ چینج کرائی جائے۔''

''ہاں لالہ میں بھی سوچ رہا تھا۔'' ملک مصطفیٰ علی بولے۔

''پھر سوچتے ہیں اس بارے میں۔'' ملک عمار علی نے بھائی کی طرف دیکھا۔

''لالہ، اسلام آباد کا ایک معروف انٹیریئر ڈیزائنر میرا فرینڈ ہے۔ ایک مرتبہ جب رضوان چوہدری یہاں آیا تھا تو میں نے اُس سے ذکر بھی کیا تھا۔ اُس نے کہا تھا جب چاہو گے میں حاضر ہو جاؤں گا۔ اُس کا چکر لاہور میں تو لگتا ہی رہتا ہے۔ ایونٹ وغیرہ کی بکنگ آج کل کافی ہو رہی ہے۔''

''ٹھیک ہے مصطفیٰ تم اُس سے بات کرلینا۔''

''ماہی پُتر تم کیوں خاموش ہو۔'' اپنی پلیٹ پر خاموشی سے جھکی ماہین کو دیکھ کر پھوپی ماں بولیں۔ ماہین پلیٹ میں تھوڑے سے چاول ڈالے گن گن کر کھا رہی تھی۔

''میں آپ سب کی باتیں سُن رہی ہوں۔'' ماہین نے چہرے پر مسکراہٹ بھرنے کی کوشش کی۔

''پھوپی ماں! امل آپی جہان آباد آئی تھیں تو لاہور کا چکر بھی لگا لیتیں۔ عرصہ ہو گیا ہے اُن سے ملے۔''

''پتر محمد علی امل کے ساتھ تھا۔ صرف دو دن کی چھٹی تھی اُس کی، اس لیے امل کو جلدی واپس جانا پڑا۔ وہ بھی تمہارے لیے اُداس تھی۔ کہہ رہی تھی آپ لوگ کھاریاں کا چکر لگائیں۔ وہ وہاں پر اکیلی ہے۔ محمد علی تو دفتر چلا جاتا ہے۔ بور ہوتی رہتی ہے۔''

''آرمی کلب کیوں نہیں جوائن کر لیتیں۔ شام کو تمام بیگمات وہاں پر اکٹھی ہوتی ہیں۔ گپ شپ کرتی ہیں، تفریح کے مختلف پروگرام بناتی ہیں۔ اس طرح ان کی بوریت ختم ہو جائے گی۔ پھوپی ماں آپ بھی آئی ہوئی ہیں۔ سب مل کر امل آپی کے ہاں چلتے ہیں دو چار دنوں کے لیے۔'' ملک عمار علی نے کھانے سے ہاتھ روک کر گہری نگاہوں سے اُسے دیکھا۔

''تمہاری پڑھائی متاثر نہیں ہوگی؟''

''عمار دو دن کی بات ہے، میں ایڈجسٹ کر لوں گی۔ کیوں مصطفیٰ بھائی چلیں۔'' اس نے ملک مصطفیٰ علی کی طرف دیکھا۔ اُن کا خیال دماغ سے نکالا تو بھائی بھی کہنا شروع کر دیا۔ وہ اب بھی رغبت سے کھانا کھاتے ملک مصطفیٰ علی کی طرف متوجہ تھی۔

''ایک مرتبہ اسلام آباد جاتے ہوئے میں امل سے ملنے گیا تھا۔ تم لوگ چلے جاؤ۔ میں فیکٹری میں بہت بزی ہوں۔ فی الحال نہیں جا سکوں گا۔''

''آپ کی بہن ہے مصطفیٰ بھائی۔''

''اچھا جی! مجھے نہیں پتا تھا۔'' ملک مصطفیٰ علی نے ماہین کی بات مذاق میں اُڑائی تو ماہین انہیں دیکھتی اپنے ملیح رخسار پر انگشت شہادت لگائے مسکرائی۔

ملک مصطفیٰ علی نے صد شکر کیا تھا جو ماہین نے اُن کی جان کو امان دے دی تھی۔ ماہین کی الٹی سیدھی حرکتوں سے وہ شدید کوفت کا شکار ہو گئے تھے۔ مصطفیٰ علی کا اکثر دل چاہتا کہ اس احمق لڑکی کے منہ پر تھپڑ جڑ دیں۔ آخر وہ اُن کی بھابی تھی، بھائی کی عزت تھی۔ شاید عقل ٹھکانے آ گئی ہے جبھی یہ اب مجھ سے کنی کترانے لگی ہے۔

پھوپی ماں کا دل مچل رہا تھا امل سے ملنے کے لیے، تب ماہین سوچ رہی تھی میں بھی تو کسی کی بیٹی ہوں۔ دو سال ہو چکے ہیں مجھے اپنے والدین سے ملے ہوئے۔ یہ چند دنوں میں اُداس ہو جاتی ہیں۔ پھوپی ماں نے میرا درد کبھی محسوس نہیں کیا۔ عمار کو کہہ سکتی تھیں کہ مجھے میرے والدین سے ملا لائے۔ شاید انہیں کبھی ایسا خیال ہی نہیں آیا۔ نوالہ بار بار اس کے حلق میں پھنس رہا تھا۔

☆......☆......☆

ماہین نے امل کے لیے بہت ساری شاپنگ کی تھی پہلی بار اُس کے گھر جا رہی تھی۔ پھوپی ماں بھی کھانے پینے کا کافی سامان لے کر جا رہی تھیں۔

وہ شام اک دلربا عالم میں آرمی کالونی کے گھنے درختوں پر جھکتی چلی آ رہی تھی۔ پرندے غول در غول اپنے اپنے گھروندوں کی جانب لوٹ رہے تھے۔ شام گہری ہو چکی تھی، جب وہ لوگ میجر محمد علی کے بنگلے پر پہنچے تھے۔

امل ان سب کو دیکھ کر بہت خوش ہو گئی تھی۔ کافی دیر تک وہ ماہین کے گلے لگی رہی۔ اس کے روشن چہرے کو ہاتھوں میں لیے اُس کی خنداں پیشانی کے بوسے لیتی رہی۔ ملک عمار علی نے امل کو اپنے آنے کی اطلاع کر دی تھی۔ وہ خود کچن میں گھسی مختلف ڈشیں بناتی رہی، ملک محمد علی بھی ان کے آنے سے بہت خوش تھے۔

گول کمرے میں بیٹھے دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ امل خاصی مطمئن دکھائی دے رہی تھی۔ اُس کے چہرے کی خوبصورتی و چمک بڑھی ہوئی تھی۔ جو اس سے پہلے ماہین نے محسوس نہ کی تھی۔ امل کی خوبصورت آنکھوں میں والہانہ جوت جاگ اٹھی تھی۔ اس کے گال بھر کر گلال ہو چکے تھے۔ کافوری عطر بیز پہر اس کی آنکھوں میں ٹھہر چکے تھے۔

'امل آپی پہلے تو ایسی ہشاش بشاش نہیں ہوتی تھیں۔' ماہین نے سوچا۔ یقیناً محمد علی بھائی نے ان کا دل جیت لیا ہے۔ اگر لگن سچی ہو تو منزل پا لی جاتی ہے۔ زندگی کھل کر سانس لیتی ہے تو اور حسین ہو جاتی ہے۔

'لگن تو ملک عمار علی کی بھی سچی ہے ماہین بی بی۔' اندر سے کسی نے اسے زچ کیا۔

'ملک عمار علی نے مجھے فخر و انبساط و تحکمانہ گھمنڈ سے جیتنا چاہا۔ مجھے اپنی محبت کے عقوبت خانے میں اسیر کرنا چاہا تب میں، میں نہ رہی اس بات کا مجھے ہمیشہ قلق رہے گا۔ اپنی سرکش محبت کے سمندر میں مجھے بہانا چاہتے تھے۔ یہ سوچے بنا کہ میں بھی ایسا چاہتی ہوں یا نہیں۔ میری خوشی، میرے جذبات و احساسات کو اپنی خود غرضی و طمع کے عوض پس پشت ڈال دیا اور انجان بن گئے۔ میرے دل کی صدائیں ابھرتی رہیں۔' ماہین کی بے لگام سوچیں کہاں سے کہاں پہنچ رہی تھیں۔ کھانے کے بعد سب ہی گول کمرے میں بیٹھے قہوے کے دوران خوش گپیوں میں مصروف ہو گئے تھے۔

''میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتی ہوں۔'' ماہین امل سے کہہ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ سفر کے دوران اس کی عصر اور مغرب کی نمازیں قضا ہو چکی تھیں۔ کمرے میں آ کر اس نے دروازہ لاک کیا اور واش روم وضو کرنے چلی گئی۔

جائے نماز بچھاتے ہوئے اُس نے پہلے عصر مغرب کی قضا نماز ادا کی، پھر عشاء کی نماز پڑھنے لگی۔

آدھے گھنٹے بعد وہ نماز سے فارغ ہو کر گول کمرے میں آ گئی۔ پھوپی ماں اور امل ایک ہی صوفے پر بیٹھی باتوں میں مصروف تھیں۔

ماہین اُن دونوں کے مقابل کاؤچ پر آ کر بیٹھ گئی۔

''تم لوگ باتیں کرو میں عشاء کی نماز پڑھ لوں۔'' مہر النساء اندر چلی گئیں۔

''ماہی تم نے چائے نہیں پی، پیو گی۔''

''ہاں اسٹرانگ سی۔'' امل نے سیماں کو آواز دی۔

''جی مالکن!''

''ماہین کے لیے اچھی سی چائے بنا کر لاؤ۔''

''جی بہتر۔'' وہ اُلٹے پیروں واپس ہو گئی۔ اس وقت ملک عمار علی اور محمد علی سیاست پر لمبی چوڑی بحث میں اُلجھے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد سیماں ٹیبل ٹرالی ماہین کے سامنے رکھ رہی تھی۔

''چائے بناؤں جی۔''

''میں بنا لوں گی۔''

اس وقت ماہین ٹیبل کور کو بغور دیکھ رہی تھی جو کلف شدہ چیک دار تھا، جس پر گلابی رنگ کے پھول کڑھے ہوئے تھے۔

'واہ امل آپی، تو بڑی سگھڑ ہوگئی ہیں۔' ماہین نے دل میں امل کی تعریف کی۔

''ماہی تمہاری اسٹڈی کیسی جارہی ہے؟''

''ابھی تو نئی نئی کلاسیں اسٹارٹ ہوئی ہیں۔'' وہ چائے میں چمچ چلاتے ہوئے سامنے لگی پینٹنگ دیکھنے لگی۔ پہاڑوں کی اور گم ہوتا سورج کا دہکتا گولا اور بہتے جھرنے پر پڑتا اُس کا عکس اور دور ایک جھونپڑی۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے پینٹنگ میں کھوگئی۔

''ماہی تمہیں ایک اچھی بات بتانی ہے۔'' امل کچھ جھجک کر سرگوشی میں بولی۔

''کہیں۔'' اس نے پینٹنگ سے توجہ ہٹا کر امل کی طرف دیکھا۔

''خوشخبری ہے!'' امل نے اس سے نظریں کترائیں۔

''کون سی خوشخبری؟'' ماہین اُس کی بات سمجھ نہ پائی۔

ماہی تم بھی بہت بھولی ہو۔''

''امل آپی اس بھولی بندی کو کچھ بتائیں گی تو پتا چلے گا ناں۔''

''ماں جی نانی بننے والی ہیں۔''

''سچ۔''

''ہوں۔'' امل شرما کر خود میں سمٹنے لگی تھی۔

''واہ بھئی آپ نے تو کمال کردیا۔ بہت مبارک ہو۔'' ماہین امل کے گلے لگ گئی۔ امل نے اُس کا ماتھا چوم لیا۔

''ماہی خدا تمہیں بھی جلد اولادِ نرینہ سے نوازے۔ دیکھو ماہی میری شادی کو صرف چار ماہ ہوئے ہیں اور خدا نے مجھے خوشی بخش دی۔ تمہاری شادی کو تو چار سال ہونے کو ہیں۔ کسی اور ڈاکٹر کو دکھالو۔''

''اچھا۔'' ماہین بیزاری سے بولی اور چائے کی طرف متوجہ ہوگی۔

''یہاں سی ایم ایچ میں بہت اچھی ڈاکٹر ہے۔ میجر ڈاکٹر سلمیٰ علوی! کل میں تمہیں اُن کے پاس لے کر چلوں گی۔ بہت تجربہ کار ڈاکٹر ہے۔''

''امل آپی آپ کیوں فکر کرتی ہیں جب اللہ کا حکم ہوگا ہوجائے گا۔ آپ بس خوش رہا کریں تاکہ بے بی صحت منداور پیارا پیارا ہو بالکل آپ جیسا۔'' ماہین نے جان بوجھ کر موضوع بدل دیا۔

''اچھا آپ نے نام سوچا ہے کچھ۔''

''پہلے خیریت سے اُسے آنے تو دو، نام بھی سوچ لیں گے۔''

''پھوپی ماں کو بتایا ہے آپ نے؟''

''ہاں بہت خوش ہورہی تھیں اور تمہارے لیے دعا کررہی تھیں کہ خدا جلد تمہاری بھی گود بھر دے۔'' محمد علی ان دونوں کی طرف متوجہ ہوئے۔

''بھئی امل اس ملک کے کبھی نہ سدھرنے والے حالات پر ہم نے بہت بحث کرلی۔ ذرا مزے دار سی چائے تو پلوادو۔''

''بہت بہتر جناب۔'' وہ دونوں مسکرائیں۔ امل نے سیماں کو چائے لانے کا کہا۔

''بھئی تم دونوں باتیں کرتے ہوئے خاموش کیوں ہوگئی ہو۔ ہم کوئی جاسوس تو نہیں ہیں۔'' محمد علی مسکرائے۔

''آپ آرمی والوں سے ڈر لگتا ہے۔ کیا خبر کسی بھی وقت کیا کردیں۔ یہی سوچ کر ہم نے خاموشی سادھ لی ہے کہ کہیں مخبری نہ ہوجائے۔'' ماہین بھی کہاں پیچھے رہنے والی تھی۔

''بہت خوب بہنا۔'' محمد علی نے فلک شگاف قہقہہ لگایا۔

''ماہین اب تم بھی محتاط رہنا۔ تمہارے یہ جو ظل الٰہی ہیں ناں یہ بظاہر جو نظر آتے ہیں اصل میں یہ وہ نہیں ہیں۔'' محمد علی نے ملک عمار علی کی طرف اشارہ کرکے کہا۔

''بھائی آپ کو یہ کیسے پتا چلا۔'' ماہین نے اُن کی بات مذاق میں اُڑائی۔

''بھئی تم نے اپنے مجازی خدا کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ بہت خطرناک ہیں یہ آنکھیں۔''

میجر محمد علی ملک عمار علی کو تنگ کرنے کے موڈ میں تھے۔

''مجھے تو بہت پسند ہیں ان کی آنکھیں۔''

''بہنا تمہیں کیا کئی اوروں کو بھی بہت پسند ہیں ان کی آنکھیں۔'' محمد علی نے شوخی سے ملک عمار علی کو دیکھا جو محمد علی کی باتوں سے خجل ہوتے ہوئے اک دبی دبی مسکان ہونٹوں پر بکھیرے ہوئے تھے۔

''ماہین تم اپنے شوہر نامدار کا خیال رکھا کرو۔ یہ بالکل جلیبی کی طرح سیدھا ہے۔''

امل اور ماہین مسکرائیں۔ ''امل آپی محمد بھائی آپ کو بور تو نہیں ہونے دیتے ہوں گے کیا آپ لوگ کہیں آؤٹنگ کے لیے بھی نکلتے ہیں؟''

''سات بجے وہ آفس سے آتے ہیں ایک عدد چائے کے کپ کے ساتھ نیوز پیپر کو پیارے ہوجاتے ہیں۔''

''محمد بھائی کیا امل آپی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' ماہین نے پوچھا۔

''بھئی فوجی بندہ ہوں، ملکی حالات سے باخبر رہنا چاہیے۔''

''ہاں یہ بھی درست ہے۔'' ملک عمار علی خاموشی سے اُن کی باتیں سُن رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ ماہی نے اُن سے کبھی اتنی توجہ اور دلچسپی سے بات نہیں کی۔ نہ ہی اس کے چہرے پر بات کرتے ہوئے شوخ وچنچل رنگوں کی رنگولی ہوتی ہے۔

دوسرے روز امل نے چیک اپ کے لیے سی ایم ایچ جانا تھا وہ ماہین کو بھی زبردستی اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ میجر سلمٰی علوی نے اچھی طرح ماہین کا چیک اپ کیا تھا۔ اب وہ اسے بتارہی تھیں کہ آپ بالکل ٹھیک ہیں۔ کسی قسم کی کوئی پرابلم نہیں ہے۔ خوش رہا کریں اور اپنی خوراک کا خاص خیال رکھیں۔ انشاء اللہ سب بہتر ہوگا۔

''جب وہ گھر آئیں تو امل نے ماں جی کو بتایا ماہین بالکل ٹھیک ہے۔ خدا کی طرف سے ہی دیر ہے۔ ماں جی بس آپ فکرمند ہونا چھوڑ دیں، اچانک ہی آپ کو خوشخبری ملے گی۔ ہر بات کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔''

''پُتر میں چاہتی ہوں اپنی زندگی میں عمار علی کا بیٹا دیکھوں۔''

''انشاء اللہ ماں جی! اللہ پاک آپ کی یہ خواہش جلدی پوری کرے گا۔ آپ پریشان نہ ہوا کریں۔''
ماں جی امل کی بات سن کر خاموش رہی تھیں۔
''ماہی سب چلیں سوئمنگ پول کے ساتھ ہی ہے ایک دو مرتبہ پہلے بھی میں جا چکی ہوں۔ تمام خواتین اکٹھی ہوتی ہیں۔ گپ شپ رہتی ہے۔ ہمارے سامنے والے بنگلے میں میجر ذیشان اختر رہتے ہیں۔ اُن کی بیگم کے ساتھ آنا جانا ہے۔ ایک دن وہی مجھے کلب لے گئی تھیں۔ تمام آرمی آفیسرز کی بیگمات سے مل کر بہت اچھا لگا۔''
''ٹھیک ہے میں چلتی ہوں آپ کے ساتھ۔'' ماہین نے مختصراً جواب دیا اور فریش ہونے اندر چلی گئی۔
ملک عمار علی اس وقت بیڈ پر نیم دراز لیٹے کسی کتاب کے مطالعہ میں مصروف تھے۔ ماہین اُن کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔
''کیا بات ہے ماہی؟'' کتاب بند کرتے ہوئے ملک عمار علی نے ماہین کی طرف دیکھا۔
''کچھ نہیں۔'' اُس نے سیدھے ہاتھ سے اپنا کندھا دباتے ہوئے جواب دیا۔
''طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری۔ تھکی تھکی لگ رہی ہو؟''
''ہاں عمار میں ٹھیک ہوں۔ تھوڑا کندھوں میں درد ہے۔''
''کوئی میڈیسن لے لو۔''
''اِس کی ضرورت نہیں ہے، خود ہی آرام آ جائے گا۔''
''ماہی خدا کرے اب جلدی ہم دونوں کے درمیان ایک تیسرا آ جائے۔''
'عمار جب اللہ کا حکم ہوگا تیسرا بھی آ جائے گا۔ آپ کیوں فکر کرتے ہیں۔'' ماہین کو جانے کیوں آج آج عمار پر ترس آنے لگا تھا اور خود پر شدید غصہ، میں کیوں اس سیدھے سادھے شخص کے ساتھ ایسا کر رہی ہوں۔ کیا قصور ہے اس کا؟ یہی کہ اس ن اپنی پھوپی کی خواہش پر خود سے بہت چھوٹی، اُس کی بیٹی سے شادی کی ہے۔ مجھے تو ان کا احسان مند ہونا چاہیے تھا۔ میری ماں کو پریشانی سے انہوں نے نکالا۔ انہوں نے ہمیشہ میرا خیال رکھا۔ میری بدتمیزیاں نظرانداز کیں۔ میں بار بار ان کی ذات کی نفی کرتی رہی۔ انہوں نے درگزر کیا۔ میں نے جو خواہش کی انہوں نے فوراً سے پہلے پوری کی، اگر کبھی مجھ پر غصہ بھی ہوئے تو معافی میں پہل کی۔ حالانکہ کئی جگہ میری غلطی زیادہ تھی۔ اب بھی مجھ سے ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں۔ ان کے رویے میں کبھی بدلاؤ نہیں آیا۔'
ماہین کے اندر چھپا بیٹھا کوئی کب سے سرزنش کر رہا تھا۔ اُسے غلط گردان رہا تھا۔
''میں اس بزرگ شخصیت سے محبت نہیں کر سکتی۔'' اندر سے کسی نے اس کا دفاع کیا۔ اس کی کی غلطیوں کو درست قرار دے رہا تھا۔
''ماہین تم ملک عمار علی کو قسمت کا لکھا سمجھ کر کیوں قبول نہیں کر لیتیں۔ پھر تم نے مجبوراً چار سال اس کے ساتھ کیوں بیتائے، اندر سے کوئی اُسے زچ کر رہا تھا۔ اپنے ساتھ ساتھ اس بھلے مانس بندے کی زندگی بھی اجیرن بنا رہی ہو۔ جو تم سے محبت کرتا ہے۔ وہ ایک شریف و صالح انسان ہے۔ اس کے قدم آج تک کسی گناہ کی جانب نہیں اٹھے۔ پھر بھی تم اس سے بے اعتنائی برت رہی ہو۔ اگر تمہاری شادی، تمہاری

مرضی کے مطابق ہوئی ہوتی تو کیا ضروری ہے کہ تم خوش رہتیں؟'' اندر سے کوئی اُسے جھنجوڑ کر پوچھ رہا تھا۔

''میں نہیں جانتی۔'' اس نے گھبرا کر سامنے بیٹھے ملک عمار علی کی طرف دیکھا۔

''فرض کرو عمار علی کی بجائے مصطفیٰ علی سے اگر تمہاری شادی ہوئی ہوتی۔ اگر وہ شریف نہ ہوتا، شراب و شباب کا رسیا ہوتا تو تم برداشت کر لیتیں؟ کئی مرتبہ تم نے چھنو کو مصطفیٰ علی کی خواب گاہ سے دن دہاڑے نوٹ گنتے نکلتے دیکھا ہے۔ کیا ایسا شوہر تمہیں چاہیے تھا؟'' اندر طوفان مچاتی سوچیں اس کی آنکھیں گلابی ڈوروں سے بھر گئیں۔ اس وقت اس کی نیلی آنکھیں اَن دیکھی آگ میں جل رہی تھیں۔ لب کپکپائے اس نے ہاتھ کس کر بالوں میں پھنسائے ملک عمار علی دوبارہ سے کتاب پڑھنے میں محو ہو چکے تھے۔ شاید کوئی اسلامی کتاب پڑھ رہے تھے، جبھی اپنے قریب بیٹھی ماہین کا دھیان بھی ہٹ گیا تھا۔

''ماہی تم تیار ہو گئیں؟'' امل اندر آئی تو وہ یوں ہی بیڈ پر بیٹھی ہوئی تھی۔

''امل آپی یہ کپڑے صحیح تو ہیں۔''

''یار ہم کلب جا رہے ہیں کوئی اچھا سا جوڑا نکالو۔ اب فٹافٹ تیار ہو جاؤ، لالہ میں ماہی کو اپنے ساتھ کلب لے کر جا رہی ہوں جو ہمارے گھر کے سامنے ہی ہے۔''

''میں دس منٹ تک تیار ہو کر آتی ہوں۔'' ماہین اٹھتے ہوئے بولی۔

ماہین کا پہلا سمسٹر ختم ہو چکا تھا اس کے پیپرز بہت اچھے ہوئے تھے۔ اس دوران ایک مرتبہ دری اور بیو اس کے گھر آئی تھیں۔ پورا دن اُن تینوں نے ڈھیروں ساری باتیں کیں۔ انہیں مراد ولا بہت پسند آیا تھا۔ وہ بار بار تعریف کر رہی تھیں۔

''ماہی یار تم بہت خوش قسمت ہو جو اتنے امیر آدمی کی بیوی ہو۔''

''اے ہیلو! میں پیچھے سے کوئی کنگلوں کی بیٹی نہیں ہوں۔ میرے آباؤ اجداد ان ہی کی ٹکر کے ہیں۔ یہ میری ماں کا میکہ ہے سمجھیں تم دونوں۔'' وہ ہنس پڑی۔

''ہمیں پتا ہے۔'' بیو نے ماہین کو گھورا۔ ''بھئی سفید پوش تو ہم لوگ ہیں۔'' دری ماہین کے قریب کھسک آئی۔

''تم دونوں میرے بچپن کی فرینڈز ہو۔ میں تو بس اتنا جانتی ہوں۔ کس قدر خوبصورت تھے وہ دن، نہ کوئی فکر نہ پریشانی، بے فکری کا زمانہ۔''

وہ دیر تک گزر جانے والے دنوں کی باتیں کرتیں رہی تھیں۔ اس روز اُن تینوں نے بہت باتیں کی تھیں۔

☆......☆......☆

ماہین کے فرسٹ سمسٹر کے پیپرز ختم ہونے پر ریان نے ایک ریفریشمنٹ پارٹی کا اہتمام کر ڈالا تھا۔ اپنے گھر پر، ماہین ہی کے کہنے پر بدھ کے روز انہوں نے یہ پارٹی رکھی تھی۔ شہزادی اور گلنار کو اس نے بتا دیا تھا میں ایک فرینڈ کے ہاں جا رہی ہوں۔ شاید دیر ہو جائے۔''

''دوپہر کو ملک عمار علی کا فون آیا تو انہیں بھی ماہین نے بتا دیا تھا آج میں نے اپنی فرینڈ کے ہاں پارٹی میں جانا ہے۔''

''ماہی جلدی واپس آ جانا۔'' ملک عمار علی فکر مندی سے بولے۔

''ہاں جی جلدی آنے کی کوشش کروں گی۔''

وہ کافی پہلے پہنچ گئی تھی۔ تاکہ مہمانوں کے آنے سے پہلے کچھ گپ شپ لگا سکیں۔ تھوڑی دیر بعد بیو اور دری بھی آ گئی تھیں۔ ان چاروں کے درمیان خوب ہنسی مذاق چل رہا تھا۔ ریان نے مسکراتے ہوئے اُن تینوں کی طرف دیکھا تھا۔

''تم لوگوں کے لیے ایک سرپرائز ہے۔''

''وہ کیا؟'' تینوں بیک وقت بولیں۔

''انٹرنیٹ پر تم لوگوں کو کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔'' ریان نے اسپیکر آن کر دیے تھے۔ سامنے کمپیوٹر اسکرین پر Web Cam پر کاشان تھا۔ وہ تینوں خوشی سے چلائیں اور ہاتھ زور زور سے ہلانے لگیں۔ ریان نے مائیک ماہین کے ہاتھ میں پکڑا دیا تھا۔ آہستہ آہستہ بھی وہاں سے کھسک گئے تھے۔ اب ماہین تنہا تھی دونوں اسکرین میں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

''کیسی ہو ماہی؟'' کاشان احمد کی آواز سسکیوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔

''میں ٹھیک ہوں۔ تم کیسے ہو؟''

''اچھا ہوں۔'' اُس کا لہجہ لڑکھڑایا، تمہارے ہزبینڈ کیسے ہیں؟''

''اچھے ہیں۔''

''اور تم؟''

''میں بھی بہت اچھی ہوں۔'' لحہ لحہ ماہین کی آواز رندھ رہی تھی۔

''شان تم نے مجھے بھلا دیا ناں۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی وہ شکوہ کر بیٹھی۔

''ماہی تم سمجھتی ہو کہ میں ایسا کر سکتا ہوں؟''

''پھر مجھے ایسا کیوں لگا۔'' وہ مسکرا رہی تھی لیکن اُس کی مسکان میں فراق کی کسیلی چاشنی بھر رہی تھی۔

''ماہی تم ایسا کبھی سوچنا بھی نہیں میری صبح تم ہی سے شروع ہوتی ہے شام تمہاری یاد میں اختتام پذیر ہوتی ہے۔''

''شان میں ہمیشہ تمہارے فون کی منتظر رہی۔ تم نے تمام رابطے ہی ختم کر دیے۔''

''ماہی میں تمہیں ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس طرح تمہاری میرج لائف متاثر ہو سکتی تھی۔ تم پھر بکھر جاتیں۔ تم سے آخری ملاقات کا منظر میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ تمہارے چہرے پر لرزاں وہ بے بسی کا عالم، تمہاری بھیگی آنکھوں میں مچلتا وہ درد۔ آج بھی میری نیندیں اڑا لے جاتا ہے۔ تمہیں میں بھول نہیں پایا جبکہ ہزار جتن کر ڈالے۔ آج ریان نے مجھ پر تمہاری قسم ڈال دی تھی کہ میں تمہارے سامنے موجود رہ کر تم سے باتیں کروں۔ ورنہ میں ایسا ہرگز نہیں چاہ رہا تھا۔ تمہیں دیکھ کر بہت اچھا فیل ہو رہا ہے۔ تم تو اور پیاری ہو گئی ہو۔ ماہی تمہاری ان نیلی آنکھوں میں آج بھی دنیا آباد ہے۔

تم ہمیشہ یوں ہی خوبصورت رہو۔ مسکراہٹیں تمہارے امرت ہونٹوں کا احاطہ کیے رہیں۔ خدا تمہیں خوش رکھے ضبط کرتے کرتے کاشان کی آواز بھاری گڑگڑاہٹ میں تبدیل ہو رہی تھی، جس کا بوجھل پن اُس کے کانوں کو بند کر رہا تھا۔

''ماہی تم نے ایک بار بتایا تھا۔تمہارا شوہر تم سے بہت محبت کرتا ہے۔'' کاشان احمد دوبارہ خود میں بولنے کی ہمت پیدا کر چکا تھا۔

''یار تم اُس کی محبت کی قدر کرو۔ایسا نہ ہو کہ وقت پلک جھپکتے میں گزر جائے۔تب بندے کے پاس پچھتاووں کے سوا کچھ نہیں رہتا۔ ماہی کہیں دیر نہ ہو جائے۔ جب لمحے اڑان بھرتے بہت دور نکل جاتے ہیں، ہماری دسترس سے کوسوں دور، تو انسان تمام عمر سولی پر لٹکتا رہتا ہے۔چاہے جانے کے باوجود وہ بیتے لمحوں کو واپس نہیں لاسکتا۔تب ڈستی پشیمانیاں دامن نہیں چھوڑتیں، جس طرح میرے ساتھ ہوا۔تم سے اظہار کرنے میں بہت دیر ہوگئی۔اور تم میرے اختیار سے بہت دور چلی گئیں۔'' وہ بہت اُداس تھا۔اُس کی آنکھیں بار بار بھیگ رہی تھیں۔

''کاشان میں اُس شخص کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی کیونکہ میرا دل نہیں مانتا۔اب بھلا میں خود کو اذیت پہنچا کر مجبوراً اُس کے ساتھ کیسے رہوں۔چار سال سے میں اُس کے ساتھ ایک ہی چھت تلے ہوں۔یہ چار سال میرے لیے چار صدیوں سے کم نہیں ہیں۔ ہر رات جب میں اُس کے ساتھ ہوتی ہوں تب بار بار دہکتی دوزخ کے پل صراط سے گزرتی ہوں۔کاشان تمہیں کیا معلوم کسی ناپسندیدہ شخص کے ساتھ ایک چھت تلے رہنا کس قدر اذیت ناک عمل ہے۔یہ عمل پل پل کی موت عطا کرتا رہتا ہے۔'' اُس کی نیلی آنکھوں سے روانی میں بہتے سفید آنسو اُس کے چہرے کی ہڈیوں کو خاکسر کررہے تھے۔وہ آہستہ آہستہ کانپ رہی تھی۔

''سوری شان میں اپنے دکھڑے لے کر بیٹھ گئی۔تم سناؤ کب آرہے ہو۔''

''چھ ماہ بعد۔''

''میں منتظر رہوں گی۔مجھ سے رابطہ ضرور رکھنا۔''

''ماہی میں نہیں چاہتا تم ایک بار پھر بکھر جاؤ، اس لیے تم سے کوئی سلسلہ قائم نہیں رکھنا چاہتا۔میں چاہتا ہوں تم میرے بنا خوش رہنے کی عادت ڈالو خود کو۔تمہاری خوشی میری خوشی ہے۔میں نے پہلے بھی تم سے کہا تھا۔ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے نہیں بنائے گئے ہیں۔'' اس کی آواز میں کانٹے اُگنے لگے تھے۔

''ماہی یقیناً اس میں خدا کی مصلحت پوشیدہ ہوگی۔اچھی لڑکی اگر تم کاشان احمد کو خوش دیکھنا چاہتی ہو تو تمہیں بھی خوش رہنا ہوگا۔'' اس وقت کاشان کی گہری بھوری آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ان سفاک آنسوؤں کو وہ عمیق پاتالوں میں غائب کرلینا چاہ رہا تھا۔

''ماہی پلیز مجھ سے وعدہ کرو۔آئندہ سے تم اپنے شوہر سے محبت کرنے لگو گی۔آخر تم خود پر کیوں ظلم ڈھا رہی ہو۔اذیت ناک رتجگوں کے عذاب سہارنا بہت ہی مشکل ہے۔اور یہ سب تم خود کو اذیت پسندی میں ڈال کر زندہ رہنا چاہ رہی ہو۔ ماہی خود کو ایسے جبر کے حوالے کر کے زندہ رہنا ظلم ہے، خود تم پر۔ابھی تو تمہارا ہاتھ شوق سے تھامنے والا کوئی ہے۔ ماہی جو شخص عرصہ چار سال سے تمہاری رفاقتوں کا متمنی ہے۔ سچائی کے ساتھ سونپ دو اُسے اپنے تمام حقوق۔بار بار خوشیاں دروازے پر دستک نہیں دیتیں۔اگر روٹھ جائیں تو ہمیں ان کا تعاقب کرنا پڑتا ہے اور وہ ہم سے دور بھاگتی ہیں۔

(عشق کی راہداریوں میں، زندگی کی سچ بیانیوں کی چشم کشائی کرتے اِس خوبصورت ناول کی اگلی قسط،
انشاءاللہ آئندہ ماہ ملاحظہ کیجیے)

لائبہ کو کیا خبر کہ گاؤں کی دبائی گئی بیٹیوں کو ایسا وقت ملا ہی کب تھا کہ اُن کی رائے کو اہمیت دی جاتی اور وہ بھی اس بنیاد پر کہ گاؤں اچھا یا گاؤں دور ہے۔ اُس کی دادی کہتی تھیں کہ جب وہ بیاہ کر آئی تھیں تو دو کوس تک پانی لینے روزانہ پیدل جانا پڑتا تھا۔ کنویں پر کپڑے دھلتے......

ترقی یافتہ معاشرے کے منہ پر، ہر دلعزیز لکھاری کا طمانچہ، افسانے کی صورت

زینت دیکھنے میں بالکل بھی دیہاتی لڑکی نہیں لگتی تھی۔ اس کا حلیہ، بول چال اور خاص طور پر سوچ مختلف تھی۔ گاؤں کی دوسری لڑکیوں کی طرح اُس کے بال بھی لمبے تھے لیکن وہ اُن کی طرح چٹیا نہیں بناتی تھی۔ وہ انہیں رول کر کے سر کی چوٹی پر جوڑا بنالیتی تو چھوٹی چھوٹی لٹیں اُس کے گندمی شاداب چہرے کی بلائیں لیتی تھیں۔ وہ ہاتھ پاؤں ہمیشہ صاف رکھتی اور گاؤں والیوں کی طرح اُس کے کپڑے بھی میلے نہیں ہوتے تھے۔ وہ کپڑے دھونے کے لیے جمعے کا انتظار نہیں کرتی تھی۔ وہ ایکٹو اور بروقت کام کرنے والی تھی۔ بستی کے مرد و عورتیں اپنے پاس سے اٹھنے والے پسینے کی بساند اور میلے دانتوں سے بے نیاز ہنستے بولتے، ملتے ملاتے رہتے۔ انہیں کسی کے گریز کے تاثرات کی پروا نہیں ہوتی۔ لیکن زینت اس معاملے میں بہت حساس تھی۔

زینت نے تین سال قبل گاؤں کے اکلوتے اسکول سے مڈل پاس کیا تھا۔ جہاں اب اُس کی چھوٹی بہن عصمت پڑھتی تھی۔ اس لال اسکول کے ہائی بننے کی خوش کن افواہ ہر سال اُڑتی اور ہر سال زینت اس میں پھر داخلہ لینے کا خواب بُنتی۔ اس اسکول میں لائبہ احمد کے علاوہ تین اور استانیاں تھیں۔ ایک چوکیدار اور ایک قاصد عورت تھی۔ لائبہ احمد یہاں نئی آئی تھی، باقی والی استانیاں تو اس اسکول کا حصہ لگتی تھیں۔ لائبہ احمد ایم اے حال ہی میں کر کے نکلی تھی اور اس کے اندر یونیورسٹی کی طالب علمی کی تمام صفات ابھی تازہ تھیں یعنی تخیل پرستی، خود انحصاری اور اپنی علمی استعداد کی بے قدری کا قلق......

قاصد عورت نورین خالہ اسکول کی کینٹین چلاتی تھی۔ کبھی کبھار استانیوں کی فرمائش پر یا بادل بارش کے دن پکوڑے کا تھال لگالیتی تھی یا چنے آلو بنالیتی ورنہ اُس کے پاس دو نمبر بسکٹ ’کُرکُرے‘، لیز (Lays) چٹنی مصالحہ، مرغ نمکو، ٹافیاں، نقلی چیونگم وغیرہ ہوتیں۔ اُس کے گاہک اسکول کے بچوں کے علاوہ اُن کی گھر بیٹھی باجیاں بھی تھیں۔ زینت بھی ایک ایسی ہی باجی تھی۔

زینت کا ذکر استانیاں کرتی رہتی تھیں۔ عموماً اُس کے انقلابی خیالات زیر بحث رہتے۔ گاؤں کا نصیب بدلنے کی خواہش کے ساتھ ایک مثبت، پُر امید، پُرامن، مساوی اور شاندار معاشرے کی تلقین بعد میں کرنے اور عمل پہلے کرنے والی بے اختیار، بے بس لڑکی..... لائبہ احمد سُن سُن کر ملنے کی

شائق ہوچکی تھی۔ پھر ایک دن ملاقات بھی ہوگئی۔
چھٹی کے بعد استانیاں شیشم کے پیڑ کے نیچے ویگن کا انتظار کررہی تھیں۔ مس لائبہ احمد کے ساتھ مسز فاطمہ اور مس املتاس تھیں۔ شیشم کے پیڑ کے پیچھے سبز روغن والا دروازہ تھا۔ جس کے اندر سے شاپر میں بھرا کوڑا کرکٹ پھینکتی لڑکی نے جب انہیں دیکھا توپل بھر ٹھٹکی۔ اُس نے ہاف بازو کا لان کا سرخ وسیاہ سوٹ پہن رکھا تھا اور گردن پر اونچی پونی باندھے یہاں کے عام زنانہ حلیے سے خاصی مختلف نظر آتی تھی۔ لائبہ احمد نے سوچا شکر ہے کام کی بندی تو ملی۔ وہ مسکرا کر سلام کرکے بولی۔
''اندر آجائیں آپ۔ یہاں بہت گرمی ہے۔ میں کالو کو ٹھہرا دیتی ہوں، ویگن آئے گی تو بتادے گا۔''
استانیاں اکثر زینت کے گھر کو انتظار گاہ بناتی رہتی تھیں۔ وہ اندر داخل ہوئیں گھر کا بڑا سا صحن تھا۔ سبز دروازے سے داخل ہوکر دائیں طرف نیم کا درخت اور اُس کے ساتھ بیٹھک تھی۔ نیم کے نیچے خوب چھڑکاؤ کرکے دو چار پائیاں بچھی رہتیں۔ نیم کا سایہ کافی گھنا اور ہوادار تھا۔ زینت کی بہن عصمت بڑے صحن میں دوڑ کر سامنے کے لمبے برآمدوں میں گئی اور پانی کی ٹھنڈی بوتل اور گلاس لے کر آئی۔ زینت نے اُسے ڈانٹا۔
''شیشے والا گلاس لے آ......''
مس املتاس نے دوبارہ دُھوپ کا دریا پار کرنے سے روک دیا۔ ٹھنڈا پانی ہی بہت غنیمت تھا۔ جلد ہی ویگن کے آنے کا عندیہ لیے کالو آگیا۔ چمکتی مسکراتی آنکھوں والی زور سے ہاتھ ملاتی زینت لائبہ کے دل میں اُتر گئی۔
''اچھی لڑکی ہے۔ پڑھی لکھی ہے؟'' وہ باہر نکل کر تبصرہ کررہی تھیں۔
''بہت سمجھدار ہے۔ اس نے بہن بھائیوں کو بدلا، گھر بدلا، یہ جو گملے رکھے تھے۔ دیواروں پر سرسبز بیلیں چڑھی تھیں۔ ان کا گھر سارے گاؤں سے الگ لگتا ہے۔ یہ سب زینت کا کام ہے......'' مسز فاطمہ کی وہ پرانی شاگرد تھی۔ وہ اس گاؤں کو برسوں سے جانتی تھیں کہ یہاں اُن کا ننھیال تھا۔ جہاں لائبہ احمد کے دل میں زینت کے لیے اچھا احساس بیدار ہوا وہاں زینت کو بھی کیوٹ سی مس لائبہ بہت اچھی لگی۔
یہ فطرت کا توازنِ باہمی ہے کہ جس کو دیکھ کر آنکھیں مسکراتی ہیں اس کے مقابل کے بھی آنکھوں کے تارے چمکتے ہیں۔ نفرت ہو یا محبت عمل، ردعمل ایک سا ہوتا ہے۔

☆......☆......☆

اگلی صبح لائبہ احمد ویگن سے اُتر کر اسکول کے گاؤں کی کچی پکی، اونچی نیچی گلیوں میں سے گزرتی جب اسکول کے پھاٹک میں داخل ہوئی تو نورین خالہ بغل میں دکانداری دابے اپنے چھپر کینٹین کی طرف جاتی ملی۔
''السلام وعلیکم باجی!'' کہہ کر وہ پرانی میز پر لدے پھندے شاپر رکھ کر چھڑکاؤ کرنے لگی، پھر پھاٹک سے دوسری لڑکیوں کے غول میں عصمت داخل ہوئی۔ عصمت بستہ اپنی جماعت میں رکھ کر مس لائبہ کی تلاش میں دوڑی۔ تلاش تو خیر کیا کرنا تھا اسٹاف روم نامی پرانے کمرے میں جہاں تازہ چھڑکاؤ، حبس اور گھٹن کی بُو تھی۔ لائبہ اپنی چادر اُتار کر تہہ لگا رہی تھی۔ عصمت شرمائی جھجکی سی سلام کرکے سفید اور پیلے پھولوں کا خوبصورت گجرا مس لائبہ کی طرف بڑھا کے بولی۔
''زینت باجی نے دیا ہے۔''
مقامی استانی آپا تاجور عینک لگا کر موبائل پر میسج پڑھ رہی تھیں۔ عینک کے اوپر سے دیکھ کر مسکرائیں اور پھر مگن ہوگئیں۔ لائبہ نے زینت کو 'شکریہ' کہہ کر گجرے کلائیوں میں ڈال لیے۔
یہ تھا زینت اور لائبہ کی دوستی کا آغاز۔

اگلے کچھ دنوں چھٹی کے ٹائم ٹیچرز ابھی مین روڈ کے پاس پہنچی ہوتیں اور سبز دروازے میں داخل ہو کر ستانے کا سوچ رہی ہوتیں کہ وین آ جاتی اور وہ چڑھ جاتیں۔ البتہ عصمت کے ذریعے سلاموں کا رابطہ جاری رہتا۔

پھر ایک دن عصمت تازہ فالسے لیے اسٹاف روم میں آئی۔ تفریح کا وقفہ تھا۔ سفید چنگیری میں کالے پکے پکے فالسے اور اُن پر موتیا کے مہکتے پھول...... زینت کا ہر تحفہ ایسا ہی باسلیقہ ہوتا ہے۔ عصمت چنگیری رکھ کر بولی۔

''زینت باجی نے سب ٹیچرز کے لیے بھیجے ہیں۔ سب کو سلام دے رہی تھی۔'' پھر مس لائبہ کو مخاطب ہوئی۔ ''مس...... باجی کہہ رہی تھی آج آپ چھٹی کے ٹائم ضرور آئیں۔''

''آئیں گے۔'' لائبہ نے فالسے لیتے ہوئے یونہی وعدہ کر دیا۔

چھٹی کے وقت جب وہ سبز دروازے والے اسٹاپ تک پہنچی تو دُور تک کوئی ویگن نہ پا کر مسز فاطمہ نے کہا۔

''لو بھئی...... لگتا ہے آج زینت کی دُعا پوری ہوگئی۔''

وہ تینوں سبز دروازے سے اندر داخل ہوئیں تو دُور برآمدے میں کھڑی زینت نے دیکھ لیا اور دیوار پر لگی کھونٹی پر لٹکی چھوٹی چھتری کھول کر تقریباً بھاگتی ہوئی اُن کے پاس آئی اور انہیں بیٹھک میں لے گئی۔ کیونکہ آج بیٹھک خالی تھی۔ بیٹھک ایک کھلا بڑا کمرہ تھا جس میں چار رنگین چار پائیاں بچھی تھیں جن کے سرہانے کڑھائی کیے تکیہ پوش والے تکیے اور پائنتی پر سفید کھیس تھے۔ ایک پرانا صوفہ جس پر باریک محنت کردہ ایمبرائڈری والا ہلکا گلابی پوشش تھا تازہ پھولوں کے دو گلدان دیواری سجاوٹ خانوں میں رکھے تھے۔ چھت والا پنکھا چل رہا تھا۔ زینت انہیں بٹھا کے خوش ہوتے ہوئے بولی۔

''خدا کا شکر ہے کہ بجلی ہے۔ یہاں تو بجلی تین، گھنٹے جاتی ہے ایک گھنٹہ آتی ہے۔ شہر میں تو ایسا حال نہ ہوگا۔''

''شہر میں بھی جاتی ہے۔ ایک گھنٹہ جاتی ہے ایک گھنٹہ رہتی ہے۔ اسکول ہوادار ہے مگر باہر نکلو تو بُرا حال ہو جاتا ہے۔''

''چھٹیاں کب ہوں گی؟'' وہ سب مل جل کر بول رہی تھیں۔

''دیہاتوں کو تو کوئی حکومت نہیں پوچھتی۔ ہمیں تو کسی بہتری کے قابل ہی نہیں سمجھا جاتا۔ ہم تو صدیوں پرانی زندگی جی رہے ہیں۔ اچھا چھوڑیں...... اگر آپ کے پاس تھوڑا سا وقت ہو تو ابھی دوڑ کے پلاؤ اور رائتا لے آؤں؟''

''بیٹھو زینت...... کسی قسم کی خاطر داری، تکلف کا خیال نہ کرو۔ ہمیں تم سے باتیں کر کے اچھا لگتا ہے بیٹا۔ تم اس گاؤں کا ہیرا ہو۔'' مسز فاطمہ نے اتنے پیار سے کہا کہ زینت کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ وہ بیٹھتے ہوئے بولی۔

''مس...... آپ کی عنایت ہے۔''

''زینت...... گاؤں والے اپنے خواب اوپر تک کیوں نہیں پہنچاتے؟'' لائبہ کا سوال عام سطح سے بالا تھا مگر زینت کے قابل تھا۔

''لائبہ...... گاؤں والوں کا بھی جی چاہتا ہے اُن کی گلیاں پکی ہوں، بجلی کی صرف تاریں اور کھمبے نہ ہوں بلکہ بجلی ہو۔ بجلی کا سامان ڈبوں میں بند رکھنے کے لیے نہ خریدا جائے۔ ہم بھی بہت سے ٹی وی چینل دیکھیں، یہاں بھی پارک ہوں، صفائی ہو۔ ہمارے بھی اسکول اچھے اسٹینڈرڈ کے ہوں۔ ہمارے بیٹھنے کے لیے اسکولوں میں کرسیاں ہوں۔ ہمیں بھی اکیسویں صدی کا انسان سمجھا جائے۔ ہمیں سو سال پہلے کی زندگی گزارنے پر مجبور نہ رکھا جائے۔ یہ چھوٹے چھوٹے خواب ہر گاؤں میں ہوتے ہیں...... مگر انہیں یہ کہنا نہیں آتا، یا آتا ہے تو اثر نہیں ہوتا، آہ کو چاہیے اک عمر، اثر ہونے تک...... تو شاید

وہ عمر ابھی بھی نہیں گزری۔''

''اور تجھے یاد ہے جب میں نے یہ شعر پڑھایا تھا تو تُو نے پوچھا تھا عصر کی نماز ہونے تک ہے۔ سوال کرنے کی تری عادت تب بھی تھی۔ کوئی کتنا ہنسے تُو سوال ضرور کرتی تھی۔'' مسز فاطمہ کی اس بات پر سب ہی ہنسنے لگے۔ زینت کا پُر اعتماد لہجہ لائبہ حسن کے لیے حیران کن تھا۔ کون کہہ سکتا تھا یہ لڑکی مڈل پاس ہے۔

''انہیں بنیادوں پر تم لوگ ووٹ نہیں دیتے ناں۔ ہم خود وڈیروں کو نہ دیکھیں تو جتیں کیسے...... چٹے اَن پڑھ سیٹیں جیت جاتے ہیں۔'' مسز فاطمہ نے کھلی کھڑکی کے پار ویگن کے آنے والی سمت دیکھتے ہوئے کہا۔

''مس! یہ بھی بات درست ہے مگر ووٹ جس کو بھی دیں۔ سیٹیں جیت کر سب ایک جیسے ہو جاتے ہیں۔ عوام کے خوابوں کی کسی کو پروا نہیں ہوتی۔''

اس نیم خواندہ لڑکی نے کتنی پتے کی بات کی تھی۔ لائبہ نے بے ساختہ اُس کا شانہ تھپکا تو اُس نے ہاتھ بڑھایا۔ دونوں ہاتھ ملا کر ہنسنے لگیں۔

☆......☆......☆

شدید گرمی کی آمدورفت کے سبب مس لائبہ احمد کو بخار ہو گیا۔ اُسے تین دن چھٹی کرنا پڑی۔ اگر چہ احکامِ بالا کے تحت اساتذہ کا بیمار ہونا طے شدہ غلط بیانی قرار دے کر اتفاقیہ چھٹیاں ختم کر دی گئی تھیں مگر جب غیر فطری احکام ٹھونسے جاتے ہیں تو چور راستے ڈھونڈ لیے جاتے ہیں۔ آپا تاجور نے معاملہ سنبھال لیا۔''

اب اسٹریچر پر تو بیمار استانی کو لایا نہیں جا سکتا تھا۔''

چوتھے دن لائبہ احمد اسکول آئی۔ تو زینت بھی ملنے کے لیے چلی آئی۔ وہ خاص طور پر فالسے کا تازہ شربت بنا کر لائی تھی۔ وہ ایسی مہمان تھی کہ میزبانی خود کرتی تھی۔ لائبہ احمد سوئم جماعت کے بچوں کو لے کر بیٹھی تھی۔ طالبات کو مشقی کام دے رکھا تھا۔ کھیتوں کی طرف کھلنے والی کھڑکیوں سے تازہ ہوا آ رہی تھی۔

گندمی رنگت والی پُر امنگ زینت کے چہرے پر سنجیدگی کا عکس تھا۔ اپنا احوال سُنا کر لائبہ نے پوچھا۔

''تم کیوں اتنی چُپ چُپ ہو۔''

پتا چلا زینت کے ابا کے چچیرے بھائی، اپنے بیٹے کے لیے رشتہ لائے ہیں اور گھر میں یہی بات چل رہی ہے۔

''پڑھا لکھا ہے؟'' لائبہ کے منہ سے پہلا سوال یہی نکلا۔

''میری طرح......بس......زمیندارہ ہے۔ مال مویشی جیسے ہوتا ہے۔'' وہ پھیکا سا مسکرائی۔

''تم اُداس کیوں ہو؟''

''وہ بہت دُور کی بستی میں رہتے ہیں۔ کچے ریت راستے ہیں۔ ٹبوں میں دس پندرہ گھر آباد ہیں۔ یہ گاؤں تو کیپیٹل ہے اُس کے سامنے۔''

زینت نے لائبہ کو ہنسا دیا۔

''تمہیں نہیں پسند تو......امی سے بات کرلو۔ ابھی تو وقت ہے۔''

لائبہ کو کیا خبر کہ گاؤں کی دبائی گئی بیٹیوں کو ایسا وقت ملا ہی کب تھا کہ اُن کی رائے کو اہمیت دی جاتی اور وہ بھی اس بنیاد پر کہ گاؤں اچھا یا گاؤں دور ہے۔ اُس کی دادی کہتی تھیں کہ جب وہ بیاہ کر آئی تھیں تو دو کوس تک پانی لینے روزانہ پیدل جانا پڑتا تھا۔ کنویں پر کپڑے دھلتے اور عورتیں نہاتی دھوتی تھیں۔ برف بجلی کا تصور نہ تھا مگر صحتیں اچھی اور موسم معتدل تھے۔ زینت کو دادی کے دور سے آغاز کرنا تھا جبکہ صحتیں اچھی اور موسم معتدل بھی نہ تھے۔ اور ذہنی ارتقاء ایک مرض بن گیا تھا۔

زینت چلی گئی اور ایک گدلی سی اُداسی چھوڑ گئی۔

☆......☆......☆

اگلے دن لائبہ چھٹی سے آدھا گھنٹہ پہلے آپا

تاجور سے اجازت لے کر عصمت کو لیے زینت کے گھر چل دی۔

نیم کی چھاؤں تلے آج رونق لگی تھی۔ دونوں چارپائیاں بھری ہوئی تھیں۔ عصمت انہیں سلام کرتی مس لائبہ کو کمروں کی طرف لے کر بڑھی، بستہ برآمدے میں پھینکا۔

''زینت باجی'' کی آواز لگائی۔ عجیب بات تھی آج زینت نظر نہیں آ رہی تھی تو گھر عجیب سا لگ رہا تھا، جیسے کوئی اجنبی لوگ آ بسے ہوں۔ لائبہ نے سوالیہ نظروں سے عصمت پر نظر ڈالی۔ لگتا تھا وہ بچی بھی سمجھ رہی تھی جو کچھ لائبہ نے سمجھا تھا۔

'کیا ہاں کر دی گئی؟؟' لائبہ کا دل دھڑک اٹھا۔ وہ جب اُس کمرے میں داخل ہوئی جہاں زینت بیٹھی تھی تو دیکھا کہ...... زینت کو بھابی ٹانگیں پلنگ پر کر کے 'لحاظ سے' بیٹھنے کو کہہ رہی تھی۔ بھابی کے شوخ ریشمی کپڑے، لال لپ اسٹک اور کاجل سرمہ ساری کہانی سنا رہا تھا۔ بھابی لائبہ کو مل کر عصمت کو لیے شربت بنانے چلی گئی۔

اُن کے جاتے ہی لائبہ نے زینت کو جھنجھوڑ دیا۔

''زینت...... یہ سب کیا ہے؟ یہ مہمان؟ یہ کیا ہو رہا ہے؟''

''میرا نکاح......'' زینت نے ہنسنے کی کوشش کی مگر آنکھوں نے ساتھ نہ دیا۔

''کیا؟ تمہاری شادی ہو رہی ہے...... آج...... اس طرح چلی جاؤ گی۔'' لائبہ کے بے ترتیب جملے اُس کے اضطراب کے مظہر تھے۔ زینت ہتھیلی سے آنسو صاف کر کے مسکرائی (یا مسکرانے کی اداکاری کی)

''نہیں، نہیں...... آج تو نہیں جاؤں گی۔ شادی بعد میں ہوگی۔ یہ لوگ پکا کام کر کے واپس چلے جائیں گے۔ شادی اور اس گرمی میں؟ جبکہ بجلی بھی گھنٹوں نہ آئے۔ تمہیں تو پتا ہے میں کتنی نازک مزاج ہوں۔ میں دلہن بن کر پسینوں پسینے نہیں ہو سکتی۔ تمہیں تو پتا ہے، میں گرم ریت میں چلوں تو پاؤں پر چھالے پڑ جاتے ہیں۔ تمہیں تو پتا ہے میں اپنے کیپیٹل گاؤں کے بدلنے کے خواب دیکھتی رہتی تھی۔ مجھے دُور افتادہ کا مطلب بھی اب سمجھ آیا ہے۔ کنویں پر کپڑے دھونا، ٹوٹکوں سے علاج کرنا، یہ سب بُرا تو نہیں ہوتا، دادی بھی تو کرتی تھیں۔'' اُس کے دونوں رخساروں پر آنسو بہہ رہے تھے اور لائبہ اُس کو گلے سے لگائے روئے جاتی تھی۔ پھر لائبہ نے خود کو الگ کیا اور میز پر رکھے جگ سے پانی اُنڈیلا اور زینت کے منہ سے لگایا۔

زینت نے جلدی سے ایک گھونٹ لیا اور باقی سے چہرے پر چھینٹے مار کر دوپٹے سے صاف کرتے ہوئے بولی۔

''لائبہ تم بھی منہ دھو لو، بھابی آتی ہوگی۔ وہ تو چہرے پڑھ لیتی ہے۔''

اچھا ہی ہوا کہ شربت کی ٹرے عصمت کے ہاتھ بھجوا دی گئی۔

''نکاح تک ٹھہر جاؤ لائبہ۔'' زینت اُٹھ کے چادر کی سلوٹیں نکال رہی تھی۔ اُس کے منظم مزاج کو چین نہ تھا۔

''کس وقت ہوگا۔''

''وقت؟ وقت کا ہمارے ہاں کوئی تصور نہیں ہوتا۔ یہی کہا جاتا ہے آج نکاح ہے۔ اچھا تم نہ ہی رُکو، تمہارے گھر والے پریشان ہوں گے۔ لیکن لائبہ...... وعدہ کرو شادی میں آؤ گی۔ آؤ گی نا؟ ایک دن کو میری خاطر ضائع سمجھنا۔''

''ہاں سونی! کیوں نہیں آؤں گی بلکہ تجھے دلہن میں بناؤں گی۔ تمہیں پتا ہے میں نے بیوٹی پارلر کا کورس کیا ہوا ہے۔ کاسمیٹکس بھی میرے ہوں گے۔''

''بس پھر تو کام بن گیا۔ یہ کام تیرے ذمے،

غور سے دیکھ لے مجھے کون سی Base لگانی ہے۔ میری آنکھیں اتنی اچھی بنا دینا کہ اُن میں آنسو چھپ جائیں۔'' لائبہ نے اُس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا اور وہ چُپ ہوگئی۔

بھابی اور زینت کی ہونے والی شادی شدہ نند ڈبے میں سبز رنگ کا تلہ تاروں کے کام کا جھلملاتا جوڑا اور چوڑیاں لیے داخل ہوئیں۔ لائبہ نے ڈبہ پکڑا اُس کے چہرے پر تاسف کا عکس لہرایا مگر وہ سنبھل کر بولی۔

''بہت پیارا سوٹ ہے ماشاءاللہ۔''

اور موٹی سبز سرخ چوڑیاں...... اُن کو بناوٹ سے بھی پیاری نہیں کہا جاسکتا تھا۔ زینت سمٹ سمٹا کر خاموش بیٹھی تھی۔ اور یہ نئی زندگی کے اقرار کا آغاز تھا۔

☆......☆......☆

اسکول میں تعطیلات گرما ہوگئیں۔ لائبہ کا رابطہ ٹوٹ گیا۔ زینت کے گھر شادی کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ والدین نے توفیق بھر اچھا جہیز تیار کرلیا تھا۔ گرمی اور رمضان کے باوجود رونق جمی رہتی۔ عصر ہوتے ہی زینت کالو سے صحن کا پختہ اینٹوں والا حصہ دھلوا کر چارپائیاں لگواتی۔ چارپائیوں کے پرلے کونے کھلا برآمدہ کا باورچی خانہ تھا۔ باورچی خانے کے باہر ستون کے ساتھ نعمت خانہ رکھا تھا۔ جس پر چھاؤں رہتی اور ہوادار جگہ تھی۔ اُس کے پاس لکڑی کی بڑی میز پر افطاری کا سامان رکھا جانے لگتا اور وہ بھرتی چلی جاتی۔ پاس پڑوس سے روزانہ کھانے پینے کی اشیاء کا تبادلہ ہوتا۔ گاؤں میں برف کی ریڑھی آتی تھی۔ ہر گھر کی برف بندھی ہوئی تھی کیونکہ رمضان کی ضرورت کے پیش نظر فرج کی نام نہاد برف ناکافی ہوتی۔ زینت برف کو موٹی بوری میں لپیٹ کر اُس میز کو دھو کر اُس پر رکھ دیتی۔ اُس کی قطرہ قطرہ ٹپکتی بوندوں کے نیچے گرمی سے ستائی بلی آکر دراز ہوجاتی۔ زینت کے علاوہ بابا جی، دادی، ابا، وڈے بھائی، وچلے بھائی اور کبھی کبھی بھابی، امی، عصمت اور کالو بھی روزہ رکھتے مگر افطاری میں سب کا حصہ ہوتا۔

کھانے پینے اور تراویح سے فارغ ہوکر چارپائیوں پر لیٹے لیٹے شادی کے حساب کتاب کی باتیں شروع ہوجاتیں اور زینت کے اچھے نصیب کی دُعا پر ختم ہوتی۔

☆......☆......☆

زینت کا دولہا موٹر سائیکل لے رہا تھا اور یہ خوشخبری زینت کے نصیب سے جوڑ کر اُسے 'نصیبوں والی' کہا جاتا تو زینت مسرور ہوجاتی۔ اب زینت بابل کے گاؤں میں مثالی گھر بنانے کی تعریف سُن کر پیا کے گھر کو سنوارنے کے خواب دیکھنے لگتی۔

شادی کی تاریخ طے ہوگئی۔ اب زینت کو زیادہ تر کمرے میں رہنا ہوتا۔ گرمی کا زور اگست کی بارشوں نے کم کردیا تھا۔ اور چھٹیاں ختم ہونے کی خوشی زینت کے لیے شادی سے زیادہ تھی۔

عصمت پہلے دن اسکول گئی تو شادی کے کارڈ لے کر گئی۔

''زینت کی شادی'' اسکول کی سب سے بڑی خبر تھی۔ لائبہ اُسی وقت جاکر زینت سے ملنا چاہتی تھی۔ مگر اسکول میں چیکنگ ٹیم کی آمد کی اطلاع تھی اور اسکول چھوڑنا ممکن نہ تھا۔

گاؤں میں عام طور پر دن کی شادیاں ہوتی ہیں۔

لائبہ نے شادی سے ایک دن پہلے میک اپ باکس زینت کے پاس پہنچادیا۔ زینت نے لائبہ کو رقم دے کر خاص طور پر برانڈڈ سامان لانے کو کہا تھا۔ لائبہ اس فن میں ماہر تھی۔ شادی کے دن لائبہ نے

چھٹی کی درخواست دے دی تھی اور گاؤں آتے ہی شادی میں چلی گئی تھی۔

☆......☆......☆

سبز دروازے پر شادی مبارک کا بورڈ لگا تھا جس کی بتیاں دن ہونے کی وجہ سے آف تھیں۔ لمبا برآمدہ جھنڈیوں اور سجاوٹی جھالروں سے سجا ہوا تھا۔ صحن میں شامیانہ تنا تھا جس کے نیچے بچھی رنگین دریوں پر گاؤں کے بچوں کی اُچھل کود جاری تھی۔ شامیانے کے پیچھے ایک طرف کرسیاں اور کچھ چارپائیاں پڑی تھیں۔ جہاں عورتیں بیٹھی ہنس بول رہی تھیں۔ ساؤنڈ سسٹم پر تیز میوزک کے گانے چل رہے تھے جو بجلی کے جاتے ہی خاموشی میں بدل جاتے۔

لال سرخ عروسی شلوار قمیض پہنے، گیلے بال سکھاتی زینت کا کمرہ شادی شدہ اور کنواری لڑکیوں سے بھرا پڑا تھا۔ لائبہ نے میک اپ شروع کرانے سے پہلے بمشکل کمرہ خالی کرایا۔ اور اندر سے کنڈی لگادی تاکہ اُسے سکون سے تیار کراسکے حالانکہ یہ بات اُن کے ہاں معیوب سمجھی جارہی تھی۔ وہاں دلہن ایک کونے میں منہ دے کے جتنا جیسا نظر آتا تیار کرادی جاتی جبکہ کمرہ بچوں، بچوں کی ماؤں سے اُٹا رہتا۔

شہنائی بجنے لگی۔ ڈھول کی تیز لے قریب آنے لگی۔ بارات توکل سے آئی ہوئی تھی۔ گاؤں کے کسی خالی مکان میں سے تیار ہوکر آرہے تھے۔ ڈھول کی آواز پر بچے بڑے ناچ رہے تھے، تالیاں پیٹ رہے تھے۔ لائبہ نے زینت کے ہاتھوں کی انگلیوں میں بیس پھیلاتے ہوئے کہا۔

''خوش ہو......نا؟''

''پتا نہیں یار۔''

''کیا مطلب پتا نہیں۔ تُو نے بتایا ابھی کہ تیرے دولہا نے تیرے لیے چھپا کے بہن کے ہاتھوں پرفیوم بھیجا ہے۔ چاہتا ہے تجھے......'' وہ شرمائی سی بولی۔

''سب کی شادیاں ہوتی ہیں۔ میں خود کو ڈھارس دیتی ہوں۔''

''پر......''

''ہوں؟''

''یہاں سب کو میری عادت تھی لائبہ، عصمت اسکول سے آتے ہی اسکول کا سارا حال مجھے سناتی۔ ہوم ورک میرے سے مدد لے کر کرتی، کالو ہر کام مجھ سے آکے پوچھتا، جب سے مایوں بیٹھی ہوں، کالو کتنی بار رو کا چکا ہے...... پھر...... مجھے شوق رہا کہ ہمارا گھر شہر والوں جیسا ہو۔ میرے بہن بھائی پینڈو نہ لگیں۔ آوارے توارے نہ پھریں۔ اچھا بولنے والے ہوں۔ میرے بعد یہ سب کون کرے گا۔ کون خیال رکھے گا؟

''دیکھو جانی......ایک دن تو تم نے یہاں سے جانا ہی تھا۔ آتی جاتی رہوگی، کچھ نہیں بدلے گا۔''

''اور......میری سُسرال......وہ تو ٹھیٹھ پینڈو ہیں، کچا دودھ پینے والے، آم سے روٹی کھانے والے۔'' وہ ہنس بھی پڑی۔

''ساس مزاج کی کیسی ہیں؟ چاچی ہیں ناں تمہاری۔'' لائبہ نے اب آنکھوں کا میک اپ شروع کردیا تھا۔

''ٹھیک ہیں، کہتی رہتی ہیں زینت ہمیں سکھا دے گی۔ لائبہ بالوں کا جُوڑا نہ بنانا۔ یہاں دستور نہیں ہے۔ یہ چٹیا ڈال دے۔''

''یہ لال پراندہ گھنگھروؤں والا؟''

''ہاں بی بی! آج تو لال پراندہ ہی ڈالنا ہوگا۔ تُو نے دیکھا نہیں لال جوتا۔ لال جرابیں...... ہاہا......اس کے بعد تو میں اسے پرے پھینک دوں

گی۔‘‘

’’اچھا...... مجبوری ہے۔ سوٹ تو اچھا ہے مگر لال شوز نہ ہوتے، گولڈن ہی لے لیتے۔‘‘

’’سوٹ جتنا اچھا ہے مجھے پتا ہے، تُو دل رکھ رہی ہے۔ یہ میرے سسرال سے آیا ہے ڈبے والا۔ میں کل جو پہنوں گی وہ مہندی کلر کا غرارہ...... تجھے دکھایا تھا ناں؟ اُس پر اتنے اعتراض ہوئے یہ رنگ نہ ہوتا...... یوں نہ ہوتا۔‘‘

’’وہ زبردست ہے۔ جہیز تو پیارا ہے سارا۔‘‘

’’مگر لائبہ...... خود سوچو! اُس ٹبہ بستی میں کس نے میرے مہندی غرارے دیکھنے ہیں۔‘‘

’’اچھا پھر نہ اب اُداس ہو جاؤ۔ تمہارا دولہا دیکھے گا، وہ تو مر مٹے گا۔‘‘ لال پراندہ ڈالنے کے بعد زینت کی چوٹی میں پھولوں کے ہار پروئے گئے۔ اُسے لمبا سا گھونگھٹ کاڑھ کر پلنگ پر سجا کر بٹھاتے ہوئے لائبہ بڑبڑاتی رہی۔

’’سب دُلہن کو دیکھنا چاہتے ہیں، فوٹو بناتے ہیں۔ یہ لمبا سا گھونگھٹ......‘‘ زینت دھیرے سے مسکرا دی۔ اُس پر دب کے روپ چڑھا تھا۔ اُس کے اندر کی سادگی، اخلاص، حیا، محبت نے اُسے اتنا سجل کر دیا تھا کہ دیکھنے والے دانتوں تلے انگلیاں داب رہے تھے۔

زینت کا دولہا بوسکی کی قمیض اور کالی شلوار میں تھا۔ (شاید اُس نے اپنے تئیں فیشن کا لمبا تیر مارا تھا) اُس کا چہرہ جھملاتے سہرے میں ڈھکا ہوا تھا اور گلے میں نوٹوں کے ہار اُس کے دامن تک آتے تھے۔

دلہن دولہا کو ایک ہی پلنگ پر بٹھایا گیا۔ عورتیں انہیں دیکھنے کے لیے ٹوٹی پڑتی تھیں۔ کھانا چلا تو ہجوم کا رُخ باہر کی طرف ہوا۔ رخصتی سے کچھ پہلے ہی لائبہ کو لینے اُس کا بھائی آ گیا تھا۔ وہ جب زینت کو ملنے گئی تو زینت نے سرگوشی میں پوچھا۔

’’تم نے کھانا ٹھیک سے کھایا؟‘‘ اُف یہ سراپا ایثار لڑکی...... حالانکہ عصمت اُس کی تلقین پر پہلے ہی کھانا پیک کروا کے تیار کھڑی تھی۔

’’زینت......‘‘ لائبہ نے اُس کا ہاتھ تھاما، پھر دولہا بھائی کو دیکھ کر کہا۔

’’زینت کو...... بہت خوش رکھیے گا دولہا بھائی۔‘‘

سہرے کی لڑیاں آدھی آدھی چہرے کے اطراف ڈالے، دولہا تابعداری سے سر ہلا کر بولا۔

’’جی ضرور...... انشاءاللہ......‘‘ اور لائبہ چلی گئی۔

لائبہ گھر میں کتنے دن زینت کا ذکر کرتی رہی۔

’’وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ وہ جہاں ہوتی ہے ایک روشنی سی پھیلی رہتی ہے۔ وہ سب کے لیے مرکزِ امید ہے۔ اپنے رویوں سے خوشیوں کے چھوٹے چھوٹے پھول اگاتی رہتی ہے۔ امی! اگر بھیا چھوٹا نہ ہوتا۔ میں زینت کو بھابی بناتی۔‘‘

’’اچھا بیٹا...... اللہ اُسے خوشیاں دے۔‘‘ امی دعا دے کر بات سمیٹتی۔

☆......☆......☆

دن پر دن گزرتے رہے۔ عصمت سے زینت کا حال معلوم ہوتا رہتا تھا۔ اُس کا فلاں دیور آیا تھا۔ ماں نے تازہ سبزیاں، پھل، بسکٹ، چیونگم ٹافیاں، ایوری ڈے بھیجا۔ گھی انڈے مرغ تو اُن کے ہاں ہوتی ہیں مگر زینت باجی کی پسند کی چیزیں نہیں ہوتیں۔ شانوں تک کٹے بالوں والی بے فکر ہنسی لڑکی عصمت کو دیکھ کر لائبہ سوچتی کیا یہ بھی...... بہن کی طرح کسی دن خاموشی سے کہیں ہانک دی جائے گی؟ اُس نے عصمت سے ایک بار پوچھا تھا۔

’’تم نے زینت کا گھر دیکھا ہے کبھی؟‘‘

’’ہاں ہم ولیمے پر گئے تھے۔ اُف میں تو اتنی تھک گئی کہ وہاں جا کے سوتی رہی، پکے سے گاؤں

تک اونٹ ریڑھیاں چلتی ہیں۔ مجید بھائی کا موٹر سائیکل اونچی نیچی جگہوں پر یوں اچھلتا ہے کہ اُس سے اونٹ ریڑھی پر بیٹھنا بہتر لگتا ہے۔ باجی کا کمرہ تو اچھا ہے جہیز سے اچھا بن گیا ہے۔ میلی کچیلی عورتیں اور ننگے دھڑ ننگے بچے، باجی تو اتنی نازک مزاج تھی۔"

ہمیشہ زینت کا ذکر لائبہ کا دل بوجھل کر دیتا۔ لائبہ کے ٹرانسفر آرڈرز ہوگئے۔ اتفاقاً اُس کی فراغت کے دن زینت میکے آ گئی۔ لائبہ کو بلا بھیجا۔ وہ موٹی ہو رہی تھی، اُمید سے تھی۔ اُس کا چہرہ فریش نہیں رہا تھا۔ آنکھوں کے گرد حلقے نمایاں ہو رہے تھے۔ مگر ویسے خوش تھی یا خوش ہونے کی کامیاب اداکاری کر رہی تھی۔ لائبہ نے اُسے ڈانٹ دیا۔

"اپنا خیال کیوں نہیں رکھتی...... یہ کیا ہوگیا ہے، ہاتھ دیکھا اپنے؟"

زینت سہیلی کی محبت بھری ڈانٹ سے محظوظ ہو رہی تھی، گویا بے تکلف دوستانہ لہجے کو گھونٹ گھونٹ اندر اُتار رہی ہو۔ اُس نے جہیز کے ریشمی سوٹ کو سائیڈز سے کھلا کر کے پہن رکھا تھا۔ جو اُس کے بڑھے پیٹ کو چھپانے سے قاصر تھا۔ اور وہ چہرے سے واضح طور پر کمزور لگ رہی تھی۔ لائبہ نے پھر سمجھایا۔

"اچھا اب آئی ہو تو یہیں رہ جانا۔ یہاں بہتر دیکھ بھال ہوگی۔ اور ضرور کسی ڈاکٹر گائنی کو دکھا لو۔ کسی کی باتوں میں نہ آؤ۔ تمہاری حالت ٹھیک نہیں۔ تمہیں چاچی نہیں سمجھاتیں؟ کیس اسپتال سے کروانا زینت۔" زینت مسکرا کر بولی۔

"اچھا میری بنو۔ تجھے اپنی فکر کرتے دیکھ کے سچ پوچھو تو خوشی سے دل میں لڈو پھوٹ رہے ہیں۔ چاچی کہتی ہیں، سب نے بچے پیدا کیے، کوئی انوکھی بات نہیں۔ چاچی بھی سچ کہتی ہیں انہوں نے پورے نو بچے پیدا کیے تھے۔ بھابی نے بھی کہہ دیا چاچی کے ہاں گھی دودھ وافر ہے یہاں کیا رہو گی۔ میری اماں چپ رہیں۔ خیر چھوڑو، یہ تو پوچھو کس سواری میں آئی ہوں۔

"موٹر بائیک ہوگی اور کیا۔"

"نہیں...... میٹرو بس" اُس نے ایک دم سنجیدہ منہ بنالیا۔

"یہ میٹرو بس تم نے کہاں سے سُن لیا۔"

"رہتی اگرچہ باوا آدم کی پہلی بستی میں ہوں۔ مگر "ریڈوا" (ریڈیو) ہوتا ہے وہاں، سارا دن چلتا ہے۔"

"تو کیا باوا آدم کی پہلی بستی میں میٹرو بس چلنے لگی ہے۔"

"توبہ کرو جی...... وہاں کوئی لاہوری بستے ہیں؟ وہاں تو دو پاؤں کے ڈنگر بستے ہیں۔ وہاں تو پکی گلی بنانا سرکار کو فضول خرچی لگتا ہے۔" وہ پھر سے پرانی زینت لگنے لگی۔

"مجھے عصمت نے بتایا تھا اونٹ ریڑھے چلتے ہیں۔"

"میرا دیور کہتا ہے یہ میٹرو بس ہیں، تیز چلتے ہیں۔ اپنی روٹ پہچانتے ہیں۔ صحرا کا جہاز جب صحرا میں اُچھلتا کودتا ہے، کھایا پیا منہ کو آتا ہے اور...... پکے تک پہنچا کے جہاز تو گیا۔ آگے ایک پرانا سا برگد کا درخت ہے سڑک کنارے، اُس کے نیچے چٹائیاں بچھی ہیں۔ مسافر بے شک سو جائیں۔ گھنٹہ دو گھنٹہ بعد بس آ ہی جاتی ہے۔"

"کیا؟"

"ہاں ڈیئر مس لائبہ احمد۔ تم اپنی دنیا جا رہی ہو۔ تمہارا تبادلہ ہوگیا۔ یہ کہانی بھول بھال جاؤ گی۔ میں اپنی کہانی میں مٹ جاؤں گی۔ پتا نہیں ہم پھر ملیں گے بھی کہ نہیں۔" لائبہ نے اُس کے ہاتھ

تھامتے ہوئے کہا۔

''تم میری اچھی دنیا سے کہیں زیادہ اچھی ہو زینت۔ میں تمہیں کبھی بھول نہیں سکتی۔ میں تمہارے ننھے کو دیکھنے ضرور آؤں گی۔ خواہ ننھا تب پاؤں پاؤں چلتا ہو۔ زینت اپنا خیال رکھا کرو۔''

دونوں نے ایک دوسرے کو دعاؤں کے آنچل اوڑھائے، دعاؤں کے ہار پہنائے اور...... چشم نم جدا ہو گئیں۔

☆......☆......☆

زندگی کی مصروفیات نے انہیں اپنے دھارے میں شامل کرلیا۔ اگلے سال لائبہ کی بھی شادی ہوگئی۔ وہ دوسرے شہر میں چلی گئی۔ شادی کے کئی ماہ بعد وہ اپنے شہر آتے ہوئے اصل سڑک کے بند ہونے کے سبب اپنے اسکول والے گاؤں کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ گاؤں کے آنے تک وہ زینت کے بارے میں اتنا کچھ بتا چکی تھی اور اپنی یادیں شیئر کر چکی تھی کہ میاں نے خود ہی گاڑی روک کر اُن سے مل لینے کی پیشکش کردی۔ وہ خوشی سے اچھل پڑی۔

سبز دروازے کا روغن مٹیالا ہوگیا تھا۔ شیشم کا درخت گھنا ہو کر پھیل گیا تھا۔ جیسے ایک اَن دیکھی اداسی وہاں ہوا کے ساتھ سرسراتی تھی۔

لائبہ سوچتی ہوئی اندر داخل ہوئی کہ عصمت تو ہوگی۔ وہ مجھے پہچان لے گی۔ (ویسے دو سال ہی تو ہوئے تھے) اندر نیم کے درخت تلے پتوں کے ڈھیر تھے اور بڑے ہماچے پر سفید داڑھی والا کمزور بوڑھا سو رہا تھا۔ جسے لائبہ کی آمد کی خبر تک نہ ہوئی۔ لائبہ برآمدے کے قریب تک پہنچ گئی۔ اُس کو دیکھ کر بھاگ کر استقبال کرنے والی نہیں تھی۔ قدموں کی چاپ پاکر برآمدے میں چارپائی پر لیٹی عورت نے سر اٹھایا۔ وہ زینت کی امی تھی مگر وہ بھی بڑھاپا اوڑھ چکی تھی۔ وہ شناخت کے چند لمحوں بعد ایک دم اُٹھ بیٹھی۔ لائبہ بیٹھے رہنے کی تلقین کرتے ملنے کو بڑھی۔ مگر وہ اُٹھتے اُٹھتے آوازیں دینے لگی۔

''عصمت...... آ دیکھ...... تیری استانی باجی آئی ہے۔ زینت کی سہیلی آئی ہے۔'' پھر لائبہ کو سینے سے لگالیا۔ ''آ میری دھی، آ میری زینت کی خوشبو، آ میری کالے بالوں والی کی سنگتی۔'' وہ رونے لگیں اور بھابی، عصمت سب وہاں جمع ہوگئے۔ لائبہ سخت پریشان ہو رہی تھی۔

''کیا زینت...... آئی ہوئی ہے؟ عصمت مجھے بتاؤ تم کیوں رو رہے ہو۔ زینت کہاں ہے؟'' بھابی نے لائبہ کو چارپائی پر پکڑ کر بٹھاتے ہوئے بتایا۔

''زینت فوت ہوگئی۔ اُسے فوت ہوئے ایک سال 3 ماہ ہوگئے۔''

''نہیں......'' لائبہ کا دل اُچھل کر جیسے حلق میں آ گیا۔ ''نہیں...... بھابی...... نہیں...... وہ کیوں فوت ہوگئی...... وہ زندگی کی علامت...... اُمنگ امید...... وہ کیسے مرسکتی ہے۔'' لائبہ پر غم تازہ نازل ہوا تھا۔ انکار بھری چیخیں بہت جلد اس سچ کو قبول کر لیتی ہیں کہ خنجر قلب میں اُتر چکا ہے۔ اسے نکالو یا نہ نکالو اذیت اب نہیں مرے گی۔

ہر مرنے والے کے بارے میں آخری فکر مندی یہی ہوتی ہے کیسے مرگیا؟ لائبہ کو بھی یہی بے قراری تھی۔ تو آیئے لائبہ کا تجسس دور کرتے ہیں۔

باوا آدم کی اُس پہلی بستی (بقول زینت) چلتے ہیں جہاں زینت بیاہ کر آئی۔ پکی سڑک کے کنارے ایک برگد کے درخت کے پاس بس اتار دیتی ہے (یہی نشانی ہے اس بستی کی) آگے کوئی راستہ نہیں ہے۔ ٹیڑھی میڑھی، اوپر نیچے ایک لہری چلتی ہے۔ اِدھر اُدھر جھاڑیاں ریت، کہیں گیلی ریت اور کیکر کے درخت ہیں۔ کوئی آدھا میل چل کر آبادی کے چھدرے آثار دکھائی دینے لگتے ہیں۔

لپائی کی بنی ہوئی گول اونچی کلھوٹیاں اور اُن کے ساتھ کچے کوٹھے، ایسے مکان کہیں نزدیک نزدیک اور کہیں خاصے فاصلے پر ایک مکان ہے۔ یہ کوئی تیس چالیس رہائشیں ہیں، ان کو آسانی سے گنا نہیں جاسکتا۔ کیونکہ یہ کسی ترتیب میں نہیں ہیں۔ کبھی لگتا ہے کہ اب کوئی رہائش نہیں ہوگی مگر...... غیر ہموار میدان میں کوئلے پکانے کی بھٹی کا سیاہ دھواں، پھر کچھ کھیت اور درختوں کے پار کوئی اکیلا مکان مل جاتا ہے۔ یہ لپائی کیے کمرے جن کی عموماً پشت پہلے نظر آتی ہے اور جس کے گرد چار دیواری نہیں ہوتی، اگر ہوتی ہے تو دودیواری...... وہ بھی آدھی، آگے کھلا ہوا (شاید یہاں چور نہیں آتے)

زینت اپنے رشتے کے چاچے کے جس گھر میں دُلہن بن کر آئی۔ وہاں چھوٹی سی دودیواری کے اندر 5/4 کنال کا ویہڑا تھا جس میں ایک طرف دو کمرے سمٹے ہوئے نظر آتے تھے، اگرچہ وہ کافی بڑے کمرے تھے جن میں چاچا چاچی اور تین دیور رہتے تھے۔ نند کی شادی ہوگئی تھی۔ وہ بھی اسی بستی میں رہتی تھی۔ ایک الگ کر کے کمرہ دُلہا دُلہن کے لیے بنوایا گیا۔ جس کے آگے کچھ نہ تھا۔ بارش برستی تو بوچھاڑ اندر آتی اور دھوپ دروازہ کھلتے ہی اندر داخل ہوجاتی آنے جانے والوں کے جوتوں کی مٹی فرش پر بچھی میٹ کو گندا کردیتی۔ زینت نے اپنی عادت کے مطابق یہاں بھی بہتری کرنا شروع کردی۔ اپنے کمرے کے دروازے کے دونوں اطراف پودے لگوادیے اور تھوڑا آگے پیپل کا پودا خود بخود نکل آیا جو دیکھ بھال پاکر بڑا ہوتا گیا اور سائے کا سامان بنا۔ کمرے کے آگے دوچار پائیوں جتنی جگہ پر اُس نے اینٹوں کا فرش لگوایا تو چاچی نے بھی اپنے کمروں کے آگے جگہ پکی کرالی زینت کی سلیقہ شعاری کو سب مانتے تھے۔

زینت نے اپنی جان پر ایسی بہت سی ذمہ داریاں لے لی تھیں جو نصف ایمان اور علم کی روشنی پھیلاتی تھیں۔ بستی کے بچوں کو اُردو اور قرآن پاک پڑھانے لگی۔ مگر اُس کے وسائل نہ ہونے کے برابر تھے اور وہ مجبور تھی۔ وہ گاؤں میں بجلی نہیں لاسکتی تھی۔ لالٹین کی دُھندلی روشنی اُسے اُداس کردیتی۔ وہ رستے گلیاں نہیں بنواسکتی تھی۔ وہ بیمار بچوں کو درختوں تلے دن بھر پڑے ریں ریں کرتے دیکھتی تھی۔ مگر اسپتال، ڈاکٹر نہیں مہیا کرسکتی تھی۔ اُس کی تبدیلی اپنے ویہڑے تک محدود تھی۔

جب زینت کا پاؤں بھاری ہوا تو اُس نے اپنی مشقت کم کردی۔ چاچی بھی کافی خیال رکھنے لگی۔ اُس پر لازم کردیا کہ وہ سارا دن چارپائی پر بیٹھی رہے کہ بقول چاچی اُس کا، اللہ امین کا پوتا پوتی تھا۔ دیسی گھی میں نچڑے بیسن کے لڈو کھلائے جاتے، منہ کا ذائقہ بدلنے کو بھی گندم، بھنے چنے مٹھی بھر مل جاتے، بچے کی جھنڈ (بال) گھنے لمبے کرنے کے لیے اُبلی سویاں گاڑھے دودھ میں ملا کر دی جاتیں۔ دیسی گھی کو تو وہاں ہر مرض کا علاج سمجھا جاتا تھا سر میں لگایا جاتا، مالش کی جاتی، پکا کر کھلایا جاتا اور گرم کر کے دودھ میں پلایا جاتا۔ سبزیاں تو پکتیں مگر پھل کا تصور نہ تھا۔ پھل صرف وہی تھا جو درختوں پر لگتا تھا یعنی کھجور، آم اور کہیں ایک انار کا پیڑ تھا جس پر گنے چنے سوکھے انار لگتے۔ زینت کی طبیعت چکنائی سے اوبھ چکی تھی۔ جب وہ لائبہ کو ملی تھی تو چوتھا مہینہ تھا۔ ساتویں مہینے وہ پھر بابل کے گھر گئی تھی۔ خاوند ساتھ تھا۔ اماں نے روکنا چاہا مگر اُس کے میاں نے کہا کہ وہ پندرہ دن بعد مکمل تیاری کے ساتھ آئے گی۔ ابھی وہ گھر (کمرے کا) کا سامان سینندھ کر نہیں آئی۔ اماں کو ڈر رہتا تھا کہ اس کو تکلیف دہ راستہ طے کرنا پڑتا ہے مگر یہ بات اُن لوگوں کے لیے ہنسنے والی تھی

کیونکہ وہ اس کے عادی تھے۔ زینت کی امی نے اُس کی زچگی اور چھلہ کا انتظام کر رکھا تھا۔ ایک ریٹائرڈ لیڈی ہیلتھ وزیٹر کی خدمات میسر تھیں۔ وہ ڈرپ انجکشن لگالیتی تھی۔

زینت کے پاؤں اور چہرے پر بہت زیادہ سوجن چڑھ چکی تھی۔ اُس کا کولیسٹرول لیول مسلسل ہائی رہتا تھا۔ اُسے مردانہ قمیضوں کے سوا کوئی قمیض نہ آتی تھی اور وہ پاؤں میں مردانہ چپل ڈال سکتی تھی۔ وہ پندرہ کی بجائے بارہ دن گزار کر میکے جانے کو تیار ہوگئی تھی۔ چاچی نے نہیں روکا، گھی اور دعائیں دے کر رخصت کیا۔

ڈاچی کے پیچھے ریڑھے میں دری بچھا کر اوپر موٹے کپڑے کی چھت لگا دی گئی گویا آرام دہ ایمبولینس تیار ہوگئی۔ چاچی کو بخار تھا وہ ساتھ نہ جاسکی، ریڑھی میں زینت کا چاچا، خاوند کے علاوہ برادری کی کچھ عورتیں ساتھ تھیں جو اپنے اپنے کاموں سے جارہی تھیں۔ ہر جمپ پر عورتیں ہنستی اور مذاق کرتیں۔ مگر آدھا راستہ طے نہ ہوا تھا کہ زینت کو درد شروع ہوگیا۔ اب ایک عورت اُس کے پیٹ پر ہاتھ رکھے دوسری ٹانگیں دبا رہی تھی۔ اُس کا خاوند بار بار مڑ کر دیکھتا وہ پریشان ہو رہا تھا۔ عورتوں نے اُسے سمجھایا کہ درد لگنے کے بعد کئی گھنٹے گزرتے ہیں اور یہ تو پہلوٹھی ہے۔ اتنے میں ہم گاؤں پہنچ جائیں گے۔ خاوند نے موبائل پر اپنے کسی دوست کو سڑک پر سوزوکی ڈالہ لے کر ٹھہرنے کی تاکید کر دی تھی۔ موبائل کے سگنل کہیں ملتے اور کہیں نہ ملتے تھے۔

زینت ہر جھٹکے پر کراہتی اور 'ہائے امی' کی آواز نکالتی۔ عورتیں اُسے صبر کرنے کی تلقین کرتیں اور آپس میں تبصرے کرتیں کہ ابھی تو آٹھواں لگا ہے۔ یہ تو خطرے والی بات ہے مگر رفتہ رفتہ زینت کی آواز خاموش ہوتی چلی گئی۔ عورتوں کو لگا وہ بے ہوش ہوگئی ہے تب انہیں احساس ہوا کہ اُس کے کپڑے خون سے تر ہو رہے ہیں۔ انہوں نے مردوں کو متوجہ کیا اور 'ہائے ہائے' ڈال دی۔ خاوند نے پانی کی بوتل کھول کر زینت کے منہ سے ٹپکانے ہی والا تھا کہ چاچے نے جھڑک دیا کہ گھی پلایا جائے طاقت آئے گی۔ عورتیں بھی بوڑھے مرد کی تائید کرنے لگیں کہ کسی کا ماما تھا تو کسی کا تایا...... مگر زینت کے میاں نے ایک نہ سنی اور پانی منہ میں ڈالا، پانی باچھوں سے بہہ گیا وہ نگل نہیں رہی تھی۔ خاوند اسے پکارتا تھا۔ گال تھپکتا تھا...... پھر وہ رو پڑا۔

''ابا...... زینت کو کیا ہوگیا ہے۔''

''بس پتر...... حوصلہ...... یہ دیکھ ہم پکی سڑک پہنچ گئے۔ وہ دیکھ سوزوکی آئی ہوئی ہے...... کاشف آیا کھڑا ہے۔''

زینت کو کسی طرح چادروں کپڑوں میں لپیٹ کر سوزوکی میں لٹایا گیا۔ اب اُس کے میکے گاؤں جانا فضول تھا۔ زینت کے میاں نے اُس کے گھر والوں کو فون کر دیا۔ وہ 30 کلومیٹر دور قصبہ کے اسپتال جارہے تھے۔

لیڈی ڈاکٹر جھڑک رہی تھی۔ ناراض ہو رہی تھی۔ جہالت کو اُس کے جسم میں پانی کی شدید کمی اور خون کے بے تحاشا اخراج کی ذمہ دار قرار دے رہی تھی۔ اُس کی احتیاط اور چیک اپ نہ کرانے کا اُس کے خاوند کو مجرم کہہ رہی تھی۔

مگر وہ کسی تیز رفتار اڑن کھٹولے میں اڑتی بادلوں سے اٹھکیلیاں کرتی، زندگی میں پہلی بار برق سواری کے مزے لیتی انجانے سفر پر روانہ ہو چکی تھی۔ اُس کے بطن کا معصوم خواب تفریق زدہ جذامی معاشرے میں آنکھیں کھولنے سے پہلے بے جان ہو چکا تھا۔

☆☆......☆☆

اماں کا بکرا

گھر میں بھنک تو پڑ چکی تھی کہ اماں اس بار قربانی کر کے ہی دم لیں گی۔ حالانکہ اماں نے ابھی اعلان نہیں کیا تھا۔ حارث کو فکر تھی وہ بہانے بہانے سے اماں کو یاد دلاتا رہتا تا کہ اماں ایک بار اقرار کر لیں اور وہ بھی دوستوں میں ذرا شان دکھائے، اپنے بکرے کو گھمائے، ابھی......

ایثار، محبت اور قربانی کے جذبے سے گندھا، ایک خوبصورت افسانہ

''اماں بقرعید آ رہی ہے۔'' حارث نے اپنی دانست میں گویا کوئی بڑا انکشاف کیا۔ اماں نے سنی ان سنی کرتے ہوئے پراٹھے پہ گھی لگایا۔ وہ اِس وقت کچن میں ناشتہ بنا رہی تھیں۔ حارث نے اپنی بات کا کوئی اثر نہ دیکھتے ہوئے دوبارہ اماں کا گھٹنا ہلایا۔

''اماں بقرعید آ رہی ہے۔''

''اے ہے تو کیا کروں؟'' اماں نے تنک کے جواب دیا۔

''اماں قربانی اور کیا؟'' حارث نے پھر ایسے کہا جیسے اماں کو پتا ہی نہ ہو کہ بقرعید پر قربانی کرتے ہیں۔

''کم بختو! تم لوگوں سے کچھ بچے تو قربانی کا سوچوں۔ لاکھ بچتیں کر لو مگر عید تک آتے آتے سب ختم۔ اوپر سے مہنگائی ہے کہ بڑھے چلی جا رہی ہے۔ جتنے پیسے جمع کرو عید پر پتا چلتا ہے کہ جانور دوگنے میں آئے گا۔''

''اماں ایسا کرتے ہیں کہ ادھار پر بکرا لے آتے ہیں۔'' حارث نے حل پیش کیا اماں نے ایک دھموکا اس کی کمر پر جڑا۔

''کم بخت ادھار کے پیسوں سے قربانی کروائے گا۔ چل یہ پکڑ اور جا سدرہ کو بلا لا۔ جلدی ناشتا کرو، دیر ہو رہی ہے۔'' اماں نے ناشتے کی ٹرے حارث کو پکڑائی۔ دونوں بہن بھائی تیار تھے۔ جلدی سے ناشتہ کر کے باہر کھڑے ابا کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے باہر نکل گئے۔ پیچھے اماں نے ٹھنڈی سانس بھری اور ثاقب کے لیے ناشتہ بنانے لگیں۔

☆......☆......☆

سب جانتے تھے کہ اماں کو قربانی کا کتنا شوق بلکہ آرزو تھی۔ اپنے بچپن میں وہ بقرعید کے موقع پر آنے والی گائیں اور بکری دیکھ کر فرمائش کر بیٹھتیں۔ مگر آٹھ بہن بھائیوں میں ابا کی محدود آمدنی چٹ پٹ ہو جاتی کہ بس۔ ایسے میں صرف دوسروں کے جانور دیکھ کر ہی دل بہلایا جا سکتا تھا یا پھر خود ہی

قربان ہوا جا سکتا تھا۔
اماں بھی یہ خواہش دل میں لیے بڑی ہوگئیں۔ جب بڑی بہنیں بیاہی جانے لگیں تو اماں نے اپنی خواہش کو اپنے گھر تک کے لیے ملتوی کر دیا۔ پھر جب شادی ہو کے سسرال آئیں تو گویا یہاں اُن کے اپنے گھر سے تو بہتر حالات تھے۔ شوہر گورنمنٹ ملازم تھے مگر ایمانداری اور حلال کی کمائی سے گھر چلایا۔ مشترکہ فیملی نظام تھا۔ اماں اگر پیسے جوڑتیں تو
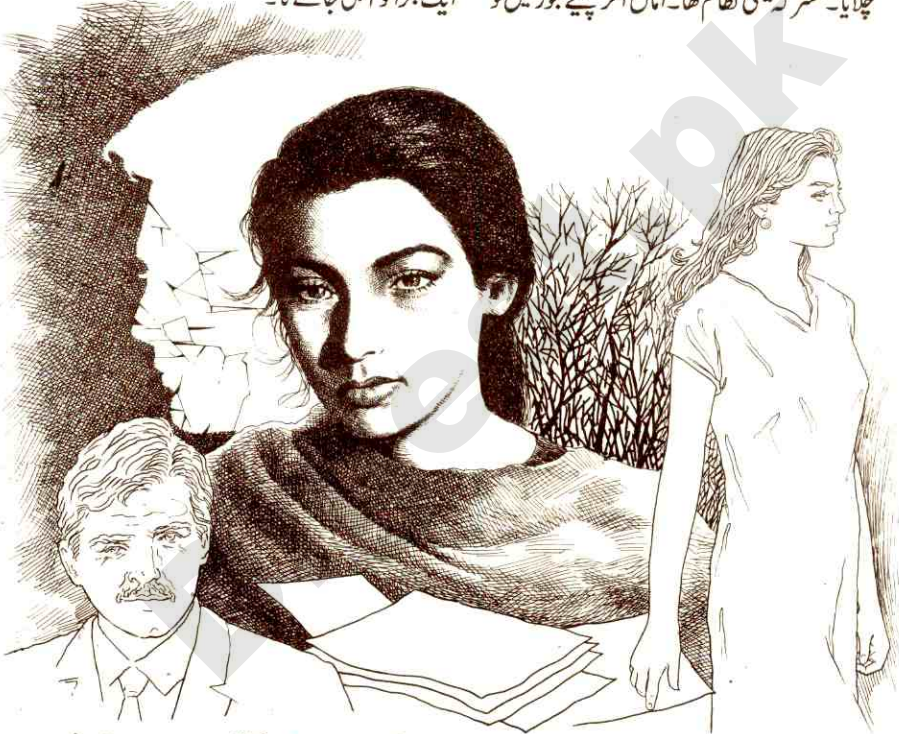
سدرہ جو فرسٹ ایئر میں تھی اور اس کے بعد وارث جو میٹرک کا طالب علم تھا۔ اب جبکہ اماں اپنی سسرالی ذمہ داریوں سے فارغ ہوگئیں تھیں اور بڑا بیٹا بھی نوکری ڈھونڈ رہا تھا۔ اماں نے پھر پیسے جوڑنا شروع کر دیے تھے۔
بقر عید میں ایک ماہ تھا اور اماں نے سوچا تھا کہ پندرہ دن بعد ایک کمیٹی بھی کھلنے والی ہے۔ تو وہ ملا کر ایک بکرا تو آ ہی جائے گا۔

کوئی نہ کوئی مسئلہ آ جاتا۔ بھی ساس کی بیماری، بھی کسی نند کی شادی، کبھی جیٹھ کے بچوں کا سلسلہ چل پڑتا اور اماں اپنے جمع شدہ پیسے خاموشی سے دے دیتیں۔
اماں کے تین بچے تھے۔ بڑا ثاقب جو اب پڑھائی سے فارغ تھا اور ملازمت ڈھونڈ رہا تھا پھر

گھر میں بھنک تو پڑ چکی تھی کہ اماں اس بار قربانی کر کے ہی دم لیں گی۔ حالانکہ اماں نے ابھی اعلان نہیں کیا تھا۔ حارث کو فکر تھی وہ بہانے بہانے سے اماں کو یاد دلاتا رہتا تاکہ اماں ایک بار اقرار کر لیں اور وہ بھی دوستوں میں ذرا شان دکھائے، اپنے بکرے کو گھمائے، ابھی تک تو وہ دوسروں کے جانور

ہی گھما گھما کے شوق پورے کر رہے تھا۔

☆......☆......☆

اماں کی پڑوسن آئی بیٹھی تھیں۔ پیسے والے لوگ تھے ہر سال گائے اور بکرے کی قربانی کرتے تھے۔

''کل سُفیان کے ابا گائے لے آئے ہیں۔'' انہوں نے اطلاع دینا ضرور سمجھا۔ حالانکہ ان کی گائے کی ''بھیں بھیں'' نے پورے محلے میں اپنی آمد کا اعلان کر دیا تھا۔ مگر جب تک وہ خود بنفسِ نفیس گھر گھر جا کے اطلاع نہ دیتیں انہیں لگتا کہ قربانی کچھ ادھوری سی ہے۔

''اور خالہ بکرا کب آئے گا؟'' سدرہ نے اُن کو مزید جوش دلایا۔

''ارے ہاں وہ بھی بس ایک دو دن میں آ جائے گا۔ تمہیں تو پتا ہے کہ بڑے کا گوشت تو میں کھاتی نہیں، تو بس اسی لیے بکرا ہی ساتھ منگا لیتی ہوں۔ قربانی بھی ہو جاتی ہے اور تھوڑا سا چکھنے کو مل جاتا ہے، ورنہ تو چھوٹے گوشت کی قیمت سُن کر تو انسان بس ادھ مُوا ہو جاتا ہے۔ خالہ نے سفید جھوٹ بولا ورنہ ان کا فرج تو سارا سال بڑے، چھوٹے درمیانے ہر قسم کے گوشت سے بھرا رہتا تھا۔

''ارے ہاں تمہارا ارادہ بھی تو تھا نا اس سال۔'' انہوں نے اماں کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''ہاں ارادہ تو ہے اب آگے اللہ کی مرضی۔'' اماں نے رسانیت سے جواب دیا۔

''خالہ آپ کی گائے کتنے کی آئی!'' سدرہ نے بات بدلی۔

''ارے بیٹا مت پوچھو پورے ڈیڑھ لاکھ کی ہے۔'' انہوں نے اماں کی اُمیدوں پر پانی پھیرتے ہوئے کہا۔

''واقعی خالہ۔'' حارث نے درمیان میں ٹانگ اڑائی۔ ''آپ کی گائے تو واقعی زبردست ہے۔'' حارث کو کلیجی کی فکر تھی۔ خالہ کا بیٹا عاصم حارث کا دوست تھا اور وہ قربانی کے وقت ساتھ ہی رہتے تھے اس لیے اس نے خالہ کو مکھن لگانا ضروری سمجھا۔

''کیوں نہ ہو آخر قربانی کر رہے ہیں اللہ کی راہ میں۔ چیز تو اچھی ہونا چاہیے نا۔ اب یہ کیا کہ ادھ مرا بکرا یا مریل سی گائے لے آئے اور اس میں بھی سات حصے کر دیے اور لوجی نام خود کا لگا لیا کہ قربانی کر رہے ہیں۔ خالہ نجانے کس کا ذکر کر رہی تھیں ادھر اماں پہلو بدل رہی تھیں۔ سدرہ نے اماں کی کیفیت سمجھتے ہوئے فوراً پوچھا۔

''خالہ چائے لاؤں۔''

''ہاں ہاں کیوں نہیں آخر اتنے دنوں بعد آئی ہوں چائے پی کے ہی جاؤں گی۔'' خالہ نے مزید پھیل کے بیٹھتے ہوئے کہا۔ حالانکہ اُن کے ''اتنے دن'' تین دن بعد ہی آ گئے تھے۔ وہ ہفتے میں دو چکر تو لازمی لگاتی تھیں اور دو کپ چائے اور تین پان کھا کے ہی اٹھتی تھیں، اس بار بھی ایسا ہی ہوا، جیسے ہی ان کا دو چائے اور تین پان کا کوٹا پورا ہوا انہوں نے گھر کا رستہ لیا۔ ان کے جاتے ہی اماں نے سکون کا سانس لیا اور کمرے میں چلی گئیں۔

☆......☆......☆

''حارث کے ابا۔'' اماں نے ابا کو مخاطب کیا۔

''ارے بھئی تمہارا ابھی تو کچھ لگتا ہوں۔ جب دیکھو حارث کے ابا کہہ کے ہی بلاتی ہو۔'' ابا نے مسکراتے ہوئے اماں کو دیکھا۔

''چھوڑیں نا، مجھے آپ سے کچھ کہنا تھا۔'' اماں رات کو سب کاموں سے فراغت کے بعد جب کمرے میں گئیں تو ابا کتاب کے مطالعے میں

مصروف تھے۔ اماں کے 'حارث کے ابا' کہنے سے سمجھ گئے کہ کوئی خاص بات کرنا ہے۔ انہوں کے کتاب بند کی اور اماں کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''جی حارث کی اماں فرمایئے۔'' اماں تھوڑا سا جھینپیں پھر کہنے لگیں۔

''کمیٹی کھل گئی ہے اور میں نے بھی کچھ پیسے جمع کیے ہیں۔ دونوں ملا کے تیس ہزار ہیں۔ اس میں بکرا تو آ ہی جائے گا۔'' اماں تھوڑا سا رُکیں اور پھر بولیں۔ ''تو اس بار ہم بھی قربانی کر لیتے ہیں۔'' اماں نے بات پوری کی۔ ابا نے ایک نظر اماں کو دیکھا وہ اپنی صنف بہتر کی خواہش کو جانتے تھے اور پورا نہ کر سکنے کا ملال بھی رکھتے تھے۔

اب جو اماں نے ان کو پیسے دیے تو وہ خاموش ہو گئے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ پیسے اماں نے کیسے جمع کیے۔

سال میں ایک دو جوڑوں کے سوا وہ اپنے لیے کبھی کچھ نہ خریدتی تھیں۔ سدرہ ہی زبردستی اماں کے لیے کچھ نہ کچھ لے آتی تھی۔ پہلے اپنی سسرالیوں کے لیے پھر اپنے بچوں کے لیے، کبھی اماں نے کنجوسی نہیں کی اپنی سب بچت وہ ابا کے بہن بھائیوں پر کھلے دل سے خرچ کر دیتیں۔ ابا کے لیے اچھا لباس رکھنا، بچوں کی ضروریات کو وہ کبھی نہیں ٹالتی تھیں۔ صرف اپنے لیے دیے گئے پیسوں کو وہ جمع کر لیتیں۔ ابا کو خاموش دیکھ کر 'وہ' ان کی مزاج شناس، فوراً سمجھ گئیں۔

''ارے یہ آپ ہی کے تو پیسے ہیں۔ یاد نہیں اُس دن آپ نے پانچ ہزار دیے تھے، پھر اس کے علاوہ بھی تو آپ ماشاء اللہ گھر کے لیے کھلا خرچ دیتے ہیں، تو بس اسی میں سے کچھ بچا لیے۔'' اماں نے ابا کو حوصلہ دیا اور وہ پیسے رومال میں باندھ کر ابا کے حوالے کر دیے۔

''بس اب آپ بکرا لے آئیں۔'' عید میں پندرہ دن رہ گئے ہیں۔ اچھا ہے حارث تھوڑا خوش ہو جائے گا۔ اس کو جانور گھمانے کا کتنا شوق ہے نا۔'' اماں حارث کا سوچ کے ہنسیں اور رومال میاں کے ہاتھ میں تھما دیا، جس کو وہ لے نہیں رہے تھے۔

☆......☆......☆

دو دن بعد اتوار تھا۔ ابا نے پروگرام بنایا کہ اتوار کو ثاقب کو ساتھ لے کر جائیں گے۔

شام کو ثاقب گھر آیا تو اس کے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ تھا۔ ثاقب نے ڈبہ اماں کو دیتے ہوئے پوچھا۔

''اماں بتائیں کس بات کی مٹھائی ہے؟''

''بھائی کو کوئی لڑکی پسند آ گئی ہے۔'' حارث ہمیشہ الٹی ہانکتا تھا۔

''بھائی کو نوکری مل گئی ہے۔'' سدرہ نے ذرا عقل مندی کا مظاہرہ کیا۔

''ارے واقعی۔'' اماں بھی خوش ہوئیں۔

''ہاں اماں مجھے نوکری مل گئی ہے۔'' ثاقب نے بتایا۔

''بھائی تنخواہ کتنی ہے؟'' حارث نے پھر بے سُری بات کی۔

''اماں ابھی تو بیس ہزار ہے بعد میں بڑھے گی۔'' ثاقب نے اماں کو بتایا۔

''اللہ تیرا شکر ہے۔'' اماں متشکر ہوئیں۔

''بھائی کب سے جائیں گے؟'' سدرہ نے سوال کیا۔

''پیر سے جاؤں گا۔'' پھر سب نے مٹھائی کھائی اور ثاقب سدرہ اور حارث کو تفصیل بتانے لگا اور اماں شکرانے کے نفل پڑھنے چلی گئیں۔

☆......☆......☆

"بھابی بڑی امید لے کر آئی ہوں۔ آپ نے ہمیشہ ہم لوگوں کا خیال رکھا اب بھی مایوس نہ کیجیے گا۔ کہیں سے بھی کر دیں بس حمزہ کو بچالیں۔" چھوٹی پھوپو آئی ہوئی تھیں۔ ان کے چھوٹے بیٹے کا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا۔ پھوپا بھی ریٹائرڈ ہوگئے تھے۔ اور حمزہ ہی کمانے والا تھا۔ حالانکہ وہ اپنی بڑی بہن کے بھی جاسکتی تھیں مگر وہ وہیں آئی تھیں، جہاں سے ان کو مدد کا یقین تھا۔

سب خاموش تھے سدرہ اور حارث چپ کھڑے اپنی مطلبی پھوپو کو دیکھ رہے تھے، جو ویسے تو دوسرے بھائیوں کے گھر جاتی رہتی تھیں اور مطلب کے وقت یہاں آگئی تھیں۔ اماں خاموش تھیں۔ آخر ابا نے ہی زبان کھولی۔

"دیکھو کلثوم تم جانتی ہو ہمارے حالات، اتنی بڑی رقم کہاں سے لائیں گے تم حمیرا یا بھائی جان سے کیوں نہیں کہتیں۔" ابا نے دوسرے بہن بھائی کے نام لیے اس بار وہ اماں کی خواہش کو کسی صورت خالی نہیں رکھنا چاہتے تھے۔

"بھائی آپ تو جانتے ہیں انہیں۔" کلثوم نے سر جھکا کے آہستہ سے کہا۔

"تمہارا تو بہت آنا جانا ہے ان کے گھر پھر بھی۔" ابا نے طنز کیا۔ کلثوم شرمندگی سے کچھ نہ بولی۔ پھر اٹھنے لگی تو اماں نے پوچھا۔

"کتنے پیسے چاہیے؟" سب کی نظریں بیک وقت اماں پر گئیں۔ سدرہ اور حارث حیران تھے اور ابا نے نظریں پھیر لیں۔ کلثوم نے بھاگ کر اماں کے ہاتھ پکڑ لیے اور رونے لگی۔

"بھابی مجھے معاف کر دیں۔ میں نے آپ کو پریشان کیا۔ قسم سے جیسے ہی حمزہ ٹھیک ہوگا فوراً واپس کر دوں گی۔ آپ کا بہت احسان ہے۔ آپ نے کبھی ہمیں خالی نہ لوٹایا۔" اس بار وہ دل سے شرمندہ تھیں۔ بڑی بھاوج کے پاس گئی تھی۔ مگر انہوں نے اِدھر اُدھر کے خرچے گنوا کر منع کر دیا۔ جب کہ کلثوم نے ہمیشہ اماں کے مقابلے میں بڑی بھاوج کو ہی بھرا تھا اور ہر وقت کا آنا جانا اُن کے ہی گھر تھا مگر وہ یہ بات کیسے بتاتی سو خاموش رہی۔

اماں نے تیس ہزار لا کر کلثوم کے ہاتھ پر رکھے تو ابا چپ چاپ کمرے سے نکل گئے اور حارث و سدرہ نے بھی غصے سے دونوں کو دیکھا اور منہ بنا کر کمرے سے نکل گئے۔

☆......☆......☆

گھر میں کافی خاموشی تھی۔ ثاقب کی نوکری لگ گئی تھی۔ وہ اس میں مصروف ہوگیا۔ ابا بس چپ تھے۔ صرف سدرہ اور حارث تھے جنہوں نے اماں سے لڑائی کی تھی۔

"اماں آپ نے پھوپو کو پیسے کیوں دیے؟ وہ تو ہمیشہ مطلب سے آتی ہیں۔ ویسے ہر وقت تائی کے گھر رہتی ہیں۔ پیسے ان سے ہی مانگتیں نا۔" سدرہ جل کر بولی۔

"اور نہیں تو کیا، میں نے اپنے دوستوں کو بھی بتا دیا تھا کہ ہم بھی اس بار قربانی کرینگے۔" حارث بھی بول پڑا۔

"اماں آپ نے کیوں دیے پیسے۔" حارث اماں کے کندھے سے لگ گیا۔

"بس چپ ہو جاؤ تم لوگ! بری بات ہے، آخر اپنے ہی مصیبت میں کام آتے ہیں۔ کوئی بات نہیں جب اللہ چاہے گا قربانی ہو جائے گی۔" اماں نے رسانیت سے جواب دیا تو دونوں منہ بنا کر اُٹھ گئے۔

☆......☆......☆

عید میں دو دن رہ گئے تھے جب شام کے وقت گھر کے باہر گاڑی رُکنے کی آواز آئی۔ اماں اور سدرہ سامنے ہی تخت پر صحن میں بیٹھے تھے۔ سدرہ

کالج کا کام کر رہی تھی جبکہ اماں شام کے کھانے کی تیاری میں مصروف تھیں۔ پھر دروازہ کھلا اور ثاقب اور ابا ایک بکرے کو پکڑ کے اندر لانے لگے۔

''اماں بکرا'' سدرہ چیخی اور دروازے کی طرف بھاگی۔

''یہ......'' حارث بھی زور سے چلایا اور کمرے سے سیدھی دروازے پر دوڑ لگائی۔ ''ابا یہ ہمارا ہے نا'' حارث کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ سامنے ہی براؤن اور سفید رنگ کا صحت مند بکرا کھڑا منہ چلا رہا تھا۔

''ہاں بھئی ہمارا ہے۔'' ثاقب نے بکرے کو باندھنے کے لیے کھونٹا تلاش کیا۔ اماں بھی ایک دم کھڑی ہو گئیں۔ ان کی آنکھوں میں بے یقینی تھی، کبھی وہ ثاقب کو کبھی ابا کو دیکھ رہی تھیں۔ ثاقب بالآخر بکرے کو باندھنے میں کامیاب ہو گیا۔ گھاس بکرے کے آگے ڈال کر وہ اماں کی طرف پلٹا۔

''اماں آپ ہی تو کہتی ہیں نا کہ قربانی رائیگاں نہیں جاتی تو پھر میری اتنی اچھی اماں کی قربانیاں کیسے رائیگاں جاتیں، جنہوں نے ہمیشہ اپنی خواہشوں کو مار کر دوسروں کے لیے آسانیاں فراہم کیں۔'' ثاقب نے اماں کے ہاتھ تھام لیے، جس دن آپ نے پھوپو کو پیسے دیے تھے نا میں نے اُس دن سوچ لیا تھا کہ میں کہیں سے بھی بندوبست کروں گا۔ مگر اس بار گھر میں قربانی ضرور ہوگی۔''

''تو بھائی آپ نے ایڈوانس لیا ہے؟'' سدرہ نے پوچھا۔

''ہاں لے لیتا مگر! میری بہن ابھی مجھے ڈیوٹی جوائن کیے دن کتنے ہوئے ہیں۔'' ثاقب رُکا۔

''تو پھر یہ بکرا؟'' اماں نے سوالیہ نگاہوں سے پہلے ثاقب پھر ابا کو دیکھا اتنے میں ابا قریب آئے۔

''ابا کی آنکھوں کے آپریشن کے لیے جو پیسے رکھے تھے نا وہ ابا نے......'' ثاقب نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ اماں نے ابا کو دیکھا۔

''وہ آپریشن تو ضروری تھا۔''

''آپ کی خواہش سے زیادہ نہیں۔'' ابا مسکرائے۔ ''ارے بھئی آپریشن بعد میں کرا لیں گے۔ ابھی تو کام چل رہا ہے نا۔ ساری زندگی تو آپ میرے بہن بھائیوں کے لیے اپنی خواہشوں کو قربان کرتی آئی ہیں، تو کیا میں اتنا بھی نہیں کر سکتا۔'' ابا کے لہجے میں شرمندگی تھی۔

''کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ وہ میرے بھی تو کچھ لگتے ہیں اور ویسے بھی تو وہ آپ کے دیے ہوئے پیسے ہوتے ہیں۔ میں کون سا نوکری کرتی ہوں۔'' اماں نے حسبِ معمول ابا کو شرمندہ ہونے سے بچایا۔

''جی بجا فرمایا مگر اس وقت اِس سے بڑھ کر کچھ بھی ضروری نہ تھا۔ اگر یہ وقت بھی نکل جاتا تو میں ساری زندگی آپ سے نظر نہیں ملا پاتا۔'' ابا واقعی دل سے شرمندہ تھے۔ اس لیے انہوں نے اپنے آپریشن کے لیے رکھے پیسوں سے بکرا خرید لیا حالانکہ ثاقب نے بہت روکا تھا مگر ابا نے کہا۔

''یہ تمہاری ماں کا مجھ پر قرض ہے اس لیے ادا بھی میں ہی کروں گا۔''

''ابا یہ بکرا ہمارا ہے نا میں اِسے گھمانے لے جاؤں؟'' حارث جو گومگو کی کیفیت میں ساری باتیں سن رہا تھا ابا کی آخری بات سُن کر بولا۔

''ہاں بھئی ہمارا ہے لے جاؤ۔ دو دن پہلے اس لیے لائے ہیں ورنہ تو چاند رات کو سرپرائز دینے کا پروگرام تھا۔'' ابا نے مسکرا کے اماں کو دیکھا تو اماں بھی مسکرا دیں۔

''ہُرا......'' حارث نے نعرہ لگاتے ہوئے بکرے کی رسی کھولی اور باہر کی جانب چل پڑا۔

☆☆......☆☆

کمہار

اُجلے اُجلے یونیفارم میں راج ہنس کی مانند لہراتی لڑکیوں کے جھرمٹ میں وہ سیاہ برقع اوڑھے کوئل کی تصویر لگ رہی تھی۔ چپ چاپ بس اسٹاپ پر جا کھڑی ہوئی۔ بہن جی ذرا اِدھر ہو جائیں۔ پہلے کالج کی بچیوں کو چڑھنے دیں۔ کالج کو دیر ہو جائے تو......

قدرت کی چاک پہ رکھی، مورت کا فسانۂ خاص

میٹرک کی شاندار کامیابی نے ابا کی جانب سے تحفے کی صورت میں ''برقعے'' نے ساری خوشی کافور کر دی۔ کالج کا براق یونیفارم، بالوں کو چوٹی کی قید سے آزاد کر کے، رنگین ربن سے پونی کی صورت میں باندھنے کے ارمان جل کر خاک ہوتے آنکھوں کو نمکین پانی کی سوغات دے گئے۔

''ارے بچے کامیابی کی خوشی منانے کے بجائے یہ سوگ کیسا؟''

''امی سوگ اِس برقعے کا منا رہی ہوں، جو میری خوشی کے آگے کالا سایہ بنا کھڑا ہے۔''

''ہیں ہیں کیا اناپ شناپ بکے جا رہی ہو۔ ارے تم کو تو اتنی بھی آزادی مل گئی کہ کالج کی اسٹیج پر تمہیں پہنایا جا رہا ہے۔ ہمارے زمانے میں تو لڑکی کا بارہواں سال ختم نہ ہوا کہ جھٹ برقع اوڑھا دیا جاتا۔ ہم نے تو کوئی واویلا نہیں مچایا۔ صاحبزادی اگر کالج پڑھنے کا شوق رکھتی ہو تو اس کے لیے برقع ضرور لینا ہوگا۔''

''پر امی میری تو کوئی بھی فرینڈ......''

''تمہارے ابا کا فیصلہ ہے۔ ان کے فیصلے کے آگے میں نے کبھی حجت نہیں کی لہٰذا تم بھی اس سے پرہیز کرو۔''

دو روز کے سوگ کے بعد آخر اُسے ابا کے فیصلے پر سر جھکانا پڑا۔

☆......☆......☆

اُجلے اُجلے یونیفارم میں راج ہنس کی مانند لہراتی لڑکیوں کے جھرمٹ میں وہ سیاہ برقع اوڑھے کوئل کی تصویر لگ رہی تھی۔ چپ چاپ بس اسٹاپ پر جا کھڑی ہوئی۔

''بہن جی ذرا اِدھر ہو جائیں۔ پہلے کالج کی بچیوں کو چڑھنے دیں۔ کالج کو دیر ہو جائے گی۔ آپ کو کون سا پڑھنے جانا ہے۔'' بس کے رُکتے ہی بس کنڈیکٹر نے اُسے لڑکیوں کی لسٹ سے ہی نہیں ہٹایا بلکہ جہالت کی مہر بھی ثبت کر دی۔

''بھائی صاحب مجھے بھی کالج ہی جانا ہے۔''

ہنستی مسکراتی لڑکیوں کے نقرئی قہقہوں کے درمیان صوفیہ ممنائی۔ کنڈیکٹر بس میں لڑکیاں سوار کرنے میں منہمک رہا۔ آخر کو بس کے فٹ اسٹینڈ پر اُسے جگہ مل گئی۔ بغل میں دبا بیگ، ریشمی لہراتا برقع، فٹ اسٹینڈ پر لگے ڈنڈے کو پسینے بھری ہتھیلی سے تھامے کوفت اور اذیت سے دوچار ہونا کسے کہتے ہیں۔ اس کا تجربہ آج سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔

کالج سے واپسی پر گرمی اور سیاہ ریشمی برقعے سے جلد نجات حاصل کرنے کے غرض سے تیز تیز قدم اٹھاتی وہ گھر کی جانب جارہی تھی کہ سامنے سے آتے آدمی سے ٹکرا گئی۔

''ارے ارے محترمہ آرام سے چلیں۔ یہ کیا اسکول کالج کی لڑکیوں کی طرح کودتی پھاندتی بھاگی چلی جارہی ہیں۔'' اپنی عمر سے تین گنا بڑے آدمی نے نہایت ترش لہجے میں ہاتھ سے چھوٹی ڈبل روٹی کے پیکٹ کو زمین سے اٹھاتے کہا۔

''سوری!'' ندامت سے کہتے وہ آگے بڑھی۔

اس برقعے نے تو اُسے اپنی اصل عمر سے کہیں دور جا

پھینکا تھا۔

"کوئی بات نہیں۔ دھیرے دھیرے عادی ہوجاؤ گی۔" کالج کے روانگی سے لے کر واپسی تک کا حال تفصیل سے امی کے گوش گزار کرنے کا ان کے مختصر جواب نے کبھی شکوہ نہ کرنے کا تہیہ باور کرادیا تھا۔

☆......☆......☆

"کہاں جانے کی تیاری ہورہی ہے؟" کمرے میں بسی پرفیوم کی خوشبو اور کامدانی دوپٹہ اوڑھے دیکھ کر صابر علی تفتیشی افسر بنے رابعہ بیگم سے مخاطب تھے۔

"کل بتایا تو تھا صوفی کی دوست کی شادی ہے۔اسے لے کر جارہی ہوں۔رقیہ گھر پر ہے۔"

"امی یہ لیجیے آپ یہ چوڑیاں پہن لیں۔" بنارسی قمیض اور چوڑی دار پاجامے میں ملبوس صوفیہ ماں کے پاس آئی۔ پلٹی ہی تھی کہ کمرے سے چبھتی آواز نے اس کے قدم کواڑ سے باہر ہی روک دیے۔

"یہ تم نے صوفیہ کو کیسا لباس پہنایا ہے؟"

"کیوں ایسا کیا ہے؟ سیدھا سادھا تو لباس ہے۔"

صابر علی کی نگاہوں میں صبح کا منظر گھوم گیا۔ جب بینک میں آئی لڑکی تنگ پاجامہ اور لمبی چاک والی قمیض اونچی ایڑھی کی سینڈل پہنے منیجر صاحب اور کیشیئر سے اٹھلا اٹھلا کر باتیں کررہی تھی۔ جبکہ کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھا ہر شخص پُرشوق نگاہوں سے اُسے تکے جارہا تھا۔اوراس کے جاتے ہی مردانگی کا ثبوت اس کے لباس کی تراش خراش اور گفتار کی صورت میں ادا کرتے رہے۔

"آئندہ صوفیہ کو تنگ موری کا جاپامہ مت پہنانا۔اور سُنو یہ نہیں ہو کہ شادی ہال میں اِدھر اُدھر منڈلاتی پھرے۔اپنے ساتھ ایک جگہ بٹھا کر رکھنا۔ ایک تو آج کل یہ مخلوط پارٹی ارینجمنٹ نے سماج کا بیڑہ غرق کرکے رکھ دیا ہے۔ اچھا بھلا مردانہ اور زنانہ علیحدہ ارینجمنٹ ہوا کرتا تھا۔ جانے کون سی بے حیائی کی ہوا چل پڑی ہے۔"

"آپ پریشان مت ہوں۔ میں ساتھ ہی رکھوں گی۔"

"یہ ابا بھی نا...... کہیں سے نہیں لگتے بینک ملازم، کسی پرچون والے کی سوچ بھی اتنی دقیانوسی نہ ہوگی جیسی ان کی ہے۔سارامزا کرکرا کردیا۔"

"کیا بات ہے۔کیوں بڑبڑا رہی ہو؟"

"کچھ نہیں امی بلکہ کچھ بھی نہیں کیونکہ کوئی فائدہ نہیں آپ سے کچھ بھی کہنے کا۔ ہم تو بنے ہی ہیں ابا کے سانچے میں ڈھلنے کے لیے۔"

☆......☆......☆

مختلف پابندیوں سے گزرتے بالآخر جگہ کی تبدیلی کا وقت آن پہنچا۔

"شادی...... مگر ابھی میرا فائنل ایئر باقی ہے۔"

"صوفی یہ تمہارے ابا کا فیصلہ ہے۔ وہ اپنی بیماری کو لے کر بہت پریشان ہیں۔ چاہتے ہیں دونوں بیٹیوں کے فرض سے جلد سبکدوش ہوجائیں۔"

ایک بار پھر ہمیشہ کی طرح احتجاج نے ابا کے حکم کے آگے ناکامی کا منہ دیکھا۔

☆......☆......☆

نکاح کے بولوں کے ساتھ ہی نام کے ساتھ لگی ولدیت کی تختی ہٹا کر شوہر نامدار کی تختی ثبت کردی گئی۔

"ارشد بیٹا آج سے میرا فرض ختم ہوا۔ اب صوفیہ تمہاری زوجیت میں ہے اور تمہاری ذمہ داری بھی اور تمہارا حق سب سے زیادہ ہے۔ صوفیہ، ارشد کو تمہاری جانب سے کوئی شکایت نہیں ہونی

چاہیے۔''

دُعا نہ پیار، رخصت ہونے سے قبل ابا اپنا آخری حکم نامہ سناتے اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہوتے باقی ماندہ زندگی کا بہی کھاتہ ارشد رضوی کے حوالے کر کے چلتے بنے۔

☆......☆......☆

نئے رشتے کو سمجھنے کا موقع بھی نہ ملا کہ شادی کے تین روز بعد ہی ہنی مون پر جانے کا شور اٹھا۔

''ہم ہنی مون پر جارہے ہیں۔ کسی شادی کی تقریب میں نہیں۔ تمہیں ذرا ڈریس اپ ہونا نہیں آتا۔''

''شادی پر امی نے یہی کپڑے دیے تھے۔''

''دیے تھے ضرور دیے تھے کیا عمر بھر انہی کپڑوں پر گزارا ہوگا۔ بھئی شادی سے قبل جو کپڑے میرا مطلب جینز ٹراؤزر وغیرہ وہ تو تمہاری امی کے گھر رکھے ہوں گے، انہیں منگوالو فون کر کے۔''

''میرے پاس تو ایسا کوئی ڈریس نہیں۔''

''اُف کیا مصیبت ہے۔ چلو جلدی کرو۔ صبح کی فلائٹ ہے۔ دو ڈریس تو لے کر آتے ہیں۔ باقی دبئی سے شاپنگ کرلیں گے۔''

''وائٹ جینز، بلیک شارٹ کُرتا پہنے، آئینے میں اپنا ہی سراپا اجنبی محسوس ہورہا تھا۔

''ویری گڈ، جلدی کرو۔''

''جی بہتر۔'' بیڈ پر پڑا سفید دوپٹہ اٹھایا۔

''یہ کیا کررہی ہو؟''

''یہ دوپٹا......''

''دماغ خراب ہے۔ اس ڈریس پر اب دوپٹا اوڑھوگی۔ میں تمہارا شوہر ہوں اور میری مرضی جیسے چاہوں اپنی بیوی کو رکھوں۔ ٹھیک اب چلو۔''

شرماتے گھبراتے ایئرپورٹ تک کا سفر طے کیا۔ ایئرپورٹ پر خفت سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ جیسے ساری دنیا کی نظروں کا محور وہی ہو۔ ذہن انتشار کی زد میں تھا۔

جب آزاد ہوا میں سانس لینے کی کوشش کی تو ابا کی قید کا گھیرا تنگ سے تنگ ہوتا گیا۔ ابا کی طرزِ زندگی پر چلتے بیس برس گزر گئے تو آزادی گھٹن کا باعث لگ رہی تھی۔

ہنی مون کے دوران ہی یہ انکشاف واضح ہوا کہ ارشد کی مرضی کے مطابق ہی اب زندگی کا سفر طے کرنا ہے۔ گویا حکمرانی کرنے والا چہرہ بدل گیا۔ حاکم اب بھی شاملِ زندگی ہے اور اپنی مرضی اپنی شخصیت کا کہیں کوئی عنصر نہیں پایا جاتا تھا۔

☆......☆......☆

زندگی نئی ڈگر پر چل پڑی تھی۔ اُسے اپنی ماں کا چولا پہنتے دیر نہ لگی۔ فرق صرف طبقات کا تھا۔

''کن سوچوں میں گم ہو؟ کوفی کا موڈ ہے، بنا کر لاؤ پھر تمہیں ایک نیوز دینی ہے۔''

''بیٹھو!'' کوفی کا کپ تھامتے اُس نے اُسے قریب بٹھایا۔ ''یار تعلیم کا مقصد ہوتا ہے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا۔ خود کو سوشل اور ایکٹو رکھنے کا۔ اس لیے میں نے تمہارے لیے جاب کا بندوبست کیا ہے۔ ملٹی نیشنل کمپنی ہے۔ ہینڈسم سیلری ہے۔ سیٹنگ بنتے ہی تمہیں ذاتی کنوینس بھی مل جائے گی۔''

''پر میرا تو کوئی ایکسپیرینس نہیں ہے جاب کا۔ جبکہ میرا ابھی فائنل ایئر باقی ہے۔''

''ہر نیا کام بغیر ایکسپیرینس کے ہی شروع ہوتا ہے۔ کام کے بعد ہی ایکسپیرینس حاصل ہوتا ہے۔ دوسرا یہ کہ تم سے کون ڈگری طلب کررہا ہے۔ تم اس بحث میں مت پڑو۔ میرا دوست اس کمپنی میں اچھی پوسٹ پر ہے۔ ساری سیٹنگ بنا دے گا۔''

☆......☆......☆

برائے نام انٹرویو کے بعد اپائنٹمنٹ لیٹر کا مل جانا کوئی حیران کن بات نہ تھی کیونکہ ارشد کے دوست نے قرعہ اس کے نام کا پہلے سے تیار رکھا تھا۔

"بہت مبارک ہو بھابی! پتا ہے اس جاب کے لیے کتنے امیدوار تھے۔"

"جی بہت شکریہ مجھے معلوم ہے یہ آپ......"

"ارے چھوڑیں شکریہ وکریہ کو، یہ بتائیں آپ اس ویک اینڈ کو فارغ ہیں؟"

"کیوں؟"

"آپ لوگوں کو ڈنر پرائیوٹ کرنا ہے۔ جاب کی خوشی میں سیلیبریشن تو ہونا چاہیے۔"

"اِس کی ضرورت نہیں۔ بہت مہربانی۔"

"بھئی سیلری ملنے پر آپ کی طرف دعوت ہوگی۔"

☆......☆......☆

"ارے صوفی تم کو آخر کب عقل آئے گی۔ تمہیں معلوم ہے وہ کس پوسٹ پر بیٹھا ہے۔ تم نے روڈلی اس کی دعوت کو ریفیوز کر دیا۔ ملنے ملانے سے ہی پی آر بنتی ہے۔ تمہارا کانفیڈینس لیول بہت ڈل ہے۔ اُسے بحال کرو۔ اب مجھے ہی اُسے فون کر کے دعوت دینی ہوگی۔"

☆......☆......☆

طبقاتی فرق کی وجہ سے اُسے ہر قدم پر ایک نئے تجربے سے گزرنا پڑ رہا تھا۔ محض چند دنوں کی آزمائش سے گزرتے اُس نے نئی روٹین کی عادت بھی ڈال ہی لی۔ پُرکشش تنخواہ کے ساتھ ذاتی کنوینس بھی ارشد کے دوست کی مرہون منت تھی۔ جاب کے تقاضے کے مطابق دل کو مار کر ہونٹوں پر مسکراہٹ زندہ رکھنا، پھر گھر آ کر وہی مسکراہٹ شوہر نامدار کے لیے برقرار رکھنا گویا چاکری کے لیے ہر دم خود کو تیار رکھنا۔

پر اس کی خود کی مرضی کیا ہے؟

ہش! اس بات کو سوچنے سے قبل ذہن جھٹک دینا ورنہ بغاوت کا جرم عائد کرتے دیر نہ لگے گی......

☆......☆......☆

زندگی مشینی انداز لیے چل رہی تھی۔ ہفتے کی دو چھٹیاں بھی پارٹیوں اور فنکشن کی نظر ہو جاتیں۔ وقت کے ساتھ سوشل اسٹیٹس بھی بڑھ گیا اور اسی اسٹیٹس نے صوفیہ کو ماں بننے کے شرف سے پانچ سال دور رکھا تھا۔

☆......☆......☆

کتنا خوبصورت احساس ہے۔

بچے کے ننھے وجود کو سہلاتے پہلی بار زندگی خوبصورت لگ رہی تھی۔

"ہیلو صوفی کیسی ہو؟ سوری تھوڑی دیر ہوگئی۔ ڈسچارج شیٹ کے ساتھ گورنس کا بھی ارینجمنٹ کرنا تھا۔"

"گورنس وہ کس لیے؟"

"ظاہر ہے اپنے برخوردار کے لیے۔"

"پر یہ ذمہ داری تو میری ہے بھلا گورنس......"

"ہاں تمہاری ذمہ داری تو ہوگی کہ وہ بچے کو ٹھیک طرح کیئر کر رہی ہے یا نہیں۔ اسے ضروری ہدایات وغیرہ دینا۔ آفس سے لی گئی چھٹیوں کے ختم ہونے کے بعد تمہاری اپنی روٹین شروع ہوگی۔ اب پرانے وقت کے لوگوں کی طرح بیٹھ کر بچے کو ننھیال، ددھیال تو نہیں پال سکتے نا۔ ویسے بھی امی بھیا کے پاس دبئی میں ہیں۔ تمہارے پیرنٹس کی اپنی ذمہ داریاں ہیں۔"

اتنی لمبی چوڑی تقریر سننے کے بعد مزاحمت کے بجائے مصالحت کو اپنانا ہی عقلمندی کا تقاضا تھا۔

☆......☆......☆

دن اور رات اپنے وقت پر تیرتے، سالوں کی

شکل اختیار کرتے دو سالوں پر محیط ہو چلے تھے۔
ہر سال اسد کی سالگرہ کی تقریب دھوم دھام سے منا کر ارشد باپ ہونے کا اظہار کرتا۔ تقریب تعلقات وسیع کرنے کا بہترین ذریعہ ثابت ہوتی۔ جوں جوں اسد کی عمر کا قد بڑھتا گیا۔ بینک بیلنس اور اسٹیٹس میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔
اسد کی دنیا ماں باپ کی بنائی دنیا سے قدرے مختلف تھی۔ وہ اپنی زندگی اپنے ڈھنگ سے جینے کا عادی تھا اور اسی انداز نے ارشد اور اس کے درمیان خلیج کھینچ دی تھی۔ اور تناؤ اس وقت بڑھ گیا جب ارشد اسد کو اسٹڈی کے لیے U.K بھیجنے پر بضد تھا۔ جبکہ اپنے ہی ملک میں اسٹڈی کو ترجیح دیتے ہوئے اسد اس کمرے سے نکل گیا۔
''کچھ بھی ہو، کیسے بھی ہو، میں اپنی بات منوا کر رہوں گا۔ تم دیکھنا میں اسے U.K بھیج کر ہی دم لوں گا۔ ہمارے سرکل کے تمام لوگوں کے بچے یورپ کی یونیورسٹیوں میں پڑھ رہے ہیں اور یہ......''
''یہ ابنِ آدم ہے۔ بنتِ حوا نہیں جسے ابنِ آدم اپنی مرضی کے مطابق سانچے میں ڈھال سکے۔''
''صوفی تم پلیز مجھے اکیلا چھوڑ دو۔''
''رزلٹ آنے تک خاموشی بہتر ہے۔ بعد میں کچھ کرنا ہوگا۔ فی الحال تو الیکشن پر نظر رکھنی ہوگی۔ کتنی تگ و دو کے بعد مہربانوں نے صوبائی اسمبلی کا ٹکٹ دلایا ہے۔''
صوبائی اسمبلی، سیٹ، اختیارات ان تمام باتوں کے تصور نے کچھ لمحے پہلے کی کوفت اور تلخی کے اثر کو زائل کر دیا۔

☆......☆......☆

الیکشن کی گہما گہمی اور اسد کی لاتعلقی دونوں عروج پر تھیں۔
حامیوں کے مکمل تعاون کے ساتھ اپنے حلقے سے بھاری اکثریت سے جیت حاصل ہوئی پر زندگی کے ہاتھوں شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔
میت کے ساتھ مختلف چینلز سے لے کر اخباری رپورٹرز اور دوسری پارٹیوں کے رہنماؤں کا تانتا بندھ گیا۔
کیا خواہشیں یوں بھی پوری ہوتی ہیں۔
ساری زندگی ارشد نے تعلقات اور نام کمانے میں گزار دی۔ اب اس جہاں سے کوچ کے بعد بھی اس کا بے جان وجود پبلسٹی کا باعث بنا ہوا تھا۔
سوگ کی حالت میں صوفیہ سوچوں کے بھنور میں گم تھی۔

☆......☆......☆

''ماما یہ مریم ہے۔ آپ سے ملنے آئی ہے۔''
سوئم پر آئے لوگوں کے رخصت ہوتے ہی اسد صوفیہ کے پاس ایک اجنبی لڑکی کو ملوانے کمرے میں لایا۔ رسمی سلام دعا کے بعد صوفیہ خاموش ہوگئی۔ جبکہ لڑکی امارت اور صوفیہ کی شخصیت کے زیر اثر خود کو کافی نروس محسوس کر رہی تھی۔
اردگرد کا جائزہ لینے کے تھوڑی دیر بعد ہی وہ رخصت لیتی کمرے سے چلی گئی۔
''ممی مجھے آپ کے رویے کی وجہ سے آج بڑی شرمندگی اٹھانی پڑی۔'' ڈنر کرتے اسد کا شکوہ اُسے اچنبھے میں ڈال گیا۔
''کون سا رویہ؟''
''میں مریم کے ساتھ آپ کے رویے کا ذکر کر رہا ہوں۔ اپنے سرکل کے لوگوں کے ساتھ تو آپ کا بی ہیویئر کافی بہتر ہوتا ہے۔''
''پر میری تو اُس لڑکی سے کوئی ایسی بات ہی نہیں ہوئی کہ وہ......''
''جی اسی بات کا ذکر کر رہا ہوں۔ ٹھیک ہے وہ ہمارے اسٹیٹس سے میچ نہیں کرتی پر اس کا ہرگز یہ

مطلب نہیں کہ...... کتنے احساس کے ساتھ آپ کو پُرسہ دینے آئی تھی، پر کتنی مایوس ہو کر گئی ہے۔''

''سوری بیٹا ایکچولی میری کنڈیشن ایسی تھی کہ...... پھر میری اُس سے پہلی ملاقات تھی اب......''

''او کے گڈ نائٹ، مجھے نیند آ رہی ہے۔''

یہ کیا ہوا؟ تین دنوں سے اسد بے زاریت لیے تعزیت کرنے والوں سے پُرسہ وصول رہا تھا۔ پر آج ایک اجنبی لڑکی کے لیے غم میں مبتلا ہوتے وہ ماں سے اُلجھ بیٹھا۔

ارشد کی موت کے پانچ ماہ بعد ہی ارشد کے قریبی حلقہ احباب نے اُسے مشوروں اور خدمات لیے آمد و رفت شروع کر دی۔

''ماما میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔ آپ مریم کے گھر جا کر میرا رشتہ مانگیں۔''

''ٹھیک ہے بیٹا چلی جاؤں گی۔''

☆......☆......☆

صوفیہ تیار کھڑی ڈرائیور سے گاڑی نکالنے کا کہہ کر ملازم کو ہدایت دینے میں مصروف تھی۔

''کہاں کی تیاری ہے ماما؟''

''مریم کے گھر، ایڈریس ڈرائیور کو دے دو۔''

''ممی میں نے آپ کو بتایا تھا وہ لوگ مڈل کلاس سے تعلق رکھتے ہیں آپ اتنی قیمتی ساڑی میں جائیں گی۔ بلاوجہ اُن لوگوں کو کامپلیکس ہوگا۔ آپ پلیز کوئی سمپل ڈریس......''

صوفیہ ادھوری بات کے ساتھ ہی اپنے کمرے میں چلی آئی۔ کمرے میں لگے آئینے کے سامنے اپنے وجود پر لپٹی شیفون کی لیمن کلر کی سمپل ساڑی کو دیکھنے لگی۔ کہیں بھی کوئی کمی نظر نہ آئی۔

اسد نے دوسری بار مریم کی وجہ سے اُسے زچ کیا تھا۔ ورنہ تو......

سوچنے کے عمل کو روکتے وہ سفید لون کے ڈریس کو پہن کر گاڑی میں جا بیٹھی۔

☆......☆......☆

مریم کے گھر جانے سے قبل اور وہاں سے آنے کے بعد دونوں صورتوں میں ذہن کافی تھک سا گیا تھا۔ کافی کا سپ لیتے اسد کی آئندہ زندگی کے بارے میں وہ سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اچانک اسد کی کمرے میں آمد ہوئی۔

''ممی آپ کو کیا پرابلم ہے؟''

''ایزی بیٹا! کیا بات ہے۔ کیوں اتنے ہائپر ہو رہے ہو۔ یہاں بیٹھو میرے پاس۔''

''ہائپر نہ ہوں تو کیا ہوں۔ آپ نے مریم کے پیرنٹس سے یہ کیوں کہا کہ مریم ہمارے گھر آ چکی ہے۔ ان کے گھرانے میں لڑکیاں صرف ایجوکیشن کے لیے نکلتی ہیں۔ کہیں آنے جانے کی فیملی کے بغیر اجازت نہیں۔ وہ تو میری وجہ سے آ گئی تھی۔ سارا امیج خراب ہو گیا اس کا اس کے گھر پر۔''

''میں نے صرف یہ کہا تھا مریم جب پرسہ دینے آئی تھی تو مجھے اچھی لگی اس لیے میں پروپوزل لے آئی۔ کوئی جواز تو ہونا چاہیے تھا نا رشتہ مانگنے کا۔ ورنہ وہ یہ نہ پوچھتے کہ کس کے تھرو میں یہ رشتہ مانگنے گئی۔''

''اور آپ نے اپنی سوشل ایکٹویٹی بھی ڈسکس کر ڈالی۔ کیا ضرورت تھی شو آف کرنے کی۔ آپ رشتہ مانگنے گئی تھیں کہ ان لوگوں کو انڈر اسٹیمیٹ کرنے۔''

''ایسی کوئی بات نہیں اور میں انسان کی سیلف ریسپیکٹ کو بخوبی......''

''ماما مجھے ہر صورت مریم سے شادی کرنی ہے۔ آپ اُن لوگوں کو کنوینس کریں اور بار بار جائیں تاکہ یہ شادی راضی خوشی انجام پا جائے۔''

صوفیہ حیران نگاہوں سے اسد کے لب و لہجے

سات نئے عجوبے

قدیم زمانے سے دنیا میں سات عجوبے چلے آرہے ہیں۔ حال ہی میں دنیا کے سات نئے عجوبے بھی سامنے آئے ہیں۔ ان نئے عجائبات کا اعلان سال 2007ء میں کیا گیا تھا۔ اس کے لئے دنیا بھر کے عوام سے رائے لی گئی تھی کہ ان کے خیال میں کون کون سی نئی چیزیں عجائبات میں شامل ہو چکی ہیں۔ نئے عجائبات کے انتخابات کا ادارہ سوئزرلینڈ کی ایک نجی تنظیم ''دی نیو سیون ونڈرز فاؤنڈیشن'' نے کیا تھا۔ ان سات نئے عجائبات کو متعارف کروانے کے لئے دنیا کی اکیس اہم تنصیبات کو منتخب کیا گیا۔ ان اکیس عمارتوں میں روم کلوسیم، اردن کا قدیم شہر پیٹرا، برطانیہ کا ستون ہنج وار دیوار چین کے علاوہ پیرس کا ایفل ٹاور نیویارک کا مجسمہ آزادی اور سڈنی کا اوپرا ہاؤس شامل تھے۔ سبھی انسانوں ہاتھ سے بنائے گئے ہوں اور 2000ء تک مکمل ہو چکے ہوں اور موجودہ وقت میں قابل قبول حالت میں ہو سوئس تنظیم ارکان میں اقوام متحدہ کے ادارہ برائے ثقافت یونیسکو کے سابق سربراہ بھی شامل تھے جو نئے سات عجائبات قرار پائے ہیں وہ یہ ہیں۔ (1) دیوار چین (2) اہرام مصر (3) میکسیکو کے آثار (4) حضرت مسیح کا مجسمہ واقع برازیل (5) اٹلی کا کلوسیم (6) ماچو پیچو (7) پیٹرا اردن۔

اور لفظوں کے اُتار چڑھاؤ کو تکنے لگی۔

یہ اسد کا چہرہ نہیں، ابا، ہاں ابا کا ہے۔

پھر ابا کا چہرہ ارشد کے چہرے میں گم ہو گیا اور لمحہ نہ گزرا تھا کہ ارشد کی صورت اختیار کر گیا۔

ایک بار پھر سارے چہرے اُبھرتے ڈوبتے اپنی مرضی اسی پر مسلط کرتے رعونیت بکھیرتے اپنا حکم صادر کر رہے تھے۔

اسد کب کا اس کے کمرے سے جا چکا تھا۔ جبکہ وہ حاکموں کا پزل بناتے شدید ڈپریشن کی حالت میں سائیکاٹرسٹ کے پاس جا پہنچی۔

کچھ دنوں کے ٹریٹمنٹ کے بعد ایک نئے ارادے اور عزم کے ساتھ زندگی کی طرف لوٹ آئی۔ اور اس عزم کے ساتھ ہی ایک ادارے ''فیمیل رائٹس'' کی داغ بیل ڈالی۔ جہاں ان خواتین کو ٹریننگ دی جانے لگی جو اپنی مرضی کی فیلڈ اختیار کرنے سے زندگی میں قاصر رہیں۔ جنہیں رشتوں نے اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھالا۔ جبکہ ان کے ایثار اور قربانی کے عوض انہیں دکھ اور پریشانی کا منہ دیکھنا پڑا۔

☆......☆......☆

''ممی آپ ان خواتین کا درد بانٹنے نکلی ہیں جن سے آپ کا کوئی رشتہ نہیں۔ اور میں آپ کی اولاد، اس کا کوئی خیال نہیں۔ جسے آپ کی ضرورت ہے۔ اس کا رشتہ طے کرنے کے لیے مریم......''

''اسد تمہیں میری نہیں مریم کی ضرورت ہے۔ اس لڑکی کی جو بلا جواز میرے ہر اقدام کی غلط تصویر تمہیں دکھا کر مجھ سے تمہیں بدگمان اور دور کر رہی ہے۔ اور تم اس کے دماغ سے چل کر مجھے مریم کے تیار کردہ ایک نئے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش میں لگے ہو۔ پر سوری بیٹا اب میں کسی کے بنائے سانچے میں ڈھلنا نہیں چاہتی۔''

☆......☆......☆

زندگی کا فلسفہ کیا ہے؟

اُسے سمجھنے سے ہمیشہ قاصر رہی پر گزرتے وقت

نے اتنا ضرور سمجھا دیا کہ ہر وہ راستہ جو کسی کی بھلائی اور نیکی لیے ہو سب سے بہترین راہ گزر ہے۔

"میڈم وہ چینل کی طرف سے زوبیا خان آئی ہیں۔ وہ جو ٹیلی ویژن پر آتی ہیں شو کرنے۔" ملازمہ بڑی پُر جوش ہوتے اطلاع دے رہی تھی۔

سوچ کے سفر نے واپسی کی راہ لی۔

"ٹھیک ہے بلاؤ۔" یہ کہتے وہ ایزی چیئر سے اٹھی اور کھڑکی میں لگے بلائنڈ کرٹن کو کھول دیا۔

کمرے میں آتی پگھلتی دھوپ کو روک کر نیم تاریکی میں تبدیل کرتے پانی کا گلاس تھامے وہ دیوار سے لگے صوفے پر جا بیٹھی۔

مارننگ شو کی ہوسٹ اپنا روایتی انداز لیے داخل ہوئی۔ رسمی گفتگو اور ادارے کی بڑھتی مقبولیت اور اس کی خدمات کو سراہتے ہوئے اپنے چینل پر آنے کی دعوت دی۔

"شکریہ پر اس سے قبل بھی کئی چینل سے مجھے شرکت کی دعوت دی گئی ہے پر میرے مشن میں ایسا کوئی پہلو نہیں۔ جس میں میری خودنمائی شامل ہو۔"

"شاید آپ کو اندازہ نہیں آپ کے اس اقدام سے ان خواتین کے لیے آسانی پیدا ہوگی۔ جو دور دراز علاقوں میں بیٹھی ہیں۔ آپ کے میسج مورل سپورٹ دے سکتے ہیں۔"

لفظوں کی تکرار کے بعد آخر چینل کی ہوسٹ اپنے اگلے پروگرام کے لیے اس کی آمد کی رضامندی لیتے رخصت ہوئی۔

☆......☆......☆

شہر کی پُرانی بلڈنگ میں نئے چینل کا عملہ اپنے اپنے کام میں سرگرم ہوتا، چینل کا جلد ترقی اور مقبولیت کا خواہاں نظر آ رہا تھا۔ اس کی آمد کو خصوصی اہمیت دیتے ہوئے مارننگ شو کے سیٹ پر پہنچا دیا گیا۔

پروگرام کی ہوسٹ نے ضروری اور غیر ضروری باتوں سے گزرتے پروگرام کے اختتام سے قبل میسج دینے کو کہا۔

"میسج صرف یہی ہے کہ عورت بھی انسان ہے۔ وہ کمہار کی مٹی نہیں جسے رشتوں سے جڑا کمہار اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھالتا رہے۔ ہاں ان کی عزت اور وقار کا خیال ضرور رکھنا چاہیے۔ ان کے پیٹ کا ایندھن بھرنے کا خیال رکھے اور جو شادی شدہ ہیں وہ ان لوازمات کے ساتھ اُن کی عزتِ نفس کا بھی خیال رکھیں۔ پر اپنی شناخت کبھی نہیں بھولنی چاہیے۔ جب شناخت ہی نہ رہے تو آپ خود سمجھ سکتی ہیں ان کا کیا مقام رہ جاتا ہے۔"

پروگرام نشر ہوتے ہی کافی مقبولیت حاصل کر گیا۔

☆......☆......☆

ایک کے بعد ایک چینل میگزین اس کے گرد حصار بناتے چلے گئے۔

صوفیہ کا ہر میسج خواتین کی بیداری لیے ہوتا۔ جو نئی اُمنگ جگاتا، جس چینل پر صوفیہ کی آمد ہوتی خواتین کی نگاہیں پروگرام کی ہوسٹ کے لباس اور جیولری سے ہٹ کر صوفیہ کی باتوں پر مرکوز ہوتیں۔

"ایک تو میں اس صوفیہ نامی بلا سے تنگ آ گیا ہوں۔ ہر چینل پر چلی آتی ہے۔ بکواس کرتی ہے۔ لاؤ ریموٹ دو۔ مجھے نیوز دیکھنی ہے۔ جاؤ تم میرے لیے چائے لاؤ۔" شکیل مرزا نے پروگرام دیکھتی اپنی بیوی کے ہاتھ سے ریموٹ لیتے چینل بدل دیا۔

"بس یہی پرابلم ہے آپ مردوں کی۔ ایک پروگرام تک دیکھنے نہیں دیتے۔ ٹھیک کہتی ہے صوفیہ، عورت کو اپنی ہستی کبھی نہیں بھولنی چاہیے۔"

دروازے پر دستک ہوئی تھی۔

"یس کم اِن۔" ملازم کے آتے ہی تکرار کو بریک لگ گیا۔

"صاحب آپ کے دوست آئے ہیں، انور

صاحب۔ ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا ہے۔'' وہ ڈرائنگ روم میں دوست سے ملنے چلے گئے۔

''کیا بات ہے؟ کیا بھابی سے کوئی جھگڑا ہوا ہے جو یوں......''

''کچھ نہیں یار ایک تو یہ چینل والوں کی سمجھ نہیں آتی۔ اچھا خاصا فیشن اور حماقت سے بھرے پروگرام چلا رہے تھے۔ جن سے مستفید ہوکر ہماری خواتین رسومات اور حماقت کی چوٹی کو سر کر رہی تھیں۔ جس سے ہمارے انائیت بھی بڑھ گئی تھی۔ پر جب سے یہ محترمہ صوفیہ کو ہر چینل پر لا کر بٹھانا شروع کیا ہے، ہماری عورتوں کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ اپنی خواہشات اور انائیت کا بھوت سوار ہوگیا ہے۔''

☆☆......☆☆

ہمارے مذہب نے عورتوں کو بہت حقوق سے نوازا ہے۔ پر افسوس کے ہمارا معاشرہ اس کے حقوق سلب کرنے پر تلا ہوا ہے۔''

پروگرام کے آن ایئر جاتے ہی چینل کو اور صوفیہ کو دھمکی آمیز کال موصول ہونے لگیں۔

''یہ کس بدبخت کو تم لوگوں نے چینل پر لا بٹھایا ہے۔ یہ اسلام کیا جانے؟ ساری زندگی غیر مردوں کے ساتھ نوکری کرتی رہی۔ پارٹیاں مناتی رہی۔ اب جو گھر بیٹھی عورتیں ہیں ان کو گمراہ کرنے نکلی ہے۔''

''ہیلو ہیلو آپ کون؟''

رابطہ منقطع ہوچکا تھا۔ افراتفری کی لہر دوڑ گئی۔

''دیکھیں مسٹر آپ جو کوئی بھی ہوں میں دھمکیوں سے ڈرنے والی نہیں۔ میں اپنا ادارہ ہرگز بند نہیں کروں۔ میرے ارادے مستحکم ہیں جبکہ آپ کی دھمکیاں بے بنیاد......''

☆☆......☆☆

''ارے بھئی زویا کہاں ہو بھئی؟ وہ تمہاری سہیلی صوفیہ کا مرڈر ہوگیا۔''

''ہائے کیسے۔'' اُس نے لاؤنج میں لگے ٹیلی ویژن پر نظریں مرکوز کردیں۔

جہاں سلائیڈ چل رہی تھی کہ ''فیمیل رائٹس'' کی فاؤنڈر صوفیہ انصاری نامعلوم افراد کی گولیوں کا نشانہ بنتے زندگی ہار بیٹھی۔''

عورتوں کو ان کے حقوق کے لیے بیدار کرنے والی کو موت کی نیند سُلانے والے سکون سے اپنی انائیت کے ساتھ جی رہے ہیں۔''

''آخر یہ کب تک ہوتا رہے گا۔''

چینل پر بیٹھی اینکر اپنی دھواں دھار بحث کرتی نظر آرہی تھی۔ جبکہ اسکرین کے کونے پر صوفیہ کی تصویر، زندگی جینے اور موت کی وادی تک دھکیلنے پر معاشرے کے کمہار سے شکوہ کناں تھی۔

☆☆......☆☆

رحمٰن، رحیم، سدا سائیں

عبدالہادی نے اچنبھے میں گھر کر یہ منظر ملاحظہ کیا تھا۔ اس کے لیے تو یہ ہی بہت بڑا معجزہ تھا کہ علیزے نے خود کال کر کے اسے بلوایا تھا۔ اس وقت وہ جامعہ میں تھا اور بچوں کو درس دے رہا تھا۔ اس کے بعد ہی باقاعدہ کلاس لگتی تھی۔ مگر وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ......

زندگی کے ساتھ سفر کرتے کرداروں کی فسوں گری، ایمان افروز ناول کا ساتواں حصہ

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

بیک وقت حال و ماضی کے دریچوں سے جھانکنے والی یہ کہانی دیا سے شروع ہوتی ہے۔ جسے مرتد ہونے کا پچھتاوا، ملال، رنج، دکھ اور کرب کا احساس دل و دماغ کو شل کرتا محسوس ہوتا ہے۔ جو رب کو ناراض کر کے وحشتوں میں مبتلا ہے۔ گندگی اور پلیدگی کا احساس اتنا شدید ہے کہ وہ رب کے حضور سجدہ ریز ہونے میں مانع رکھتا ہے۔ مایوسی اس کی اتنی گہری ہے کہ رب جو رحمٰن و رحیم ہے، جس کا پہلا تعارف ہی یہی ہے۔ اسے یہی بنیادی بات بھلائے ہوئے ہے۔ دیا جو درحقیقت علیزے ہے اور اسلام آباد چاچا کے ہاں میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے مکین ہے۔ یوسف کرسچن نوجوان جو اپنی خوبروئی کی بدولت بہت سی لڑکیوں کو استعمال کر چکا ہے۔ علیزے پر بھی جال پھینکتا ہے۔ علیزے جو دیا بن کر اس سے ملتی ہے اور پہلی ملاقات سے ہی یوسف سے متاثر ہو چکی ہے۔

یہ ملاقاتیں چونکہ غلط انداز میں ہو رہی ہیں۔ جبھی غلط نتائج مرتب کرتی ہیں۔ یوسف ہر ملاقات میں ہر حد پار کرتا ہے علیزے اسے روک نہیں پاتی مگر یہ انکشاف اس پر بجلی بن کر گرتا ہے کہ یوسف مسلمان نہیں ہے۔ دنیا میں آنے والے اپنے ناجائز بچے کو باپ کا نام اور شناخت دینے کو علیزے یوسف کے مجبور کرنے پر اپنا مذہب نا چاہتے ہوئے بھی چھوڑ کر عیسائیت اختیار کرتی ہے مگر ضمیر کی بے چینی اسے زیادہ دیر اس پر قائم نہیں رہنے دیتی۔ وہ عیسائیت اور یوسف دونوں کو چھوڑ کر رب کی ناراضگی کے احساس سمیت نیم دیوانی ہوتی سرگرداں ہے۔ سالہا سال گزرنے پر اس کا پھر سے بریرہ سے ٹکراؤ ہوتا ہے جو خیالات کی چکی میں پس کر خود بھی سراپا تغیر کی زد میں ہے۔ علیزے کی واپسی کی خواہاں ہے اور علیزے کی مایوسی اور اس کی بے اعتباری کو اُمید میں بدلنا چاہتی ہے۔ مگر یہ اتنا آسان نہیں۔

علیزے اور بریرہ جن کا تعلق ایک مذہبی گھرانے سے ہے۔ بریرہ علیزے کی بڑی بہن مذہب کے معاملے میں بہت شدت پسندانہ رویہ رکھتی تھی۔ اتنا شدت پسندانہ کہ اس کے اس رویے سے اکثر اس سے وابستہ رشتوں کو تکلیف سے دوچار ہونا پڑا۔ خاص کر علیزے...... جس پر علیزے کی بڑی بہن ہونے کے ناتے پوری اجارہ داری ہے۔ عبدالغنی ان کا بڑا بھائی ہے۔ بریرہ سے بالکل متضاد صرف پرہیزگار نہیں عاجزی و انکساری جس کے ہر انداز سے جھلکتی ہے اور اسیر کرتی ہے۔ درپردہ بریرہ اپنے بھائی سے بھی خائف ہے۔ وہ صحیح معنوں میں پرہیزگاری و نیکی میں خود سے آگے کسی کو دیکھنا پسند نہیں کرتی۔ ہارون اسرار شوبز کی دنیا میں بے حد حسین اور معروف شخصیت کے طور پر جانا جاتا ہے۔ گھر کی دینی محفل میں وہ بریرہ کی پہلے آواز اور پھر حسن کا اسیر ہو کر
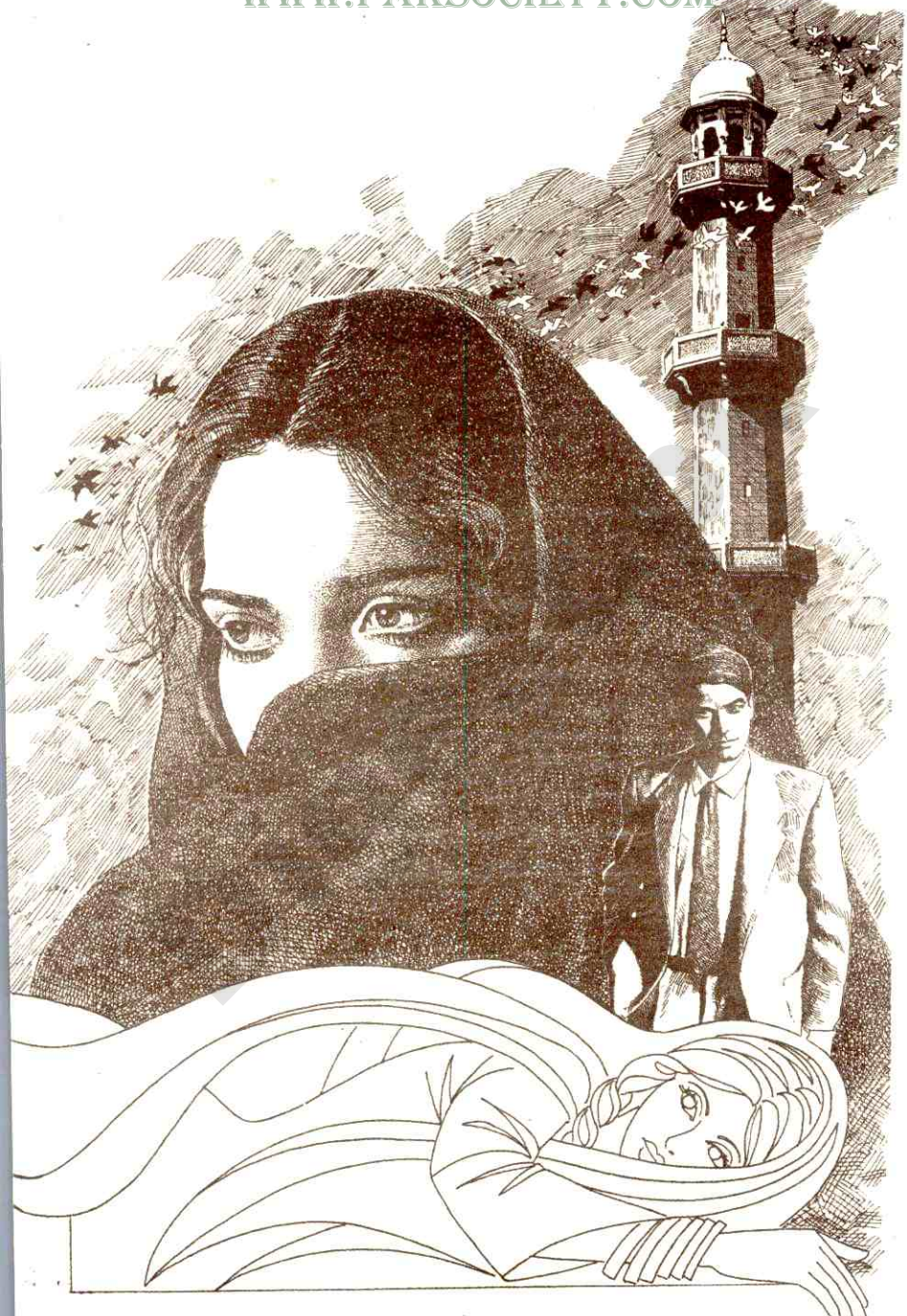
اس سے شادی کا خواہاں ہے۔ مگر بریرہ ایک گمراہ انسان سے شادی پر ہرگز آمادہ نہیں۔ ہارون اس کے انکار پر اس سے بات کرنے خود ان کے ہاں آتا ہے اور شوبز تک چھوڑنے پر آمادگی کا اظہار کرتے ہوئے اسے رضا مند کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہیں اس موقع پر اس کی پہلی ملاقات عبدالغنی سے ہوتی ہے۔ ہارون اسرار کسی بھی صورت عبدالغنی کو اس رشتہ پر رضامندی پر التجا کرتا ہے۔ عبدالغنی سے تعاون کا یقین پا کر وہ مطمئن ہے۔ اسے عبدالغنی کی باوقار اور شاندار شخصیت بہت بھاتی ہے۔ محلے کا اوباش لڑکا علیزے میں دلچسپی ظاہر کرتا ہے۔ جس کا علم بریرہ کو ہونے پر بریرہ علیزے کی کردار کشی کرتی ہے۔ علیزے اس الزام پر سوائے دل برداشتہ ہونے کے اور کوئی صفائی پیش کرنے سے لاچار ہے۔

اسامہ ہارون اسرار کا چھوٹا بھائی حادثے میں اپنی ٹانگیں گنوا چکا ہے۔ ہارون کی ممی اپنی یتیم بھتیجی سارہ سے زبردستی اس کا نکاح کراتی ہیں۔ جس کے لیے اسامہ ہرگز راضی نہیں اور نہ ہی سارہ کو اس کے حقوق دینے پر آمادہ ہے۔ لیکن دھیرے دھیرے سارہ کی اچھائی کی وجہ سے وہ اس کا اسیر ہونے لگتا ہے اور بالآخر اس کے ساتھ ایک خوشگوار زندگی کا آغاز کرتا ہے۔ لاریب ہارون کی چھوٹی بہن جو بہت لاابالی نظر آتی ہے۔ ہارون کے ہمراہ کالج واپسی پر پہلی بار عبدالغنی کو دیکھ کر اس کی شخصیت کے سحر میں خود کو جکڑا محسوس کرنے لگتی ہے۔ لاریب کی دلچسپی عبدالغنی کی ذات میں بڑھتی ہے۔ جسے بریرہ اپنی منگنی کی تقریب میں خصوصاً محسوس کر جاتی ہے۔ لاریب محبت کی راہوں کی تنہا مسافر ہے۔ عبدالغنی انجان بھی ہے اور لاتعلق بھی۔ لاریب کے لیے یہ بات بہت تکلیف کا باعث ہے کہ وہ کبھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرے گا۔ علیزے لاریب کی ہم عمر ہے۔ دونوں میں دوستی بھی بہت ہو چکی ہے۔ وہ لاریب کی اپنے بھائی میں دلچسپی کی بھی گواہ ہے مگر وہ لاریب کی طرح ہرگز مایوس نہیں ہے۔

شادی کے موقع پر بریرہ کا رویہ ہارون کے ساتھ بھی بہت لیا دیا اور سرد مہری نہیں حاکمیت آمیز بھی ہے۔

اسے ہارون کے ہر اقدام پر اعتراض ہے۔ وہ اس پر ہر قسم کی پابندیاں عائد کرنے میں خود کو حق بجانب سمجھتی ہے اور اس کی ساتھی اداکارہ سوہا کی ہارون سے بے تکلفی اسے سخت گراں گزرتی ہے۔ ممی کو اپنی بیٹی کا عبدالغنی جیسے نوجوان میں دلچسپی لینا ایک آنکھ نہیں بھاتا جبھی ایک معمولی بات پر وہ لاریب کے سامنے عبدالغنی کی بے حد تحقیر کرتی ہیں۔ اس سے پہلے وہ لاریب کو بھی جتلا چکی ہوتی ہیں کہ وہ ایسے خواب دیکھنا چھوڑ دے۔ لاریب کو عبدالغنی سے روا رکھا جانے والا ممی کا رویہ بغاوت پر ابھارتا ہے۔ وہ تمام لحاظ بھلائے جواب تک اس کے قدموں کو اس راہ پر آگے بڑھنے سے روکے تھے اپنا گھر چھوڑ کر عبدالغنی کے پاس آ کر عبدالغنی سے خود کو اپنانے کی گزارش کرتی ہے۔ عبدالغنی اس کی جذباتی کیفیت کو سمجھتے ہوئے اسے بہلا، سمجھا کر واپس بھیجتا ہے۔ مگر لاریب اس مصالحانہ عمل کو سمجھے بغیر اسے اپنی ریجیکشن اور تذلیل سمجھتے ہوئے شدید ہیجان میں مبتلا ایکسیڈنٹ کروا بیٹھتی ہے۔ ممی اس کی حالت پر ہراساں جبکہ لاریب اسی ہسٹریائی کیفیت میں مبتلا عبدالغنی کے حوالے سے اپنی ہر شدت اور شدت پسندانہ بے بسی ان کے سامنے عیاں کر جاتی ہے۔ ممی جو بریرہ کے حاکمانہ رویے اور ناشکرانہ انداز کی بدولت سخت دل برداشتہ ہیں اور اپنی بیٹی کو اس کے بھائی کے حوالے کرنے میں شامل ہیں۔ لاریب کی خوشی کی خاطر اس شادی پر بالآخر آمادہ ہونے پر ایک بار پھر مجبور ہو جاتی ہیں۔ لاریب کی دائمی مسکراہٹ کی چاہ انہیں عبدالغنی کے سامنے ہاتھ پھیلانے پر مجبور کرتی ہے۔

بریرہ لاریب کو ناپسند کرتی ہے۔ جبھی اسے یہ اقدام ہرگز پسند نہیں آتا مگر وہ شادی کو روکنے سے قاصر ہے۔ لاریب عبدالغنی جیسے منکسر المزاج بندے کی قربتوں میں جتنا سنورتی ہے۔ ہارون بریرہ کے حوالے سے اسی قدر اذیتوں کا شکار ہے۔ لیکن اس وقت تنہا ہوتی ہے۔ جب وہ علیزے کے حوالے سے اس پر الزام عائد کرتی ہے۔ صرف ہارون نہیں...... اس سطحی حرکت کے بعد علیزے بھی بریرہ سے نفرت پہ مجبور ہو جاتی ہے۔ وقت کچھ اور آگے سرکتا ہے۔ بریرہ کے دل شکن رویے کے باوجود ہارون اس کی توجہ کا منتظر بار بار اس کی طرف پیش رفت کرتا ہے۔ اس خواہش کے ساتھ کہ وہ بھی لاریب کی طرح سدھار کا متمنی ہے۔ مگر بریرہ جو علیزے کی بے راہ روی کا باعث خود کو گردانتی ہے اور احساسِ جرم میں مبتلا رب کو منانے ہر صورت علیزے کی واپسی کی ملتمس ہے۔ ہارون کے ہر احساس سے گویا بے نیاز ہو چکی ہے۔ ہارون اس بے نیازی کو لاتعلقی اور بے گانگی سے تعبیر کرتے ہوئے مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں اترتا نا صرف شوبز کی دنیا میں دوبارہ داخل ہوتا ہے بلکہ ضد میں آ کر بریرہ کو جھنجوڑنے کی خاطر سوہا سے شادی بھی کر لیتا ہے۔ علیزے کے حوالے سے بالآخر بریرہ کی دعائیں مستجاب ہوتی ہیں۔ لیکن تب تک ہارون کے حوالے سے گہرا نقصان اس کی جھولی میں آن گرا ہوتا ہے۔

علیزے کی واپسی کے بعد عبدالغنی سمیت اس کے والدین بھی علیزے کے رشتے کے لیے پریشان ہیں۔ علیزے قرآن پاک کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد خود بھی یہ علم بانٹ رہی ہے۔ عبدالہادی اپنے روحانی استاد کے زیرِ تربیت ایک کامل مومن کی شکل میں ان کے سامنے ہے۔ وہ اسے نور کی روشنی پھیلانے کو ہجرت کا حکم دیتے ہیں۔

عبیر ایک بدفطرت عورت کے بطن سے جنم لینے والی باکردار اور باحیا لڑکی ہے۔ جسے اپنی ماں بہن کا طرزِ زندگی بالکل پسند نہیں۔ وہ اپنی ناموس کی حفاظت کرنا چاہتی ہے۔ مگر حالات کے تارِ عنکبوت نے اسے اپنے منحوس پنجوں میں جکڑ لیا ہے۔ کامیاب علاج کے بعد اسامہ پھر سے اپنے پیروں پر چلنے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ اسامہ چونکہ فطرتاً کاملیت پسند ہے۔ کسی بھی چیز کا ادھورا پن اسے ہرگز گوارا نہیں مگر اس کے بیٹے میں بتدریج پیدا ہونے والی معذوری کا انکشاف اسے سارہ کے لیے ایک سخت گیر شوہر، متکبر انسان کے طور پر متعارف کراتا ہے۔ وہ ہرگز اس کی کے ساتھ بچے کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں۔

(اب آپ آگے پڑھیے)

''یہ سب تمہیں عبدالہادی نے خود بتایا؟'' اس کے لہجے میں اُمید سی جاگی۔

''میں اسے اتنی اہمیت نہیں دیتی کہ وہ صلاح مشورے کرے بیٹھ کر۔ وہ جو شاہ صاحب ہیں انہوں نے کہا ہے۔'' اس نے نفرت سے ہونٹ سکوڑے تھے۔ لاریب سرد آہ بھر کے رہ گئی۔

''ایک طرح سے دیکھا جائے تو وہ ان کی سفارش لایا تھا۔ مگر میں ہرگز پروا نہیں کروں گی۔'' اس نے نخوت سے ہٹ دھرم انداز میں گویا اپنی مرضی آشکار کی۔

''یہ سب نہیں کرو علیزے پلیز!'' لاریب ملتجی ہوگئی تو علیزے نے اسے تند نظروں سے دیکھا تھا۔

''مجھ سے وہ سب نہ کہو لاریب! جو میں کر نہ سکوں۔ تم یقین کر سکتی ہو کہ اگر مجھے اُم جان کی فکر نہ ہوتی تو میں اس شخص سے یا تو خلع لے لیتی نہیں تو خودکشی کر لیتی۔ اتنی ہی نفرت ہے مجھے اس سے۔ تمہیں نہیں پتا میں کیسے کانٹوں پر دن رات بسر کر رہی ہوں۔ گو کہ وہ بہت شرافت کا چولا پہنے پھرتا ہے۔ مگر میرے دل کو دھڑکا ہی لگا رہتا ہے۔ کسی بھی لمحے، کچھ بھی غلط ہو جانے کا۔'' وہ آنکھوں میں بے بسی کی نمی لیے بھرائی آواز میں کہہ رہی تھی۔ جب لاریب کی نظر دروازے میں کھڑے عبدالہادی پر پڑی تو بے اختیار خائف ہو کر علیزے کے ہاتھ کو دبا دیا تھا۔ گویا چپ رہنے اور عبدالہادی کی موجودگی کا اشارہ دیا۔ علیزے نے چونک کر پہلے اسے پھر اس کی خائف نظروں کے تعاقب میں دیکھتے اسی کے چہرے کے عضلات تن کر رہ گئے تھے۔ پھر خاصے تمسخر سے ہنسی تھی۔

''آپ کیوں گھبرا رہی ہیں۔ یہ موصوف بہت اچھی طرح اپنے متعلق، میرے خیالات سے آگاہ ہیں۔'' اس کے لفظ لفظ میں پھنکار تھی۔ عبدالہادی کا دھواں دھواں ہوتا چہرہ کچھ اور بھی سبکی کا احساس پا کر پھیکا پڑ گیا۔ کچھ کہے بغیر وہ وہیں سے پلٹ گیا تھا۔

''تم بہت زیادتی کر رہی ہو علیزے!'' لاریب کو حقیقتاً گہرے صدمے سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ علیزے نے محض سر جھٹک ڈالا تھا۔ گویا اس کی بات کو اہمیت نہیں دی۔

☆......☆......☆

''آپ کو یہ سعادت بہت مبارک ہو بابا جان!'' وہ بہت عاجزی سے جھک کر ان سے مل رہا تھا۔ ہارون نے قدرے دھیان سے اس نوجوان کو دیکھا۔ جو غیر معمولی طور پر وجاہت و خوبروئی کا مالک تھا۔ وہ علیزے کے شوہر کے حوالے سے متعارف ہو چکا تھا اس سے۔ مگر یہ ملاقات بہت سرسری سی تھی۔ آج وہ اسے قریب سے دیکھ اور سُن رہا تھا تو متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

''احرام علامت ہے اِس کی کہ مومن نے دنیا کی لذتوں اور مصروفیات سے ہاتھ اُٹھا لیا ہے اور ان دو اَن سلی چادروں میں برہنہ سر اپنے رب کے حضور پہنچنے کے لیے نکل پڑا ہے۔''

''جی بالکل بیٹے! بس دُعا کیجیے اس بڑھاپے میں اللہ پاک اتنی ہمت عطا فرما دے کہ تمام ارکان

پوری طرح ادا ہوسکیں۔ آپ نے تو اس عمر میں یہ سعادت حاصل کی۔ یہی اصل لذت ہے۔ حج و عمرہ کی۔'' بابا جان مسکرا کر اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ نرمی سے عاجزی سے سر جھکا کر مسکرایا۔

''آپ دُعا کیجیے گا وہاں۔ میں علیزے کے ساتھ پھر وہاں حاضری دے سکوں۔'' اس نے دُعا کی درخواست پیش کی۔ بابا جان کا چہرہ جیسے کھل اٹھا تھا۔

''یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے بیٹے! وہاں سب بچوں کے لیے ہی تو دعائیں مانگنی ہیں۔''

''میرے سکون کی بھی دُعا مانگیے گا پلیز!'' اسے پتا بھی نہیں چلا اور وہ بے اختیاری کی کیفیت میں کہہ گیا۔ بابا جان کے ساتھ باقی سب کی بھی توجہ یکدم ہارون کی جانب ہوگئی۔ اس کے چہرے و لہجے میں اضطراب ہی ایسا تھا۔

''اللہ پاک ہر پریشانی سے نکالے آپ کو بیٹے! دائمی سکون، دائمی خوشیوں سے نوازے۔ ضرور دعا کروں گا۔'' بابا جان نے اپنا دستِ شفقت باقاعدہ اس کے کاندھے پر رکھا۔

''ہارون بھائی آپ کلمہ طیبہ کا ورد کیا کریں۔ اپنی دھڑکنوں میں لا الہ الا اللہ کو شامل کرلیں۔ انشاء اللہ بہتری پائیں گے۔'' عبدالہادی نے محبت بھرے نرم انداز میں نصیحت کی تھی۔ ہارون اسرار بے ساختہ مسکرانے لگا۔

''شیور، انشاء اللہ!'' عبدالہادی نے بھی اس کی مسکراہٹ میں اپنی مسکراہٹ شامل کردی۔

''جب میں مووِیز دیکھا کرتا تھا۔ آپ میرے فیورٹ ایکٹر تھے۔ رئیلی میں بہت لائیک کرتا تھا آپ کو۔'' وہ اس کی معلومات میں اضافہ کررہا تھا۔ ہارون کو ہنسی آ گئی تھی۔ اس بچکانہ اور معصوم انداز پر۔

''اچھا..... تو اب نہیں دیکھتے آپ؟''

''نہیں، کبھی خیال نہیں آیا اب۔'' وہ قدرے سنجیدہ ہوکر بتا رہا تھا۔

''اچھا کرتے ہیں۔'' اس کا بھی انداز سنجیدگی لیے تھا۔ جب وہ اُٹھ کر اندرونی حصے میں اُمِ جان سے ملنے آیا تو عبدالہادی اور عبدالغنی بھی اس کے ہمراہ تھے۔ سب سے پہلا سامنا بریرہ سے ہی ہوا تھا۔ جو اسے روبرو پاکے کھِل اٹھی تھی گویا۔

''السلام وعلیکم! جزاک اللہ!'' اس کا انداز بہت مدھم تھا۔ اس کے داہنے جانب آ کر وہ اس کے ہم قدم ہوگئی تھی۔ عبدالہادی وہیں صحن میں رُک گیا تھا۔ وہ جلدی میں تھا، عبدالغنی سے علیزے کو بھیجنے کا کہا تھا۔ ہارون نے اسے جواباً ترچھی نظروں سے دیکھا تھا۔

''عبداللہ کہاں ہے؟ اور کسی خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہاری وجہ سے نہیں آیا ہوں۔ یہ میری بہن کا سسرال بھی ہے۔ میں نہیں چاہتا اسے کوئی بھی پریشانی ہو میری وجہ سے۔'' اس کا لہجہ جتلاتا ہوا تھا۔ بریرہ کے چہرے پر لمحے بھر کو تاریکی سی چھا گئی۔ مگر اگلے پل وہ نارمل تھی۔

''آپ نے ٹھیک کہا۔ ویسے بھائی ہرگز بھی لاریب کو کسی وجہ سے ٹینس نہیں کرتے۔'' اس کا انداز سادہ اور تسلی آمیز تھا۔ اس کے باوجود ہارون کو گراں گزرا تھا۔

''ہاں ہاں، تم اور تمہارا بھائی تو اعلیٰ وارفع ہیں۔ میں ٹھہرا گناہ گار، بدکار۔'' وہ پھنکارا تھا۔ اس کی رنگت غصے سے دہک کر لمحوں میں انگارہ ہوگئی تھی۔ بریرہ کی گھبراہٹ اور بے قراری کی حد نہیں رہی۔ اسی گھبراہٹ میں اس نے بے اختیار اس کا بازو دونوں ہاتھوں میں اس طرح پکڑا کہ ایک طرح سے خود بھی اس کے ساتھ لگ کر کھڑی ہوگئی۔

''پلیز ہارون! کام ڈاؤن! قسم لے لیں جو میرا

یہ مقصد ہو، پلیز غلط نہ سمجھیں مجھے۔'' وہ روہانسی ہو کر نم آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھتی وضاحت پیش کر رہی تھی۔ ہارون نے بھنچے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ اسے غصے سے دیکھا تھا۔

''بے فکر رہو۔ میں جانتا ہوں یہ میکہ ہے تمہارا، یہاں تمہارا تماشا نہیں لگواؤں گا۔'' اس کی آواز گھٹی ہوئی تھی۔ بریرہ اس کی سوچ کے انداز پر شل ہو کر رہ گئی۔ وہ اس سے بازو چھڑا کر آگے بڑھ گیا تھا۔ وہ جلتی آنکھیں لیے ساکن کھڑی رہی۔

''کیا مصیبت ہے بھئی! کیا اب میں ایک رات بھی اپنے میکے نہیں رہ سکتی۔'' اسی پل علیزے جھلا کر کہتی اپنی دھن میں باہر آئی تھی۔ پھر اسی غصے میں لاریب کو زور زور سے آوازیں دینے لگی۔ بریرہ بوجھل دل لیے وہاں سے ہٹ گئی۔

''ہاں بولو؟ خیریت؟'' لاریب کچن سے برآمد ہوئی تھی۔ ہاتھ آٹے میں سنے ہوئے تھے۔ انداز بہت مصروف قسم کا تھا۔

''وہ صاحب جو بیٹھے ہیں وہاں انہیں کہہ دو کہ میری ماں حج پر جا رہی ہے۔ مجھے ان کے ساتھ رہنے دے۔'' وہ خاصے زہریلے انداز میں گویا صحن میں بیٹھے عبدالہادی کو ہی سنا کر بولی تھی اور چھپاک سے واپس اندر۔ لاریب پیچھے عبدالہادی کے سامنے شرمندہ ہونے کو رہ گئی تھی۔ وہ آہستہ سے کھنکارا اور اُٹھ کر قریب آ گیا۔

''آئی ایم سوری بھائی وہ......''

''اِٹس اوکے بھابی! علیزے اگر رُکنا چاہ رہی ہیں تو مجھے اعتراض نہیں ہے۔ ایکچولی میں آج انہیں مارکیٹ لے کر جانا چاہتا تھا۔ عید کے ساتھ دوسری شاپنگ بھی کر لیتیں۔ دراصل میں نے محسوس کیا ہے ان کے پاس موسم کی مناسبت سے کپڑے نہیں ہیں۔ آپ یہ کچھ پیسے لیں۔ رکھ لیں، انہیں دیجیے گا۔ بلکہ ممکن ہو تو شاپنگ بھی کرا دیجیے گا۔'' وہ جیب سے والٹ نکال کر کئی نوٹ اس کی جانب بڑھا چکا تھا۔

''رہنے دیں بھائی! شاپنگ ہو جائے گی۔'' وہ مسکرائی تھی۔ عبدالہادی خفیف سا ہو گیا۔

''ارے ارے پلیز! مجھے اپنے حقوق تو پورے کرنے دیں آپ، پلیز!'' اس کے اصرار پر لاریب نے نوٹ تھام لیے تھے۔ اتنا تو وہ بھی جان گئی تھی کہ علیزے نے یقیناً اس معاملے میں بھی تعاون نہیں کیا ہوگا اس کے ساتھ۔

''جزاک اللہ! چلتا ہوں۔ اُم جان کو سلام کہیے گا۔'' وہ جھکی نظروں سے پلٹ گیا۔ لاریب گہرا سانس بھر کے کچن میں مڑ گئی۔ اب وہ سوچ رہی تھی۔ ایسا کیا کہے گی علیزے سے کہ وہ عبدالہادی کی خواہش کے مطابق شاپنگ کر لے۔

☆......☆......☆

''ہارون آپ کو میری جو بات بری لگی۔ پلیز معاف کر دیں اس پر۔ میرا مقصد آپ کو ہرٹ کرنا یا اپنی اور اپنی فیملی کی برتری ثابت کرنا ہرگز نہیں تھا۔'' گھر آنے کے بعد وہ ایک بار پھر وضاحت دے رہی تھی۔ ہارون جو بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے چینل سرچنگ میں مصروف تھا۔ خاصے غصے میں ریموٹ کنٹرول پھینک کر اسے تپتی نظروں سے دیکھنے لگا۔

''کیا چاہتی ہو تم ہاں؟ ایک بات کے پیچھے کیوں پڑ جاتی ہو؟'' اس کا لہجہ، اس کا انداز اتنا شدید، اس قدر مشتعل تھا کہ بریرہ کی چند لمحوں کو سانسیں بھی رُک سی گئیں۔ نم آنکھوں میں بے بسی لیے وہ بس اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

''آئی ایم سوری! مجھے معاف کر دیں۔'' وہ اس کے ساتھ لگ کر بے آواز رونے لگی۔ ہارون کو کہاں اس سے ایسے رویے کی توقع تھی۔ اتنی اپنائیت، اس درجہ توجہ، یہ پیش رفت، یہ انداز...... کچھ بھی تو بریرہ

کے رویے سے میل نہ کھاتا تھا۔ وہ تو جیسے حق دق بیٹھا رہ گیا تھا۔

"میں آپ کو دکھ دینا نہیں چاہتی مگر پھر بھی دے جاتی ہوں۔ میں آپ کو خوش دیکھنا چاہتی ہوں مگر...... میری کوشش ناکامی کا شکار ہو جاتی ہے۔ آپ کو...... خود سے قریب رکھنا چاہتی ہوں مگر......"

وہ آنسوؤں کے بیچ کہہ رہی تھی۔ ہارون کا یہ سکتہ ٹوٹ گیا۔ اس نے گردن موڑ کر بریرہ کو سرد تاثرات کے ساتھ دیکھا اور ہاتھ سے اسے کسی قدر درشتی سے پرے دھکیل کر ٹانگیں سمیٹ لیں۔ پہلے سگریٹ کیس اٹھا کر سگریٹ سلگایا پھر اس کے آنسوؤں سے تر چہرے پر بے مہر نگاہ ڈالی تھی۔

"کیا ہمارے بیچ اتنی گنجائش ہے تعلق میں کہ تم اتنی بے تکلفی کا مظاہرہ کرو۔ محترمہ بریرہ صاحبہ! وہ وقت گزر گیا جب میں آپ کی زلف گرہ گیر کا اسیر تھا۔ میں آپ کے بغیر آپ کو خوش نظر نہیں آتا جو مجھے یہ خیرات دینے چلی ہیں؟" منہ اور ناک سے ایک ساتھ دھواں اڑاتے وہ جیسے صدیوں قرنوں کے فاصلے پر محسوس ہوا تھا بریرہ کو، یوں جھٹکے جانے پر توہین کا احساس تو جو تھا سو تھا۔ اسے ہارون کی بے مہری نے، اس کے الفاظ نے زیادہ رُلایا تھا۔

"اگر آپ دوسری شادی نہ کرتے ہارون! میں کبھی آپ کو اپنے حق کے لیے فورس نہیں کرتی۔ میں نہیں چاہتی اللہ آپ سے ناراض ہو۔ میری محبت کا تقاضا ہے یہ کہ میں......"

"کون سی محبت...... اور اب کہاں سے آ گئی یہ اچانک محبت؟" وہ بھڑک کر غرایا۔ بریرہ آنسو پونچھتے ہوئے بے بسی سے اسے تکتی رہی۔

"آپ کو یقین کیوں نہیں آ جاتا کہ میں......"

"تم اپنی یہ بکواس بند کر لو۔ اور چلی جاؤ یہاں سے۔" ہارون نے اس کی بات کاٹ دی۔

"ہارون......"

"شٹ اپ۔" وہ پھر اس کی بات قطع کر کے دھاڑا۔ بریرہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ روتے ہوئے کمرے سے نکلی تھی۔ اور ساری رات جائے نماز پر نوافل ادا کرتے وقفے وقفے سے سسکتی رہی تھی۔ جاگا تو ہارون بھی تھا۔ کروٹیں بدلتے...... سگریٹ پھونکتے اس کی سماعتوں میں بریرہ کے الفاظ سرسراتے رہے تھے۔ صبح دم جب بریرہ اسے نماز کو جگانے آئی اسی وقت وہ سویا تھا۔ بریرہ کی آواز پر بھی اس کی آنکھیں نہیں کھل سکیں۔

☆......☆......☆

"ہارون بھائی آئے تھے آفس آپ سے ملنے؟" سارہ نے اسامہ کو کوفی کا مگ دیتے ہوئے استفسار کیا تھا۔ وہ لیپ ٹاپ پر مصروف تھا محض سر کو اثبات میں ہلایا۔

"یہاں بھی آئے تھے۔ ارسل احمد سے بھی ملے۔ بہت پیار کر رہے تھے۔ بہت سے ٹوائز بھی دے کر گئے۔" اسامہ نے اب کے سر کو بھی جنبش نہیں دی۔ سارہ کو اس کی لاتعلقی بہت محسوس ہوئی تھی۔

"آپ کو بھی انہوں نے بتایا کہ ارسل احمد کا علاج ممکن ہے۔ اگر وہ بالکل نارمل نہیں بھی ہوگا تو اس میں بہتری ضرور......"

"سارہ! تم دیکھ رہی ہو ناں کام کر رہا ہوں میں۔ خاموش ہو جاؤ۔" وہ چیخا تھا۔ اور ایک دم سے اسے ڈانٹا۔ سارہ کو چپ سی لگ گئی۔ اس کی آنکھیں نم ہو چکی تھیں۔ کچھ کہے بغیر وہ چپکے سے آ کر ارسل کے کمرے میں اس کے بستر پر اس کے برابر لیٹ گئی۔ آنکھوں کی نمی بہت خاموشی سے ارسل کے بالوں میں جذب ہوتی رہی تھی۔ اس کی نظر میں وہ بچے قابلِ رحم نہیں تھے۔ جن کے باپ کسی حادثے میں یا ویسے مر جاتے تھے۔ یہ تو خدا کی رضا ہوتی

ہے۔ اللہ انہیں صبر دے دیا کرتا ہے۔ صبر تو ایسے نہیں آتا کہ باپ زندہ ہے، موجود ہے مگر بے حس ہے۔ کیا ارسل احمد کی معذوری اس کا قصور تھی؟ وہ معصوم تھا۔ بے گناہ تھا۔ پھر کیوں......؟'' کیوں اسامہ نے اس سے اس کا حق چھین لیا تھا؟ اسے شفقت سے محروم کر دیا تھا۔ اس کا بس چلتا تو لازماً اس کا گریبان جھنجوڑتی۔ اتنا چلاتی اس پر کہ اسے احساس ہو جاتا۔ مگر اس کا بس ہی تو نہیں چلتا تھا۔ وہ مجبور ہی تو تھی۔ بے بس لاچار ماں۔ وہ یونہی ارسل کو لپٹائے روتی رہی، تڑپتی رہی تھی۔ معاً دروازہ کھلنے کی آواز پر چونک کر گردن موڑی اور اسامہ کو دیکھ کر دھک سے رہ گئی۔

''آ جاؤ بھئی! مجھے پتا تھا تم یہیں ملو گی۔'' وہ بے زاری سے کہہ کر پلٹ گیا۔ سارہ نے آنسو بھری نظروں سے ارسل کا معصوم اور پیارا چہرہ دیکھا تھا پھر جھک کر اسے چوما۔ وہ ایسے کمرے سے باہر آئی تھی گویا دل نہ کر رہا ہو۔ بیڈ روم میں آ کر وہ چپ چاپ فریج سے اسامہ کا دودھ کا گلاس نکال کر اس کے پاس رکھنے کے بعد خود اپنی جگہ پر لیٹ گئی۔

''میرا موڈ نہیں ہے دودھ پینے کا۔'' وہ واش روم سے تولیے سے ہاتھ صاف کرتا باہر آ کر بولا۔ سارہ نے اسی خاموشی سے اٹھ کر گلاس دوبارہ فریج میں رکھ دیا۔

''تم پی لیتیں۔ اپنا خیال نہیں رکھتی ہو گی۔ جبھی اتنی ویک ہو رہی ہو۔'' وہ ٹوکے بغیر نہیں رہا تھا۔ تنقیدی نظروں سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے۔ تب ہی سارہ کو ابکائی محسوس ہوئی تو تیزی سے واش روم میں چلی گئی۔ اس خیال سے کہ اسامہ کو معلوم نہ ہو۔ وہ اسے شک بھی ڈالنا نہیں چاہتی تھی۔

''وومیٹنگ ہو رہی تھی تمہیں؟ کہیں تم پریگنینٹ تو نہیں ہو؟'' اس کے واش روم سے باہر آنے پر اسامہ کے سوالوں نے اس کے پیروں تلے سے زمین نکال دی تھی۔

اتنا ہراس، اس درجہ سہم اترا تھا اس کے اندر کہ وہ جس زاویے پر تھی اسی پر پتھر سی بن گئی۔ اس میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ پلٹتی اور اسامہ کے سامنے پوزیشن کلیئر کرنے کو مکر ہی جاتی۔ شاید اسے اتنی جلدی بھید کھل جانے کا گمان نہیں تھا۔ شاید اسے اسامہ سے ایسی گہری اور بھرپور آبزرویشن کی توقع نہیں تھی کہ وہ اس کے معمولی سے بدلے انداز سے کچھ کا کچھ سمجھ کر سوال جواب بھی شروع کر دے گا۔

''کیا پوچھا ہے تم سے؟'' اسامہ کڑے تیوروں کے ساتھ خود اس کے سامنے آ کر بے حد تلخی سے بولا تھا۔ انداز ایسا تھا کہ اگر اب بھی جواب نہ ملا تو شوٹ کر دے گا اسے۔

''ن......نہیں، ایسا تو کچھ نہیں ہے۔'' وہ ہکلائی اور پیشانی پر اُمڈتے پسینے کو گھبراہٹ میں بار بار پونچھا اسامہ کی نظریں ہی ایسی تھیں۔ اندر تک اُتر جانے والی، بھید نکال لینے والی، اس کا دل رُک رُک کر دھڑکنے لگا۔

''اگر ایسا نہیں ہے تو پھر یہ کیفیت......؟'' وہ اچھا خاصا جھنجلایا۔

''ضروری تو نہیں وومیٹنگ وغیرہ اسی وجہ سے ہو۔ کوئی اور وجہ بھی بن سکتی ہے۔ مجھے کھانا ہضم نہ ہو تو بھی اسی طرح......''

''اینی ویز کل تم اپنا پریگنینسی ٹیسٹ کرا لینا، رپورٹ میں خود دیکھنا چاہوں گا، اوکے۔'' انگلی اُٹھا کر وہ تنبیہ کے انداز میں بولا تو سارہ کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔

ساری رات اس نے پتا نہیں کیسے گزاری تھی۔ وحشت آکٹوپس بن کر اسے جکڑتی رہی۔ آنکھیں بار بار نم ہوتی جاتی تھیں۔ دل تھا کہ بھرایا ہوا تھا۔ اس

کا بس نہیں چلتا تھا کسی کونے میں بیٹھ کر سارے آنسو بہادے۔

''آج لازماً ڈاکٹر کے پاس چلی جانا۔ بات سنو، اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوئی بھی تو اسے وہیں سے ختم کرا کے گھر آنا، سمجھیں تم؟'' ناشتے کی ٹیبل پر آ کر بیٹھنے کے بعد اس نے پہلی بات ہی یہ کی تھی اور سارہ کا وجود ہولے ہولے لرزنے لگا تھا۔ اسامہ کی موجودگی تک اس نے بمشکل صبر کیا تھا۔ اس کے جاتے ہی ممی سے رابطہ بحال کرتے ہی ضبط کھو کر ہچکیوں سے رو پڑی تھی۔

''اسامہ کو شک ہو گیا ہے پھوپو! مجھے پریگیننسی ٹیسٹ کرانے کا کہہ گئے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی حکم نامہ تھما دیا ہے کہ ایسی صورت میں ابارشن کروا کے ہی گھر آؤں۔ میری ساری اُمیدیں ہی اس بچے سے وابستہ ہو گئی ہیں پھوپو! اگر اسے کچھ ہوا تو بتا رہی ہوں زندہ نہیں رہوں گی میں بھی۔'' وہ زاروقطار رو رہی تھی۔ بلکہ روز یادہ رہی تھی۔ بات کم کر رہی تھی۔ ممی کو اس وجہ سے بڑی مشکلوں سے اس کی پوری بات سمجھ میں آسکی اور جب آ گئی تو ان کا غصہ آسمان کو چھونے لگا تھا۔

''دماغ خراب ہو گیا ہے بس اس لڑکے کا، کوئی ضرورت نہیں ہے تمہیں اس کے حکم کی تعمیل کرنے کی، پوچھے تو بتا دینا ہاں ہوں پریگیننٹ، بلکہ میں خود آ جاتی ہوں۔ خود کروں گی اس سے بات، دیکھتی ہوں کیا کرتا ہے یہ۔'' ممی کے الفاظ سے سارہ کو خاصی ڈھارس سی محسوس ہوئی تھی۔ آنسوؤں کی روانی میں بھی قدرے کمی آئی۔

''آپ آج ہی آ جایئے گا پھوپو! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ آپ کو ان کے غصے کا نہیں پتا، میں سہہ چکی ہوں۔ جانے ہمارے ارادوں کو جان کر طیش میں کیا کر ڈالیں؟'' وہ سہمی ہوئی کہہ رہی تھی۔ ممی نے گہرا سانس بھرا، انداز تھکا ہوا سا تھا۔

''میں آ جاؤں گی، فکر نہ کرو، یہ بتاؤ ارسل احمد اب کیسا ہے؟''

''ویسا ہی ہے پھوپو جانی! زیادہ وقت میرے ساتھ گزارنے کی خواہش ہوتی ہے اس کی آنکھوں میں، جسے میں پڑھتی بھی ہوں مگر مخصوص ٹائم سے زیادہ نہیں دے سکتی۔ وہ رات میرے پاس سونا چاہتا ہے مگر اسامہ...... اسامہ کو پسند نہیں ہے۔'' اس کا دل درد سے بوجھل ہوا جا رہا تھا۔ ممی نے نم آنکھیں جو جلنے لگی تھیں۔ سختی سے بند کر لیں۔

''میری تو ساری اولادیں ہی اپنی اپنی جگہ پر آزمائش میں جا پڑی ہیں۔ ہارون ہے تو اسے دیکھ کر دل کٹتا ہے۔ اللہ جانے کن جھمیلوں میں جا اُلجھا ہے۔ بریرہ سے عجیب بیر باندھ کر بیٹھا ہوا ہے۔ دوسرے لفظوں میں خود کو اذیت دیتا ہے۔ اِدھر اسامہ ہے...... اس کے پاس فرصت ہی نہیں ہے کہ دو گھڑی ماں یا بہن کو بھی ٹائم دے دے۔ انوکھا ہی ہو گیا بزنس، چلو خوش رہے مگر اولاد کے ساتھ کیسا مقابلہ؟ اولاد تو آنکھوں کی ٹھنڈک ہوتی ہے۔ اچھا چلو تم پریشان نہ ہوتی رہنا اب بیٹھ کے۔ اللہ سے بہتری کی دعا کرنا، میں بریرہ کو بتا کر تمہاری جانب آ جاؤں گی۔'' انہوں نے نرمی سے کہہ کر فون بند کر دیا۔ سارہ نے ہاتھ کی پشت سے آنکھیں رگڑیں اور سیل فون واپس رکھتے، ہمتیں مجتمع کرتی ارسل احمد کے کمرے کی جانب ہولی۔ آج اس جھمیلے میں پڑ کر وہ اس کے پاس نہیں جا سکی تھی۔ اسے یقین تھا اس کا معصوم بے بس بیٹا اس کی راہ دیکھ رہا ہوگا۔

☆......☆......☆

اُم جان اور بابا جان حج کے لیے جا چکے تھے، اس کے باوجود علیزے کا ارادہ نہیں لگتا تھا گھر واپسی کا، عبدالغنی نے لاریب کو منع کیا تھا کہ وہ اس سے

ایسی کوئی بات نہ کرے جس سے علیزے ہرٹ ہوسکتی تھی۔ لاریب نے البتہ وہ رقم ضرور اس کے حوالے کردی تھی۔

''بھئی یہ تمہاری امانت تھی میرے پاس! عبدالہادی بھائی دے گئے تھے کہ تم شاپنگ کرلو عید کے لیے۔''

''مجھے نہیں چاہیے کچھ بھی۔'' اس نے رکھائی سے کہتے ہوئے نوٹ واپس بستر پر ڈال دیے۔

''نہ بھی چاہیے ہوگا تو کچھ خرید لینا۔ یہ خوشی ہے ان کی۔''

''میں نے کسی کی خوشیوں کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا ہے۔'' وہ یکدم بھڑک گئی تھی۔ لاریب نے دانستہ خاموشی اختیار کی۔

''تم نے اسی وقت مجھے بتایا ہوتا، میں یہ پیسے اس کے منہ پر ماردیتی۔'' اس کا غصہ ابھی بھی ختم نہ ہوا تھا۔

''آج آئیں گے وہ، ماردینا۔ مجھے پورا یقین ہے وہ مسکرا کر کہیں گے، نوازش، بسم اللہ!'' لاریب انداز بدل کر حظ لیتے ہوئے کھلکھلا کر بولی۔ علیزے اسے گھورے گئی۔

''وہ کیوں آرہا ہے؟ اگر مجھے لینے تو میں نہیں جاؤں گی۔''

''وہ تم پر حق رکھتے ہیں علیزے! بے جا ضد نہیں کرتے، اور پیاری لڑکی درحقیقت وہی تمہارا گھر ہے اب۔'' وہ رسان سے محبت سے بولی تھی۔ علیزے ایک دم ساکن رہ گئی تھی۔

''اس کا مطلب ہے تم مجھے اب یہاں برداشت نہیں کرسکتیں، بہت اچھا کیا۔ مجھے کسی دھوکے میں نہیں رکھا۔'' وہ خاصی تاخیر سے بولی تو لہجے میں ٹوٹتے کانچ کی سی چھنک تھی۔ لاریب نے بے ساختہ گھبرا کر اسے دیکھا مگر وہ اسی تند انداز میں تیزی سے کچن سے نکل گئی۔ لاریب بدحواس ہوتی پیچھے آئی تو اسے سیل فون پر مصروف پایا تھا۔

''میں گھر آنا چاہتی ہوں، ابھی، اسی وقت۔''

اس کی آواز بھیگی ہوئی اور مدھم تھی۔

''آجاؤ۔ میں انتظار کررہی ہوں۔'' لاریب کو اندازہ ہوا تھا وہ عبدالہادی سے بات کررہی تھی۔ وہ وہیں سے چپکے سے پلٹ آئی۔ اگر ہرٹ ہونے کے بعد وہ عبدالہادی کی جانب پلٹ سکتی تھی تو اس سے بڑھ کر اچھی بات ہی کوئی نہیں ہوسکتی تھی۔ اس نے علیزے کو فی الحال منانے کا ارادہ ترک کردیا تھا۔ اپنے سے وابستہ رشتوں کو اگر تھوڑے سے دکھ دے کر کسی بڑے نقصان سے بچایا جاسکتا ہے تو اس میں حرج نہیں ہے۔ وہ مطمئن تھی۔ اگلے پندرہ منٹ میں دروازے پر عبدالہادی موجود تھا۔

''علیزے کو بھیج دیجیے بھابی! آئی ایم سوری میں ذرا جلدی میں ہوں۔'' اس کے دروازہ کھولنے پر وہ بائیک اسٹینڈ کرتا ہوا اسے سلام کرنے کے بعد حسبِ سابق جھکی نظروں سے ہمکلام ہوا تھا۔ لاریب مسکرائی تھی اور سر اثبات میں ہلا کر پلٹی تو پیچھے کھڑی علیزے سے ٹکرا گئی۔

''گلے تو مل لو، یا خفا ہی جاؤ گی۔'' اسے سپاٹ چہرے کے ساتھ دہلیز پار کرتے پا کر لاریب نے نرمی سے کہتے اس کا بازو تھاما، جسے علیزے نے ایک ہی جھٹکے سے چھڑوالیا تھا۔

''مجھ سے منافقت برداشت نہیں ہوتی۔ مگر میری قسمت کہ مجھے منافق لوگ ہی زیادہ ملے۔ اگر سمجھوتا ہی کرنا ہے تو پھر ایک ہی سمجھوتا ہوسکتا ہے۔''

اس کا لہجہ دبا ہوا مگر انگارے برساتا ہوا تھا۔ عبدالہادی نے اچنبھے میں گھر کر یہ منظر ملاحظہ کیا تھا۔ اس کے لیے تو یہ ہی بہت بڑا معجزہ تھا کہ علیزے نے خود کال کرکے اسے بلوایا تھا۔ اس وقت وہ جامعہ

میں تھا اور بچوں کو درس دے رہا تھا۔ اس کے بعد ہی باقاعدہ کلاس لگتی تھی۔ مگر وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگا آیا تھا۔ لیکن یہ گمان تلک بھی نہیں تھا وہ کسی سے خفا ہو کر یہ فیصلہ کر چکی ہو گی۔ جذباتی لوگوں کا یہ بھی ایک المیہ ہوتا ہے کہ وہ دماغ کی بجائے ہمیشہ دل سے سوچتے اور فیصلہ کرتے ہیں۔ ان کے فیصلے عجلت پسندانہ ہوتے ہیں، جبھی ناپائیدار ثابت ہوتے ہیں اور ناکامی و پچھتاوے کا باعث تو بنتے ہی ہیں، بسا اوقات شرمندگی سے بھی دوچار ہو جایا کرتے ہیں۔ علیزے کا شمار ایسے ہی لوگوں میں ہوتا تھا۔

''ٹھیک ہے عبدالہادی بھائی! فی امان اللہ۔'' لاریب سنبھل کر نرمی سے کہتی مسکرائی۔ عبدالہادی جو اچھنبے میں گھرا متحیر کھڑا انہیں دیکھ رہا تھا۔ سنبھل کر سر خم کیا تھا۔

''السلام علیکم!'' وہ رخصت ہوتے بھی سلام کرنے کا عادی تھا۔ لاریب نے بہت تپاک اور خلوص نیت سے جواباً اس پر سلامتی بھیجی تھی۔

''بائیک لانے کا مقصد؟ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ میں نہیں بیٹھ سکتی اس پر تمہارے ساتھ۔'' اب وہ اسی غصیلے انداز میں عبدالہادی سے اُلجھ رہی تھی۔ وہ گڑبڑایا اور بے بسی سے اسے دیکھا۔

''میں معذرت چاہتا ہوں، گاڑی چاچو لے کر گئے تھے...... میں۔''

''اونہ، بہانے ہیں سب، محض جھوٹ، آہستہ چلانا، مجھے عادت نہیں ہے بیٹھنے کی۔'' ڈانٹنے پھٹکارنے کے بعد وہ نخوت سے کہہ کر مناسب فاصلہ رکھ کر اس طرح بیٹھی کہ غلطی سے بھی اس کو نہ چھو سکے۔ لاریب سب دیکھ رہی تھی۔ مسکراہٹ دبا کر رہ گئی۔

''سب خیریت تھی؟ آپ کچھ خفا لگ رہی تھیں بھابی سے۔'' عبدالہادی نے گھر کے سامنے لا کر بائیک روکی پھر لباس کی جیب میں ہاتھ ڈال کر چابی نکالتے ہوئے اس اعتماد کے پیش نظر بولا تھا۔ جو علیزے کی کال اور گھر آنے کے فیصلے نے اس کے اندر توانائی کی صورت بھرا تھا۔ وہ کتنا نہال ہو چکا تھا۔ علیزے کو اندازہ ہی نہیں ہو سکتا تھا۔

''اپنی حد میں رہنا سیکھو یوسف صاحب! تمہیں کس نے کہا کہ میں اپنے پرسنلز تم سے شیئر کر سکتی ہوں۔ اتنے خاص نہیں ہوئے تم۔'' کی رِنگ اس کے ہاتھ سے اچکتے ہوئے وہ تنفر سے بولی تھی اور اس کے تاثرات دیکھے بغیر پلٹ کر دروازے کا تالا کھولنے میں مصروف ہو گئی۔ عبدالہادی سرد آہ بھرتا بائیک کو کک لگا کر پھر سے جامعہ کا رخ کر گیا۔ جہاں طالب علم یقیناً اس کی راہ تک رہے تھے۔

☆......☆......☆

''اتنا غصہ آیا اسے میری اتنی سی بات کا کہ ایک لمحے میں جا کر عبدالہادی بھائی کو کال کر دی۔ اور ان کے ساتھ چلی گئی۔ یہ ہوتا ہے ایک بیاہتا لڑکی کا اپنے گھر کا مان، وہ میکے سے معمولی بات بھی برداشت نہیں کر پاتی اور اپنے گھر سدھارتی ہے۔ سچی بات ہے مجھے تو اتنا اچھا لگا کہ بتا نہیں سکتی۔ خوش آئند بات یہ ہے کہ وہ عبدالہادی سے جتنی بھی ناراض یا بدگمان تھی مگر شعوری یا لاشعوری طور پر ہم سے زیادہ اسے اپنا سمجھتی اور مانتی ضرور ہے۔ بس ابھی کچھ وقت لگے گا مگر سب کچھ انشاء اللہ نارمل ہو جائے گا۔''

اُس نے پہلے یہ بات پوری تفصیل سے بریرہ کو بتائی تھی اور داد وصول کی تھی اب عبدالغنی کو کارنامہ سنا کر ویسی ہی تائید اس سے بھی چاہ رہی تھی مگر جواب میں اسے خاموش پا کر قدرے حیران ہو کر اس کی شکل دیکھنے لگی۔

''کیا ہوا؟ آپ کو کچھ بُرا لگا عبدالغنی!'' جواباً عبدالغنی نے گہرا سانس بھر کے سر کو نفی میں جنبش دی

تھی۔ پھر نرمی سے ٹوکا تھا۔

''مجھے تمہارے خلوص پر شبہ نہیں ہوسکتا ہے لاریب! خاص کر علیزے کے معاملے میں، میں جانتا ہوں تم بہت چاہتی ہو ہمیشہ سے اسے۔ مگر اس وقت، وہ جس سچویشن سے گزری ہے وہ بہت غیر یقینی حالات ہیں اس کے لیے۔ وہ ہرٹ ہے، مضطرب ہے، اسے جذباتی سہاروں کی ضرورت ہے۔ وہ چاہتی ہے اس کی تائید کی جائے، ویسے بھی یہ اس کے والدین اور بھائی کا گھر ہے۔ اسے مان ہے ان رشتوں پر، میں نہیں چاہتا تھا اس کا یہ مان ٹوٹے، جبھی تمہیں منع کیا تھا۔ لاریب...... تم بھابی بھی ہو اس کی...... اور اس رشتے میں غلط فہمی جلدی پیدا ہوجایا کرتی ہے۔ تم سمجھ رہی ہو میری بات۔'' عبدالغنی نے اِسے پریشان ہوتے پاکر نرمی سے اس کا گال سہلایا تھا۔ وہ جیسے گہری نیند سے جاگی۔

''اوہ...... اتنی بار یکی سے تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ میں تو......''

''اِٹس اوکے، اب پریشان نہیں ہو۔ میں منالوں گا اسے۔'' عبدالغنی کے تسلی دینے کے باوجود اس کی تشفی نہیں ہوسکی تھی۔

''اگر آپ نے میرے حوالے سے بات کی تو وہ یہی سمجھے گی آپ میرا دفاع کررہے ہیں۔'' اس کا انداز متفکرانہ تھا۔

''تو کیا نہیں کرنا چاہیے؟'' عبدالغنی نے مسکرا کر اسے چھیڑا تھا۔ وہ اتنی ہی تشویش کا شکار تھی کہ مسکرا تک نہ سکی۔

''کرنا تو چاہیے مگر وہ سمجھے گی بھائی بھابی کا دفاع کررہے ہیں، صفائی پیش کررہے ہیں۔ بدگمان جو ہے وہ مجھ سے۔ تو کچھ بھی سوچ سکتی ہے۔'' اس نے ہاتھ مسلے تھے۔ ہونٹ کچلنے لگی تھی۔

''میری ان پیاری امانتوں پر ستم مت ڈھاؤ، بہت عزیز ہیں مجھے۔'' عبدالغنی نے اس کے ہاتھ پکڑے اور ہونٹوں پر ہونٹ رکھ دیے۔ لاریب کی ساری ٹینشن، سارا اضطراب جیسے اسی ایک لمحے میں بھاپ بن کر فضا میں تحلیل ہوگیا تھا۔ اندر تک سکون کا ایسا احساس سرائیت کرنے لگا جیسے الفاظ کے احاطے میں لانا ممکن ہی نہ تھا۔

''عبدالغنی!'' وہ جھینپی تھی۔ اور اس کے سینے پر سر رکھ کے شرٹ کے بٹنوں سے کھیلنے لگی۔

''پریشان نہیں ہو۔ سب ٹھیک ہوجائے گا انشاء اللہ!'' وہ اس کے بال سہلا کر بولا تھا۔

''آپ میرے ساتھ ہیں تو مجھے پریشان ہونے کی ضرورت ہی نہیں۔ مجھے یقین ہے آپ سب سنبھال لیں گے۔''

''میں نہیں اللہ! اللہ سب سنبھال لے گا۔'' عبدالغنی نے تصحیح کی تھی۔ لاریب فخر سے، ناز سے مسکرائی۔

''بالکل! اللہ سنبھال لے گا۔ میں تو بس اللہ کے انعام کو پاکر شاکر ہوں، ہوتی رہوں گی۔''

''تم بہت سمجھ دار نہیں ہوگئی ہو۔ بڑے بڑے معاملے سنبھالنے اور سلجھانے لگی ہو۔'' عبدالغنی نے پھر چھیڑا۔ وہ جھینپ کر ہنس دی تھی۔

''آپ کی قربتوں کا سارا فیض ہے جناب! اللہ نے آپ کے صدقے ہمیں بھی عقل سلیم سے نواز دیا۔''

''خوش رہو۔ اور ہمیشہ ایسی ہی سمجھ دار رہنا۔''

''بے فکر رہیں۔ ہمیشہ ایسا ہی سمجھ دار پائیں گے آپ مجھے۔'' وہ تائیداً بولی۔

''جانور سنبھال لوگی؟ منگوالوں گاؤں سے گائے؟'' عبدالغنی نے بات بدل دی۔ ایک طرح سے اسے چھیڑا۔ لاریب نے سر اٹھا کر اس کے تاثرات دیکھے۔ پھر دوبارہ سر اس کے کاندھے پر

رکھ دیا۔

''آپ کا حکم ہے تو یہ بھی سہی، لیکن تجربہ نہیں ہے مجھے۔ اگر اس نے مجھے سینگوں پر اٹھا کر پٹخ دیا یا اپنے کھروں تلے کچل ڈالا تو یاد کرتے رہیں گے مجھے۔'' عبدالغنی اس برجستگی پر بے ساختہ ہنستا چلا گیا تھا۔

''بڑے خوش ہو رہے ہیں میرے مرنے کا سُن کر۔ کوئی اور تو نظروں میں نہیں رکھ لی؟'' وہ خاصی جل کر بولی تھی۔ عبدالغنی کانوں کو ہاتھ لگانے لگا۔

''ایسا سمجھتی ہو اپنے شوہر کو؟'' وہ اس کے گال پر چٹکی بھر کے بولا تھا۔

''میں نے سوچا ممکن ہے۔ بھائی کا بدلہ چکانے کو ایسا خیال آ جائے۔'' اب کے وہ سراسر اسے چڑا رہی تھی۔ عبدالغنی خاموش رہا تو اس نے خود ہی وضاحت بھی کر دی تھی۔

''مذاق کر رہی ہوں بھئی! کجا اپنی بہن کی طرح دل پہ لے لیں۔'' وہ منہ پھلا کر بولی تھی۔ عبدالغنی نے محض مسکرا کر اس کا گال سہلایا۔

''علیزے سے کب بات کریں گے؟'' عبدالغنی مجھے خفقان سا ہو رہا ہے۔ میری زندگی بہت صاف ستھری گزری ہے۔ جیسی میں ہوں ہمیشہ ویسا ہی تاثر بھی قائم ہوا میرا۔ اللہ کا شکر ہے کبھی غلط نہیں سمجھا گیا۔ مجھے اپنے پندار اپنے کردار کی بہت پروا بھی رہی ہے۔ یاد کریں۔ آپ کو جتنا بھی پسند کرتی تھی مگر زبان نہیں کھولی۔ وہ تو ممی کا رویہ ایسا ہو گیا تھا کہ میں نے بہت بولڈ اسٹیپ لے لیا تھا ورنہ......''

''لاریب! کیا ہو گیا ہے یار، مجھے وضاحت یا صفائی دینے کی تمہیں کیا ضرورت بھلا؟ ہم تو ایک دوسرے کا عکس ہیں۔ اتنے سالوں کی پارٹنر شپ نے ہماری اتنی انڈر اسٹینڈنگ تو ڈیویلپ کی ہے ناں کہ ہم ایک دوسرے کو وضاحت اور صفائی نہ دیں۔''

عبدالغنی نے اس کے گرد بازوؤں کا حصار تانتے ہوئے بے حد محبت سے کہا تھا۔ لاریب کی آنکھوں کی نمی اس کے سینے میں جذب ہونے لگی۔

''میں جانتی ہوں، میں نے کبھی آپ سے ایسی باتیں کی بھی نہیں ہیں عبدالغنی! علیزے کی خفگی کا خیال میرے دل پر بھاری سل کی طرح سے آ پڑا ہے۔ میں تو اپنے تئیں سمجھ رہی تھی اچھا کیا۔ بھابی نے بھی مجھے سراہا تو مجھے اس خیال میں پختگی محسوس ہوئی مگر اب......''

''افوہ...... لاریب تم بالکل پاگل ہو۔ اچھا میں کل ہی لے کر چلوں گا تمہیں علیزے کے پاس وہ مان جائے گی ڈونٹ وری۔''

''سچ؟'' لاریب خوش تو ہوئی مگر خدشے ہمراہ تھے گویا۔

انشاءاللہ! بس اب مسکراؤ میں اپنی بیوی کو اداس نہیں دیکھ سکتا۔ یہ بات تم ہمیشہ کے لیے نوٹ کر لو۔'' وہ اس کا سر تھپک کر بولا تھا۔ لاریب اب کے کھل کر مسکرائی تھی۔

☆......☆......☆

''علیزے بیٹے! باہر آؤ ذرا۔'' شاہ صاحب صحن میں کھڑے پکار رہے تھے۔ علیزے نے اپنی الماری سیٹ کرتے ہوئے حیرانی سے گردن موڑی اور الماری کے پٹ بند کر کے دوپٹہ درست کرتی باہر آ گئی۔

''السلام علیکم! مجھے پتا نہیں چل سکا۔ آپ تشریف لائے ہیں۔'' وہ مدھم آواز میں بولی تھی۔ شاہ صاحب نے جواب دیتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

''جیتی رہو بیٹی! ہم قربانی کا جانور لے کر آئے تھے۔ سوچا اپنی بیٹی کو دکھا دیں۔ اچھا ہے ناں؟ عبدالہادی کا ہے یہ۔'' انہوں نے سفید اور

براؤن رنگ کے اونچے، پورے صحت مند بکرے کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے محبت سے کہا تھا۔ علیزے نرمی سے محض مسکرائی۔

''ماشاءاللہ! بہت پیارا ہے۔'' اس نے بکرے کو نزدیک آ کر پیار کیا تو شاہ صاحب کی مسکراہٹ گہری ہوگئی تھی۔

''عبدالہادی کہہ رہے تھے، علیزے ڈریں گی اس سے۔ یہ تو گھر پر رکھنے کو بھی تیار نہیں تھا کہ آپ کو مسئلہ ہوگا۔''

''کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ بابا جان ہر سال قربانی کا جانور تقریباً ایک ماہ پہلے گھر لے آتے تھے۔ میں ہی سنبھالا کرتی تھی۔ چارہ کھلاتی تھی۔ پانی پلاتی تھی۔ بلکہ روز ایک کولڈ ڈرنک اور جوس بھی پلایا کرتی تھی۔ بھائی کہتے تھے علیزے تو بچوں سے زیادہ لاڈ اٹھاتی ہے جانوروں کے۔''

مسکرا کر بے تکلفی سے بات کرتی وہ عبدالہادی کو بے حد اچھی لگی۔ کچھ کہے بغیر وہ بس اسے لو دیتی نظروں سے دیکھتا رہا تھا۔

''آپ اسے وہاں باندھ دیجیے گا۔ باقی کام میرا ہے۔ اب میں آپ کے لیے چائے بنا لاتی ہوں۔''

اُس نے مگن انداز میں کہا اور پلٹ کر کچن میں چلی گئی۔ شاہ صاحب نے فتح مندانہ نظروں سے عبدالہادی کو دیکھا اور مسکراہٹ ضبط کرتے ڈیوڑھی میں آ کر بکرے کو باندھنے لگے۔

''میں نے کہا تھا ناں۔ میری بیٹی مجھ سے بے اعتنائی برت ہی نہیں سکتی۔ لڑکے تمہیں کسی کو قائل کرنے کے ڈھنگ ہی نہیں آتے۔ بس تم مجھ پر اور اس بکرے پر رشک ہی کر سکتے ہو جسے تمہاری بیوی کی توجہ اور محبت میسر آ گئی ہے۔'' انہوں نے سیدھے ہوتے ہوئے اسے چھیڑا۔ عبدالہادی منہ پھلا کر انہیں دیکھتا رہا۔

''یعنی اب یہ نوبت بھی آئے گی کہ آپ تنگ کریں گے مجھے اور طعنے دیں گے۔''

''نہیں، میں تو بس اپنے بیٹے کو پُش کر رہا ہوں۔ بیوی کو منانا ہرگز مشکل کام نہیں ہے۔''

''آپ نہیں سمجھ سکتے۔'' وہ اسی طرح روٹھے انداز میں بولا تھا۔

''والدہ صاحبہ سے ملنے کب جا رہے ہو؟'' شاہ صاحب نے بات بدل دی۔ وہ بے اولاد تھے، کچھ برس قبل بیوی بھی وفات پا گئی تھیں۔ انہوں نے خود کو مکمل طور پر دین کی خدمت پر وقف کر دیا تھا۔ عبدالہادی جب سے ان کی زندگی میں شامل ہوا تھا۔ انہوں نے اپنے بیٹے کا ہی درجہ دیا تھا۔ پھر اس کے حالات بھی کچھ ایسے تھے کہ مستقل انہی کا ہو کر رہ گیا۔

''عید کے بعد ارادہ ہے۔ ذرا اپنی بہو صاحبہ کو اس کام پر بھی قائل کر لیجیے۔ ماما کی یہی خواہش ہے۔''

''ہوں ظاہر ہے۔ تم سے تو کچھ ہوگا نہیں۔'' انہوں نے پھر اسے چھیڑا۔ عبدالہادی علیزے کو ٹرے سمیت اسی جانب آتے دیکھ کر خاموش ہو گیا تھا۔ علیزے نے سلیقے سے انہیں چائے پیش کی تھی۔ اور شاہ صاحب کو کباب اور کیک لینے پر بھی اصرار کرتی رہی۔

''شکریہ بیٹے! ناشتا کر کے نکلا تھا۔ بالکل گنجائش نہیں۔ مگر اپنی بیٹی کا کہا نہیں ٹالوں گا۔'' انہوں نے محبت و شفقت سے کہتے کیک کا چھوٹا پیس پلیٹ میں نکال لیا۔

''آپ جامعہ نہیں جا رہی ہیں بیٹے! یہ تو بہت اہم فریضہ تھا جو آپ انجام دے رہی تھیں۔'' ان کے سوال پر علیزے نے ہونٹ بھینچ لیے تھے۔

''جی...... جایا کروں گی۔''

''ضرور بیٹے! وہاں جانے میں کوئی دشواری ہے تو مسئلہ نہیں۔ آپ کے لیے ہم اپنے جامعہ میں انتظام کرا دیتے ہیں۔ عبدالہادی کے ساتھ ہی آ جایا کیجیے۔'' علیزے نے اس آفر پر چونک کر انہیں پھر عبدالہادی کو دیکھا تھا۔ وہ سر جھکائے کسی سوچ میں گم نظر آیا۔

''جی جی، مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔'' وہ یہی کہہ سکی۔

''خوش رہو بیٹے! آباد رہو۔'' انہوں نے خالی مگ ٹرے میں رکھتے اسے دعاؤں سے نوازا۔ اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔ پھر جیسے کچھ یاد آنے پر بولے تھے۔

''عید میں بہت کم دن رہ گئے ہیں بیٹی نے ابھی اپنی تیاری بھی نہیں کی۔ میں جانتا ہوں میرا بیٹا بہت لاپرواہ ہے اس معاملے میں۔ یقیناً ابھی تک پوچھا بھی نہیں ہوگا عبدالہادی نے، اسے چھوڑو۔ آپ آج شام میں تیار رہنا، میں خود اپنی بیٹی کو بازار لے چلوں گا۔'' انہوں نے بات ایسے کی تھی کہ علیزے گڑبڑا کر رہ گئی۔

''ن نہیں پلیز چاچو! آپ زحمت نہ کیجیے گا۔ مجھے ضرورت ہوگی تو میں خود چلی جاؤں گی۔'' اس نے شرمندگی سے دوچار لہجے میں کہا تھا۔ شاہ صاحب نے اس کے سر پر اپنا ہاتھ نرمی سے رکھ دیا۔

''اکیلے نہیں جایئے گا بیٹے! بازاروں میں آج کل بہت رش ہے۔ حادثے بھی ہو رہے ہیں۔ مجھے فکر رہے گی۔ عبدالہادی لے جائے گا آپ کو۔ اور ذرا اچھی طرح اس کی جیب خالی کرائے گی میری بیٹی۔ شادی کے بعد یہ آپ کی پہلی عید ہے بیٹے! خیال رکھنا اس بات کا۔ آپ اپنے میکے جائیں گی تو وہاں سب آپ کے ظاہری حلیے سے ہی آپ کی خوشی و خوشحالی کا اندازہ قائم کریں گے۔ شادی تو بیشک سادگی سے ہوئی مگر......''

''میں خیال رکھوں گی۔ آپ فکر نہ کریں۔'' علیزے نے بے ساختہ تسلی سے نوازا تھا۔ شاہ صاحب اس فرمانبرداری کے مظاہرے پر اسے دعاؤں سے نوازتے رخصت ہو گئے تھے۔ علیزے نے دروازہ بند کر کے آتے عبدالہادی کو شعلہ بار نظروں سے گھورا۔

''اِس طرح کی گھٹیا حرکتیں کر کے تم اپنا مقام میری نظروں میں اونچا کر لو گے، خام خیال ہے تمہارا۔'' عبدالہادی ششدر ہو کر رہ گیا تھا۔ گویا سمجھ نہیں آئی ہو یہ عتاب کیوں نازل ہوا۔ علیزے اس کے تاثرات کو بھانپ کر ہی مزید قہر سے بھرنے لگی۔

''اتنے معصوم نہیں ہو تم، سب کچھ کچن سے سنا میں نے۔ چلوں گی تمہارے ساتھ شاپنگ پر بھی اور تمہاری ماں کے گھر بھی، دیکھتی ہوں کیا کر لو گے تم میرے ساتھ وہاں جا کے۔ کہا تھا ناں مجھے کمزور سمجھنا چھوڑ دو۔'' ایک ایک لفظ چبا کر کہتے وہ غرائی تھی۔ عبدالہادی کچھ دیر اسے دیکھتا رہا تھا۔ پھر چند قدم بڑھا کر اس کے بالکل نزدیک آ گیا۔

''آپ کی بدگمانیوں کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے علیزے! آپ مجھ پر اگر یقین کرنا ہی نہیں چاہتی ہیں تو میں کیسے اس امر پر فورس کر سکتا ہوں بھلا؟ اور یہ سارے عمل جو بھی میں کر رہا ہوں آپ کی محبت میں کر رہا ہوں۔ آپ کا دل جیتنے کو۔ اس میں نہ کوئی دکھاوا ہے، نہ ہی کوئی دھوکہ۔ میرا سابقہ عمل میرے شدید نقصان کا باعث بن چکا یہ بھی معلوم ہے مجھے۔ مگر میرا اسٹیمنا، میرا ضبط ہرگز بھی اس کا ازالہ یا مداوا نہ سمجھیں۔ یہ ساری ہمت میرے خدا کی عطا کردہ ہے۔ آپ میرے نزدیک ہیں، ایک جائز رشتے کی حیثیت سے اور میں فاصلوں کو برقرار رکھے ہوئے ہوں تو اس کی وجہ بھی جاننے اور سمجھنے کی کوشش کیجیے

گا۔ ورنہ تلخ حقیقت تو یہ ہے کہ آپ کی ناگواری، آپ کی تلخی ہرگز بھی میرے ارادے میں آڑ نہیں ثابت ہوسکتی۔ میرا نہیں خیال کہ مجھے اور کچھ کہنے کی ضرورت ہے۔"

اُس نے ایک دم بات کو سمیٹا تھا اور پلٹ کر لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا۔ علیزے چند ثانیوں کو حیران پریشان کھڑی اس کے الفاظ پر غور کرتی رہی۔ پھر جھنجلا کر سر جھٹک دیا۔ اور بہت دیر تک بڑبڑا کر اپنا غصہ چیزیں پٹختی ہوئی نکالتی رہی تھی۔

☆......☆......☆

ممی آ گئی تھیں، اس کے باوجود اسامہ کے متوقع رویے کے پیش نظر سارہ کا دل ہولتا رہا تھا۔ اسامہ کے گھر آ جانے پر تو جیسے اس کے دل کو پنکھ لگ گئے تھے۔ اس کے لیے چائے بنا کر کمرے میں جانے سے قبل وہ لاؤنج میں ارسل احمد کے ساتھ چھوٹی چھوٹی باتوں میں مصروف ممی کے پاس آ گئی تھی۔

"مجھے پوری امید ہے وہ ابھی پوچھ لیں گے مجھ سے اور پھوپو جانی اگر وہ مجھے اندر دیر ہوگئی تو پلیز آپ آ جایئے گا۔" وہ خوف سے ابھی سے زرد پڑ گئی تھی۔ ممی کو اس کی تشویش ہونے لگی۔

"اتنا گھبرا کیوں رہی ہو بیٹے! قصائی نہیں ہے بہرحال میرا بیٹا!"

"وہ اس ایشو پر کتنے پوزیسو ہیں آپ کو اندازہ ہو جائے گا کچھ دیر میں۔" سارہ نے جیسے روہانسی ہو کر جواب دیا تھا۔ ممی اس بات کے جواب میں کچھ نہیں کہہ سکیں۔ گویا لاجواب ہوگئی ہوں۔ سارہ کے جانے کے بعد بھی وہ متفکر نظر آتی رہیں۔

"کہاں رہ جاتی ہو آخر؟ باتھ لے کر کب سے ویٹ کر رہا ہوں چائے کا۔" اسامہ اسے دیکھ کر اچھا خاصا جھلا کر بولا تھا۔ سارہ نے خاموشی سے آگے بڑھ کر ٹرے سامنے کی۔

"رپورٹس کہاں ہیں؟ پورا روم چھان مارا ہے میں نے گئی بھی تھیں تم کہ نہیں؟" اسامہ کا انداز کڑا تھا۔ سارہ دھک سے رہ گئی۔ رنگ لمحوں میں نچڑ گیا۔ جواب میں مہیب خاموشی پا کر اسامہ نے ابرو چڑھا کر اسے دیکھا تھا۔ اور جیسے بنا کچھ کہے سنے ہی معاملہ بھانپ گیا۔

"اس کا مطلب تم پریگنینٹ ہو۔ اس کا مطلب تم ابارشن نہیں چاہتیں۔ ممی کو اپنا حامی اور سفارشی بنا کر بلوایا ہے تم نے؟" اس کا بازو اسامہ کی سخت گرفت میں آ گیا۔ چائے کا مگ وہ ٹیبل پر پٹخ چکا تھا۔ تاثرات اتنے کبیدہ خاطر تھے کہ کسی کی بھی جان ہوا کر سکتے تھے۔ سارہ کو اپنے بازو کی ہڈی چٹخ کر ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس کی فولادی انگلیاں گوشت کو چیرتی لگ رہی تھیں جیسے۔ وہ مجرمانہ انداز میں تھرتھر کانپتی خاموش آنسو بہاتی رہی۔

"تم نے چھپایا مجھ سے، کب سے چھپا رہی ہو؟" وہ غرایا۔ اس کی آواز میں بادلوں کی خوفناک گھن گرج تھی۔ سارہ پھر کچھ کہے بغیر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

"میں یہ گناہ نہیں کر سکتی۔" وہ سسکی۔ جواب میں اسامہ کا قہر زناٹے دار تھپڑ کی صورت برسا تھا۔

"تمہیں یہ کرنا ہوگا۔ میں دیکھتا ہوں تم کیسے نہیں کرتیں۔" وہ بری طرح دھاڑا۔ اس کی سرد غراہٹ نے سارہ کے بدن میں سنسناہٹیں دوڑا دی تھیں۔

"ضروری نہیں ہے اسامہ اس بار بھی ایسا ہو، میں......" اسامہ کی تحکمانہ فطرت کو یہ انکار یہ وضاحت ناگوار گزری تھی۔ جلال اور غصے کی تیز لہر اٹھی تھی اس کے وجود میں، جبھی اس کا ہاتھ دوسری مرتبہ سارہ کے چہرے پر پڑا تھا۔

"لیکچر مت دو مجھے! سبق مت پڑھاؤ، مجھے خود

معلوم ہے مجھے کیا کرنا ہے کیا نہیں۔ تم ابھی چل رہی ہو میرے ساتھ اسی وقت۔ اور اس مصیبت سے چھٹکارا پاؤ گی۔ یہی سزا ہے تمہاری ہٹ دھرمی اور ضد کی بلکہ مجھ سے مقابلہ کرنے سے پہلے تم آئندہ ہزار بار تو سوچو۔'' اس کا بازو پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے وہ قہر بار انداز میں کہہ رہا تھا۔ جب ممی بہت گھبراہٹ میں بنا دستک کے اندر داخل ہوئی تھیں۔

''چھوڑو اسے اسامہ! اور فاصلے پر ہٹ جاؤ۔''

انہوں نے آتے ہی سارہ کو اس سے چھڑاتے ہوئے اسے بری طرح سے ڈانٹا، انداز تادیبی اور سرزنش کا تھا مگر اسامہ پر قطعی اثر نہیں ہوا۔

''آپ ہٹ جائیں ممی! اس معاملے میں مت پڑیں۔'' اسامہ نے ٹوک دیا تھا۔ اس کے تیز لہجے میں بڑی اجنبیت اور ترشی تھی جو ممی کو محسوس ہوئی تھی۔ کوئی اور موقع اور معاملہ ہوتا تو لازمی ردعمل بھی دیتیں مگر اس وقت کچھ اور بہت زیادہ اہم تھا اس بات پر دکھ منانے کے سوا۔

''خبردار اسامہ! خبردار چھوڑ دو سارہ کو۔ میں کہہ رہی ہوں اگر تم نے کچھ بھی غلط کرنے کی کوشش کی تو کبھی معاف نہیں کروں گی تمہیں۔'' انہوں نے اپنا پورا زور لگا کر سارہ کو جیسے تیسے اس کی جارحانہ گرفت سے آزاد کرا لیا تھا اور اپنی پشت پر اسے چھپاتے خود اس کے مقابل ڈٹ گئیں۔

''کچھ تو شرم اور خوف خدا کرو اسامہ! اللہ کے معاملات میں دخل دے رہے ہو۔ اقدام قتل کے مرتکب ہونا چاہتے ہو۔'' وہ جیسے روسی پڑی تھیں۔ ایک تلخی ایک وحشت کے ساتھ صدیوں کی ناراضگی اور تھکن ان کے ہر انداز سے عیاں تھی۔

''آپ میری اذیت کو نہیں سمجھ سکتی ہیں ممی! یہ بات طے ہے کہ مجھے اولاد نہیں چاہیے۔ یہ بچہ اس دنیا میں نہیں آسکتا۔ اگر اس نے میری مرضی کا فیصلہ نہ کیا تو میرا اس سے تعلق بھی کیا رہ جاتا ہے۔ آپ لے جا سکتی ہیں اسے۔ میں اسے برداشت نہیں کر سکتا ہوں۔ میں ہرگز بھی یہاں معذور بچوں کا ادارہ بنانے کا ارادہ نہیں رکھتا۔'' اس کی آنکھوں میں ایک جنون سا اُتر آیا تھا۔ اس نے کچھ دیر تک ہونٹ بھینچے رکھے تھے پھر گویا اپنا حتمی فیصلہ سنا دیا۔ ممی کو جیسے دھچکا لگا تھا۔ انہوں نے تڑپ کر اسے دیکھا۔ سارہ کھڑی نہیں رہ سکی۔ یکدم نیچے بیٹھ گئی۔ جیسے ساری توانائیاں اسی ایک لمحے میں نچڑ گئی ہوں۔

''اتنی معمولی بات پر اتنا شدید ری ایکشن نہیں دیتے ہیں بیٹے! جذباتی مت بنو، اور......''

''میں فیصلہ کر چکا ہوں ممی! اس گھر میں یا یہ رہے گی یا کوئی نیا آنے والا بچہ۔'' سارہ فق چہرے کے ساتھ بیٹھی رہی۔ اس کی آنکھوں سے واہمے، خدشے اور فکریں اندیشے ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرتے رہے۔ وہ ممی کو اس کے حصے کی جنگ لڑتے دیکھتی رہی۔ مگر اسامہ کی فرعونیت اپنی جگہ قائم دائم تھی۔ اس کی نمناک نگاہ اس کی پیشانی کی تفکر آمیز لکیر پر جمی رہی جو دونوں بھنوؤں کے درمیان بڑی رعونت سے گڑی رہتی تھی۔ پھر جیسے خوف اس مقام پر یکدم فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو گیا جہاں انسان ہر قسم کے انجام سے بے نیاز ہو جایا کرتا ہے۔

''ٹھیک ہے ممی! میں یہاں نہیں رہوں گی۔ یہ طے ہے کہ مجھے اپنے بچے کو نہیں مارنا۔ یہ میری آخری اُمید ہے۔ اسے کیسے کھو دوں؟ آپ چلیے میں ساتھ چلوں گی آپ کے۔ انہیں ان کے اصول مبارک ہوں۔'' اٹھ کر ممی کے مقابل آتے ہوئے وہ مضبوط لہجے میں بولی تھی۔ اسامہ کو شاید اس سے ایسی بہادری کی توقع نہیں تھی جبھی قدرے چونک کر متوجہ ہوا۔ اور اس کی آنکھوں میں اتری بغاوت تک رسائی حاصل کی۔ جس میں عزم تھا، پختگی تھی۔ اور

ہونٹ بھینچے نگاہ کا زاویہ بدل گیا۔ ممی جیسے ایکا ایکی تبدیل ہونے والی صورت حال سے دکھ کی شدت سمیت نڈھال ہونے لگیں۔

''ایسا مت کرو اسامہ بیٹے! اس دور میں خون کے رشتے بھی اتنے ناپائیدار ہو چکے ہیں کہ جیسے کانچ کے برتن، ذرا سی معمولی سی لغزش ہوئی نہیں اور چکنا چور ہوئے نہیں۔ اگر انہیں پھر کسی تدبیر سے جوڑا بھی جائے تو وہ پہلے جیسے نہیں رہتے۔ ان میں پڑنے والی بدصورت لکیریں ہر کسی کو آگاہ کر دیتی ہیں کہ انہیں دوبارہ جوڑا گیا ہے۔ اس لیے بی کیئرفل۔''

''یہ بات مجھے بتانے کی بجائے بہتر ہوتا آپ نے محترمہ کو سمجھائی ہوتی۔ شاید کچھ اثر ہو جاتا۔'' وہ تنفر و تلخی سے کہہ گیا۔ پھر انگلی اٹھا کر تنبیہ کے انداز میں سارہ کو مخاطب کیا تھا۔

''مت سمجھنا کہ میں تمہیں معاف کر دوں گا۔ اس گستاخی کا نتیجہ تو بھگتو گی تم۔ ہمیشہ کے لیے تنہائی نصیب بنے گی تمہارا۔ خود شادی کر کے تمہیں بھی طلاق نہیں دوں گا۔''

''مجھے آپ کی اس عنایت کا انتظار ہے نہ حسرت۔ میں اپنے بچوں کے ساتھ ہی بہت اچھی زندگی گزار سکتی ہوں۔ ارسل احمد کو لے جا رہی ہوں۔ ویسے بھی آپ کے لیے اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہی تھا۔''

اس کی آنکھوں میں بے بسی، بے کسی بے رخی کے ساتھ لاتعلقی بھی تھی اور آنسو بھی۔ ہونٹ جانے کس احساس کے تحت مسلسل لرز رہے تھے۔ اسامہ نے جواب نہیں دیا اور بے رخی سے نگاہ کا زاویہ بدل لیا۔

''اسامہ بیٹے......!''

''کچھ مت کہیے پھوپو جانی!'' وہ بھراہٹ زدہ آواز میں کہتی پلٹ کر تیزی سے باہر بھاگ گئی۔ ممی آہ بھر کے رہ گئی تھیں۔ اسامہ کے رعونت زدہ تاثرات میں مجال ہے فرق آیا ہو۔

☆......☆......☆

''یہ رکھ لیجیے۔'' عبدالہادی نے شاپنگ بیگز اس کے پاس ڈھیر کرتے ہوئے ایک پیکٹ بالخصوص بڑھایا۔ وہ اس کے ساتھ شاپنگ کے لیے گئی تو تھی۔ مگر جیسے ادھار چکایا تھا۔ نام کیا تھا۔ مجال ہے جو خود سے کچھ پسند کیا ہو یا دلچسپی ظاہر کی ہو۔ عبدالہادی کو جو سمجھ میں آیا وہ اس کے تاثرات کی بدولت خود ہی خریدتا رہا تھا۔ واپسی پر اس نے کھانا بھی ہوٹل سے پیک کرا لیا تھا۔ گھر آ کے خود پلیٹوں میں نکالا بھی۔

''آ جائیں، مجھے تو بہت بھوک لگی ہے۔'' وہ اسے کہہ کر خود شروع ہو چکا تھا۔ شاید توقع نہیں تھی بات ماننے کی۔ علیزے کلس کر رہ گئی اور بھوک ہونے کے باوجود ضد قائم رکھی۔

''آ جائیں ناں، کم از کم اس میں تو میں نے کچھ نہیں ملایا۔ آپ کے سامنے ہوٹل سے لیا ہے۔ اب ان شیف کو تو یقیناً نہیں پتا ہو گا اس بندے بیچارے کی ڈیئر وائف کو اس پر بھروسہ نہیں۔ ویسے میں ملا بھی کیا سکتا ہوں۔ زہر دے نہیں سکتا۔ نیند کی دوا دینے کی کیا ضرورت، جس مقصد کے لیے یہ کام کرنا ہے وہ تو آپ کی غفلت کے بغیر بھی کرنا چاہوں تو کر لوں مگر نہیں کر رہا۔ ہاں محبت پیدا کرنے کا تعویذ ضرور ملا سکتا تھا۔ مگر کیا کروں وہ مجھے بنانا نہیں آتا۔''

عبدالہادی کی تیز چلتی زبان نے علیزے کو پہلے حیران کیا تھا پھر غصے میں سرخ، یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اس کا اس کے مزاج کا لحاظ کیے بغیر فل اسٹاپ کو مے کے بولا تھا۔

''تم کچھ زیادہ بکواس نہیں کرنے لگے۔ اور یہ میری ہی دی ہوئی ڈھیل ہے۔'' علیزے کو جتنا

ناگوار لگا تھا وہ اسی قدر بے لحاظ ہو کر کہہ گئی تھی۔
"نہیں بلکہ یہ میری دی ہوئی ڈھیل ہے کہ آپ اتنی آزاد، خود مختار اور بے باک ہو رہی ہیں۔ لیکن کوئی بات نہیں۔ یہ آپ کا وقت ہے ملکہ عالیہ!" اس نے کاندھے اچکائے تھے۔ علیزے اتنا جھلائی کہ تلملاتی ہوئی اُٹھ کر وہاں سے اندر چلی گئی۔
"یہ موبائل فون ہے۔ یہ سوچ کر رکھ لیں کہ آپ کو اپنی اُم جان سے بات کرنے میں سہولت ہو جائے گی۔ جانتا ہوں اتنی انا پرست ہیں کہ مجھ سے نہیں لیں گی۔" وہ بات کے اختتام پر مسکرایا تھا اور پیکٹ اس کے پاس چھوڑ کر خود باہر چلا گیا۔ علیزے کچھ دیر ساکن بیٹھی رہی تھی پھر رہ نہیں سکی اور ڈبہ کھول کر جھمچاتا ہوا بیش قیمت موبائل نکال لیا۔ سم کارڈ بھی موجود تھا۔ جو ایکٹو ہو چکا تھا۔ اس نے سم سیٹ کی اور موبائل آن کر لیا۔
"السلام وعلیکم! کیا ہو رہا ہے جناب، لگتا ہے خوب شاپنگ ہوئی ہے۔" علیزے نے چونکتے ہوئے سر اونچا کیا تھا۔ لاریب کو روبرو پا کے بہت نارمل انداز میں اس سے ملی۔
"شکر ہے خدا کا، تم خفا نہیں ہو ورنہ میں تو ڈر ڈر کے آدھی جان سکھا چکی تھی۔ بیشک اپنے بھائی سے پوچھ لو۔" لاریب نے محبت سے کہتے اس کا گال چوم لیا۔
"میں اپنے نصیب سے سمجھوتا کر چکی، نصیب سے لڑا نہیں جا سکتا۔" اس کے لہجے میں عجیب سی یاسیت گھل گئی تھی۔ جو لاریب کو شدت سے محسوس ہوئی تھی مگر اس پر مزاح کا تاثر پھیلانے کی کوشش کی۔
"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ تمہارا نصیب تو عبدالہادی ہے اور وہ بہت اچھا اور حسین ہے۔" علیزے کے چہرے پر تکلیف دہ تاثر ابھرا مگر خاموشی کو بہتر سمجھا تھا۔
"بھائی کہاں ہیں؟" اس نے حیرانی سے سوال کیا۔
"عبدالہادی کے ساتھ تمہارے گھر کی بیٹھک میں۔" لاریب اٹھتے ہوئے اپنا عبایا اُتارنے لگی۔
"شاپنگ تو دکھاؤ اپی۔" علیزے نے کچھ کہے بغیر ایک ایک چیز کو کھول کر اس کے سامنے رکھنا شروع کر دیا تھا۔ لاریب بے ساختہ تعریف کیے گئی۔
"بہت اعلیٰ، کس کی چوائس ہے۔" لاریب نے ایک سوٹ کھولا جس کا دوپٹا شیفون کا تھا اور چاروں جانب بہت خوبصورت آف وائٹ لیس سے مزین کیا گیا تھا۔
"کم از کم میری نہیں ہے۔ تم دیکھو سب، میں چائے بناتی ہوں۔" اس نے سپاٹ انداز میں کہا اور اٹھنے لگی تھی کہ لاریب نے بے اختیار اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔
"تھوڑا سا دل بڑا کر لو علیزے اس شخص کے لیے بھی۔ جو اپنے ہر انداز سے محبت لٹا رہا ہے تم پر۔" اس کے انداز میں جیسے التجا در آئی۔ علیزے کچھ ثانیے یونہی اسے تکتی رہ گئی تھی۔
"وہ صرف مجھے لوٹنا چاہتا ہے۔ میرے ایمان میری پارسائی اور میرے اللہ کو چھیننا چاہتا ہے مجھ سے۔ اسے ہر طرح ناکامی ہو رہی ہے تو اس کے تیور بھی بدل رہے ہیں۔ عنقریب وہ مجھے یہاں سے لے جائے گا۔ اپنی ناکامی کا احساس اسے پوری طرح عیاں کرنے والا ہے۔ میں تو وہ روپ دیکھوں گی ہی کاش تم لوگوں کو بھی دکھا سکتی۔"
اس کی آواز زبھیگ کر مدھم ہوتی بالکل سرگوشی میں ڈھل گئی۔ لاریب فطری طور پر اس کی بات کے زیر اثر آ گئی تھی۔ مگر یوں خاموش تھی جیسے تسلی و دلاسے کے لیے الفاظ ختم ہو گئے ہوں۔

''اور یاد رکھنا لاریب! اگر میں وہاں سے زندہ سلامت واپس نہ آئی تو سمجھ لینا اس شخص نے اپنی اصلیت چھپانے اور اپنے مذموم ارادوں کی ناکامی کی بدولت یا تو مجھے خود موت کے گھاٹ اُتار دیا ہے یا پھر میں نے خودکشی کرلی ہے۔'' اب کے اس کے لہجے میں عجیب سی برودت اور تلخی گھل گئی تھی۔ لاریب نے بے اختیار گھبرا کر اِسے ایسے گلے سے لگایا جیسے مرغی کسی خطرے کو محسوس کرکے چوزوں کو اپنے پروں میں سمیٹتی ہے۔

''پلیز علیزے! اللہ کا نام لو، مت ڈراؤ مجھے۔'' وہ واقعی ہول گئی تھی۔ سہمی ہوئی لرزتی آواز میں بولی تو علیزے نے تلخی کے ساتھ محض مسکرانے پر اکتفا کیا تھا۔ اس کے ہاتھ ہٹائے اور کچن میں جا گھسی۔ عبدالہادی کی ایک خوبی کی تو وہ بھی معترف نا چاہتے ہوئے بھی ہوئی تھی۔ اس کے مزاج اور گریز کو پاتے ہوئے بنا کہے وہ ہر چیز گھر میں لاکر رکھا کرتا تھا۔ چاہے وہ مہمان کی ضیافت کے حوالے سے تیاری کا معاملہ ہو یا اس کی ضرورت کا کوئی بھی اور کام۔ اسے کبھی کسی ضرورت کے لیے کہنے کی حاجت نہیں ہوئی تھی۔ چائے تیار ہونے تک اس نے ٹرے سجالی تھی۔ کیک، کباب، نمکو کے علاوہ بھی ایک دو قسم کے بسکٹ، چائے مگوں میں نکال کر اس نے ٹرے اٹھالی۔

''آجاؤ وہیں، بھائی تو یہاں آئے نہیں تمہارے۔'' لاریب اسے دیکھ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ علیزے نے اُس کے ڈھیلے اور سست انداز کو محسوس کیا تھا۔

''خیریت؟ کچھ بیمار لگ رہی ہو۔'' جواباً لاریب کے چہرے پر حجاب کا گلابی رنگ پھیل گیا تھا۔

''تمہیں پھر سے پھوپو بنانے کی تیاری ہے اور تو کچھ نہیں۔ تم بتاؤ، ایسی خبر تم سے کب تک ملے گی؟'' لاریب نے ایک دم اس پر گرفت کرلی۔ علیزے کے چہرے پر اگر الاؤ دہک اٹھے تھے تو اس کی وجہ عبدالہادی کی چانک آمد اور اس بات کو سُن لینا ہی ہوسکتا تھا۔ اس کا ردِعمل یہ تھا کہ وہ کچھ دیر آنچ دیتی نظروں سے اس کے چہرے کو بالخصوص دیکھتا رہا تھا۔ علیزے کے اندر غضب کی ٹوٹ پھوٹ مچی۔ نفرت کا شدید احساس اندر سر پٹختا رہا تھا۔ کچھ کہے بغیر اس نے شاکی نظروں سے لاریب کو دیکھا تھا۔ اور ٹرے اسے تھمادی۔

''لے جاؤ اندر۔'' اس کا لہجہ بجھا ہوا تھا۔ لاریب حیران رہ گئی۔

''تم نہیں چلوگی؟ اپنے بھائی سے نہیں ملنا۔'' علیزے نے جواب دینا بھی گوارا نہیں کیا اور پلٹ کر اندر کمرے میں گھس گئی۔

''آجایئے بھابی! میں چائے کا ہی پوچھنے آیا تھا۔'' عبدالہادی سنجیدہ تھا۔ کمال کا ضبط اس کے انداز سے عیاں تھا۔ لاریب نے گہرا سانس بھرا اور اندر آگئی۔

''علیزے......؟'' عبدالغنی جو اسی کا منتظر تھا۔ مستفر ہوا تھا۔

''آپ چائے لیں۔ آجاتی ہے وہ بھی۔'' لاریب کے رسان سے کہنے پر عبدالغنی نے ایسی نظروں سے اسے دیکھا گویا اندازہ کرنا چاہتا ہو علیزے سے اس کا کیا معاملہ طے پایا۔ لاریب نے نظروں ہی نظروں میں تسلی دی تھی۔

''میں علیزے کو دیکھ لوں۔'' عبدالغنی نے جیسے بامشکل چائے ختم کی تھی۔ لاریب اس کے ہمراہ ہی کھڑی ہوئی۔ عبدالہادی وہیں سر جھکائے جیسے کسی سوچ میں گم بیٹھا رہا۔ عبدالغنی دروازہ بجا کر اجازت ملنے پر اندر آیا تھا۔ بلکہ علیزے خود اُٹھ کر اس کے

شانے سے آ لگی۔
''کیسی ہو علیزے گڑیا!'' وہ بے حد اپنائیت و محبت سے اس کا سر تھپکنے لگا۔
''ٹھیک ہوں بھائی! آپ بیٹھے ناں!'' اس نے کرسی کی جانب اشارہ کیا۔
''عبدالعلی کو بھی لے آتے اپ، ملنے کو دل کر رہا تھا۔''
''عبدالعلی اسکول گیا تھا۔ ورنہ ضرور لاتے۔ تم آ ؤ گی اب تو مل لینا۔'' عبدالغنی مسکرایا۔ علیزے خاموش ہوگئی۔
''کیوں اُلجھتی ہو میری جان! پریشانی سوچنے سے بڑھتی ہے۔ سوچوں کو صحیح مرکز پر لے آؤ۔'' عبدالغنی کے ٹوکنے پر وہ چونک کر نم نظروں سے اسے دیکھتی مسکرائی تھی۔
''بھائی! اُم جان سے بات کرنی ہے۔ ان کا سیل نمبر دے دیں۔ اور مناسب ہو تو ان سے گزارش کردیجیے گا۔ ان کی بیٹی بہت اضطراب میں ہے۔ دکھ کی اس کیفیت سے نجات کی التجا کردیں رب کریم سے۔'' بات کے اختتام تک وہ رو پڑی تھی۔ عبدالغنی بے اختیار اُٹھ کر اس تک آیا تھا۔ اور اسے خود سے لگالیا۔
''غیر یقینی اور تذبذب واقعی بہت جان لیوا کیفیت ہے۔ ہم سب کی دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔ اللہ بہتر فیصلہ کرے گا۔ میں خود تمہاری اُم جان اور بابا جان سے بات کراتا مگر اس وقت وہ حج پڑھ رہے ہوں گے۔ آج حج کا مبارک دن ہے۔'' عبدالغنی نے خود اس کے سیل فون میں اُم جان کا نمبر سیو کیا تھا۔ اس کے بعد بھی بہت دیر تک اسے بہلاتا رہا تھا۔ سمجھاتا رہا تھا۔
''غلطی زندگی کا ایک صفحہ ہوتا ہے علیزے، اور رشتہ ایک پوری کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے کبھی بھی پوری کتاب کو صرف ایک صفحے کے لیے نہیں چھوڑنا۔'' وہ جاتے جاتے اسے اہم نصیحت کرگیا تھا۔ علیزے پر فی الحال اس نصیحت کا کوئی اثر نہیں تھا۔

☆......☆......☆

''کیسے ہیں آپ؟'' بریرہ کے فون پر بھی اب ہارون نے حیران ہونا چھوڑ دیا تھا۔ اس لیے بات کرتے ہوئے لہجہ نارمل ہوتا۔
''عبداللہ ٹھیک ہے؟'' اس نے بات بدل دی۔ اس کی خفگی کا تاثر اس بات سے بھی ہوجاتا تھا کہ وہ اپنے متعلق باتوں کے اسے جواب نہیں دیا کرتا تھا اور بریرہ کے لیے یہی کافی تھا کہ وہ اس سے بات کرلیتا تھا۔ کوئی بھی عمل ہو۔ ایک دم سے ہائپر نہیں ہوجایا کرتا، بتدریج اسے اپنا تاثر قائم کرنا ہوتا ہے۔ تبدیلی اور وہ بھی مثبت تبدیلی محنت جانفشانی، لگن اور خونِ جگر کی متقاضی ہوا کرتی ہے۔ بریرہ تو یہ سب کچھ لٹانے پر آمادہ تھی۔ اور صبر سے انتظار کرنا چاہتی تھی۔
''اللہ کا فضل ہے ٹھیک ہے۔ اب آپ سے مانوس ہو رہا ہے۔ آپ کو اکثر ڈھونڈتا ہے۔ مِس کرتا ہے۔''
وہ جوش و خروش سے بتا رہی تھی۔ اور ہارون کا دل مچل گیا تھا صرف دو لفظ بولنے کو اور تم......؟'' مگر اس نے ہونٹ بھینچے رکھے۔ وہ بریرہ کو یہ خوشی اور خود کو اجازت نہیں دے سکتا تھا۔
''آپ آئیں گے ناں عید پر؟'' وہ کتنی آس سے گویا ہوئی تھی۔ ہارون نے پھر چپ سادھ لی۔
''اسامہ بھائی کے فیصلے کا تو معلوم ہوا ہوگا آپ کو ممی سے، بہت پریشان ہیں یہاں سب، آپ بات کریں ناں اسامہ بھائی سے۔ انہیں سمجھایئے۔''
''کیا سمجھاؤں؟ کیا کہوں......؟ میں تو تمہیں

نہیں سمجھا سکا تھا۔ خود اپنے لیے کچھ نہیں کر سکا۔ اتنا بودا اس قدر کمزور انسان کسی اور کے لیے کیا کرے گا۔'' اس کا لہجہ طنزیہ ہوا اور بریرہ کو چپ لگی تھی۔

''عید پر آجایئے گا، ممی کو کچھ ڈھارس ہی مل جائے گی آپ کی موجودگی سے۔'' ہارون سرد آہ بھر کے رہ گیا۔

''یہاں میری بیوی میرے ساتھ کئی پروگرام طے کیے بیٹھی ہے۔ اگر میں شامل نہ ہوا تو ایک طوفان اٹھا دے گی۔ اُسے ویسے بھی تم پر بہت اعتراض ہے۔ کیوں اس کی شکایات کو بڑھاتی ہو؟'' اس کا انداز عجیب تھا۔ بریرہ کو ایک بار پھر چپ لگ گئی۔ ہارون نے مزید کچھ کہے بغیر فون بند کر دیا۔ بریرہ وہیں بیٹھی رہی تھی۔ کھڑکی کھلی تھی اور لان میں بھیگتا ہوا منظر اس کی نگاہ کی زد پر تھا۔

بارش وقفے وقفے سے جاری تھی۔ وہ اُٹھ کر کھڑکی کے نزدیک آ گئی۔ عبداللہ ممی کے ساتھ لان میں چھتری کے نیچے موجود تھا۔ ساتھ ارسل احمد اور سارہ بھی نظر آ رہی تھی۔ سارہ چند دنوں میں آدھی بھی نہیں رہ گئی تھی۔ دکھ اور پچھتاوا اسے گھلانے کا باعث بن رہا تھا۔ ابھی صبح ہی وہ اسے سمجھا رہی تھی تو سارہ نے جواب میں اُداس نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بے بسی سے کہا تھا۔

''میری بے مائیگی نے مجھے کبھی سر اٹھانے ہی نہیں دیا تھا بھابی! اور میں سر اٹھاتی بھی بھلا کیوں؟ یُوں جن سے محبت ہو جنھوں نے کبھی احسان کیا ہو ان سے لڑا نہیں جا سکتا۔ اچھا سلوک چاہے وہ کسی کا بھی ہو اگر آپ احسان فراموش نہیں ہیں۔ بے خبر نہیں ہیں تو آپ کو سر اٹھانے نہیں دے گا۔ اسامہ کے ارسل احمد کے ساتھ غیر حقیقی رویے پر جبھی میں کوئی احتجاج بلند نہیں کر سکی۔ لیکن یہ انتہا تھی۔ اب کے میں یہ چوٹ چپ چاپ برداشت نہیں کر سکی۔ اسامہ سے البتہ یہ دکھ اٹھانا بہت اذیت انگیز ہے۔ میں ان سے بیشک لڑ نہیں سکی۔ میرا سر جھکا رہا۔ زبان نے ساتھ نہیں دیا۔ مگر میں اپنی اولاد کو اپنے ہاتھوں نہیں ختم کر سکی۔'' اس کی آنکھیں برس رہی تھیں۔ موسم کی طرح خاموشی سے بے آواز۔

''لیکن یہ دکھ روح کا ناسور بن رہا ہے۔ ان کا ناروا سلوک دلوں کو کاٹ جاتا ہے۔ اپنوں کی ماننا پڑتی ہے یا پھر انہیں چھوڑنا پڑتا ہے۔ میں نے چھوڑ دیا۔ میں مان جو نہ سکی تھی۔ ان دونوں کے بیچ کوئی راستہ نہیں نکلتا تھا۔'' بریرہ نے اپنا ہاتھ تسلی آمیز انداز میں اس کے کاندھے پر رکھ دیا تھا۔

''صبر اور حوصلے کی سخت ضرورت ہے آپ کو سارہ! یہ آزمائش ہے آپ کی۔ آپ نے بہتر نہیں بہترین انتخاب کیا ہے۔ آپ نے اس آزمائش میں سرخروئی پالی ہے۔ ورنہ بعض عورتیں آخرت کے گھر پر اس عارضی گھر کو ترجیح دے جایا کرتی ہیں۔ اللہ کی خوشنودی کو چھوڑ کر شوہر کی رضا میں اللہ کی مقررہ حدود کو پھلانگ جایا کرتی ہیں۔ غم نہ کریں۔ اور ہرگز نہ پچھتائیں۔ اللہ آپ کے ساتھ ہے یہ یقین قائم رکھیے۔ آگے بھی وہ آپ کے ساتھ ہوگا۔ آپ کی مدد کرے گا۔'' اور یہ پہلا موقع تھا کہ سارہ کا چہرہ اس دوران جگمگایا تھا۔ اس نے بے اختیار اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے تھے۔

''آپ دعا کرنا بھابی! اللہ پاک مجھے صحت مند اولاد سے نوازے۔''

''انشاءاللہ! ایسا ہی ہوگا۔ اور سارہ بالفرض ایسا نہیں ہوا تو اللہ کی رضا اور حکمت کو سمجھنے اور قبول کرنے کی کوشش کیجیے گا۔'' بریرہ کے کہنے پر وہ مدھم سا مسکرائی تھی۔

''انشاءاللہ!'' اور بریرہ محبت سے اس کا ہاتھ تھپکتی اُٹھ گئی تھی۔

☆......☆......☆

اس نے گلابی دوپٹا اوڑھا اور اچھی طرح اپنے گرد پھیلا لیا۔ یہ عیدالاضحیٰ کا دن تھا۔ عبدالہادی صبح کا نکلا ہوا تھا۔ عید کی نماز تو ہو چکی تھی۔ علیزے نے پورے گھر کو پہلے چمکایا تھا۔ پھر کچن میں آ کر شیر خورمہ تیار کیا تھا۔ اس کے بعد خود نہانے چلی گئی۔ بال سلجھا کر خشک کیے اور یونہی سمیٹ کر کیچر لگا دیا۔ بکرے کی آواز سن کر وہ چونکی تھی اور دوپٹا سنبھالتی تیزی سے باہر آ گئی۔ چارہ اور پانی وہ پہلے ہی سامنے رکھ گئی تھی۔ اب دوبارہ پانی پلانا چاہا مگر بکرا منہ نہیں لگا رہا تھا۔ وہ تیزی سے پلٹی اور کچن میں آ کر دو چار رس گلے فریج سے نکال کر پلیٹ میں رکھے واپس آ گئی۔ عبدالہادی نے اسے بہت مگن انداز میں بکرے کے لاڈ اٹھاتے دیکھ کر گہرا سانس بھرا تھا۔

''اسے چارہ کھلا دیا۔ کوئی طلب نہیں رہنی چاہیے۔'' اسے تیز دھار کی چھری سنبھالے تیار پا کر علیزے کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ خائف ہوتی بے اختیار پیچھے ہٹی۔

''تت تو کیا اب اسے ذبح کر دیں گے؟'' عبدالہادی نے دلچسپی سے اس کی پیلی پڑتی رنگت کو دیکھا تھا پھر دل آویز انداز میں مسکرایا۔

''ظاہر ہے ہٹیں آپ، میں اسے کھولتا ہوں۔'' وہ آگے آیا تو علیزے نے بے اختیار ہوتے کانپتے ہاتھوں سے اس سے چھری لے لی۔

''اسے تو سائیڈ پر کر دو فی الحال ابھی سے اس کی جان کیوں نکالنی ہے۔'' وہ سخت خفا ہو کر کہہ رہی تھی۔ عبدالہادی کا دل قہقہہ لگانے کو مچل گیا تھا۔ کتنا پیارا تھا یہ اس کا روپ، حواس چھین لینے والا، گستاخی پر آمادہ کرتا ہوا۔ مگر اسے خود احساس تک نہیں تھا۔

''ک...... کہاں ذبح کریں گے؟'' اس نے لرزتی آواز میں سوال کیا۔

''بیٹے یہ عبدالہادی ہی کرتا ہے ذبح! میں تو اب بوڑھا ہو گیا ہوں۔ ہاتھ لرز جاتا ہے تکبیر کے وقت چھری پر۔'' شاہ صاحب بھی آ گئے تھے۔ اس کی معلومات میں گراں قدر اضافہ کیا تو صحیح معنوں میں علیزے کا منہ کھلا رہ گیا۔ اس نے سخت بے چین ہو کر پہلے شاہ صاحب کو پھر عبدالہادی کو دیکھا تھا۔

''آپ مجھے لگتا ہے ڈر رہی ہو بیٹے! چلو ہم تکبیر باہر کر لیتے ہیں۔''

شاہ صاحب اس کی متغیر رنگت سے یہی نتیجہ اخذ کر سکے تھے جبھی ڈھارس دی۔

''نہیں میرا خیال ہے انہیں دیکھنا چاہیے۔ قربانی کے جانور کا جیسے ہی خون کا پہلا قطرہ زمین پر گرتا ہے۔ سال بھر کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اللہ پاک کے نزدیک دس ذوالحجہ کے دن قربانی کے جانور کے خون بہانے سے بڑھ کر کوئی پسندیدہ عمل نہیں ہے۔''

عبدالہادی بکرے کی زنجیر کھول چکا تھا۔ بہت بے اختیاری کی کیفیت میں کہہ گیا۔ علیزے نے اسے گھورتی نظروں سے دیکھا تھا۔ پھر اس کے پاس سے گزرتے ہوئے قدرے پست آواز میں اس سے مخاطب ہوئی تھی۔

''تم ذرا اندر آ کر میری بات سن لو۔'' اس نے لفظ گویا چبا ڈالے تھے۔ عبدالہادی اس کے انداز سے بہر حال کسی خوش فہمی کا شکار نہیں ہو سکتا تھا۔ جبھی سرد آہ بھرتا، بکرا شاہ صاحب کے سپرد کرتا اس کے پیچھے آ گیا۔

''جی حکم فرمائیے!'' کمرے میں آ کر اس نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا تھا۔

''تم بکرا ذبح نہیں کرو گے سمجھے؟ اسے میں نے اتنے دن اپنے پاس رکھا ہے۔ بہت مانوس ہو گئی تھی

میں اس سے۔ اس محبت کا یہ تقاضا ہے کہ میں اسے کسی جھوٹے اور منافق کے ہاتھوں ضائع نہ ہونے دوں۔ بی کوز میں واقعی یہ چاہتی ہوں۔ اس کی قربانی اللہ کی راہ میں مقبول ہو۔'' اس کا لہجہ جو آگ برسا رہا تھا وہی آگ عبدالہادی کے چہرے پر بھڑک گئی تھی۔

''یہ اگر آپ کا حکم بھی ہے دیا صاحبہ تو اسے ماننے سے قاصر ہوں۔ جانتی ہیں کیوں؟ آپ کے حکم کے مقابل اللہ کا حکم ہے اور میرے نزدیک اللہ کے حکم کو ہی اولیت وفوقیت حاصل ہے۔ اک مشورہ بھی آپ کو دوں گا۔ یہ اللہ کے معاملے ہیں۔ انہیں اپنے ہاتھ میں لینے کی گستاخی مت کریں۔ وہ خوب جانتا ہے دلوں کے بھیدوں کو۔ آپ مجھے جو سمجھتی ہیں سمجھیں۔ مگر آئندہ ایسی بات سوچنے اور کرنے سے گریز ضرور کیجیے گا۔'' اپنی بات مکمل کر کے وہ رُکا نہیں تھا۔ جھٹکے سے پلٹ کر چلا گیا۔ علیزے جیسے پتھرا سی گئی تھی۔ سوچنے اور غور کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ جیسے اس کے منہ پر طمانچہ مار گیا تھا۔ اس نے جانا وہ واقعی اللہ کے معاملے میں گستاخی کی مرتکب ہوگئی ہے۔ کم از کم اس حد تک تو وہ بالکل درست تھا۔ اس کا دل لرزنے لگا۔ اس نے یہ بھی جانا تھا اگر وہ اسے دھوکہ بھی دے رہا تھا۔ تو اس میں شک نہیں تھا۔ اس مرتبہ وہ بہت تیاری کے ساتھ میدان میں اترا تھا۔ یا تو وہ واقعی بہت بڑا اداکار تھا یا پھر وہ حقیقتاً وہی تھا جو نظر آ رہا تھا۔ مگر حقیقت بہر حال غیر واضح تھی۔ اسے حقیقت تک رسائی کے لیے اللہ کی رہنمائی کی ضرورت تھی۔

☆......☆......☆

اس پر سخت یاسیت اور بے دلی کا دورہ پڑا ہوا تھا، جبھی کسی کو بھی عید کی مبارکباد دینے کو کال نہیں کی۔ سب کے فون آتے رہے تھے۔ لاریب اور عبدالغنی کا، بریرہ کا، یہاں تک کہ اُم جان اور بابا جان نے بھی خود اس سے بات کی تھی۔

''آج شام کو تمہاری دعوت ہے ادھر، عبدالہادی اور شاہ صاحب کو تو ہم نے کہہ دیا ہے۔ عبدالغنی نے اسے کہا تھا۔ وہ محض سر ہلا کر رہ گئی تھی۔

''ہم نے چھت پر باربی کیو کا ارینج کیا ہے۔ ہارون بھائی اور اسامہ بھائی بھی آئیں گے۔'' لاریب فون پر چہک رہی تھی۔

''ٹائم پر پہنچ جانا، یہ نہ ہو راہ دکھاؤ اپنی ہمیں۔''

''ٹھیک ہے آ جاؤں گی۔'' اس نے ٹال دیا تھا۔

''علیزے بیٹے! یہ گوشت سنبھالو۔'' شاہ صاحب پکار رہے تھے۔ وہ اُٹھ کر کمرے سے نکل آئی۔

''انہوں نے صحن میں تین ڈھیریاں لگا رکھی تھیں۔ برابر برابر، یہاں تک کہ سری پائے بھی ساتھ ہی کٹوا کر تینوں حصوں میں ڈال دیے تھے۔

''یہ غریبوں کا ہے۔ ابھی عبدالہادی پہنچا آئے گا کچی بستی میں، یہ رشتے داروں کا ہے۔ آپ اپنے تمام رشتے داروں کا حصہ بانٹ لو۔ یہ حصہ گھر کا ہے یعنی تمہارا، اس سے پہلے تو ہم یہ بھی بانٹ دیا کرتے تھے۔ مگر اس مرتبہ آپ ہو تو جو دل چاہے بنا لینا۔ مگر بیٹے اب سنبھال لو۔''

وہی اس سے بات کر رہے تھے۔ عبدالہادی سامان سمیٹ رہا تھا۔ چھری گنڈاسا وغیرہ...... اس کے سفید لباس پر جگہ جگہ خون کے بڑے بڑے دھبے تھے۔ یہاں تک کہ سنگِ مرمر کے جیسے پیروں پر بھی اور اُجلی چاندنی جیسے روپہلے چہرے پر بھی، جو بلاشبہ بدنما لگنے کی بجائے اسے مزید نمایاں کر رہے تھے۔ علیزے نے اندر باہر کام کے دوران آتے جاتے اسے بہت ماہرانہ انداز میں کھال اتارتے بکرے کو

اور پرا ٹا نگتے گوشت بناتے دیکھا تھا اور اس کی ناراضگی کو بھی محسوس کیا تھا۔ یہاں تک کہ شاہ صاحب کے ساتھ جو چائے وہ اسے دے کر گئی تھی۔ وہ بھی جوں کی توں پڑی تھی۔ اب پتا نہیں یہ اس کی ناراضگی تھی یا وہ واقعی اتنا مصروف تھا کہ اپنے لیے اتنا سا بھی ٹائم نہیں نکال پایا تھا۔

''آپ پہلے کچھ کھا تو لیں۔ میں نے صبح سے شیر خورمہ بنا کر فریج میں رکھا ہوا ہے۔''

''ہاں بیٹے! اب کام نپٹ گیا ہے تو کھاتے ہیں۔ پھر ہی جا کے نہاؤں گا میں تو۔'' وہ گھٹنوں پر دونوں ہاتھ کا دباؤ ڈالتے ہوئے اٹھے اور واش بیسن پر جا کر ہاتھ دھونے لگے۔ علیزے نے عبدالہادی کی جانب دیکھا۔ وہ دو دو کلو گوشت کے پیکٹ بنانے کے بعد اب ایک تھیلے میں ڈالنے میں مصروف ہو چکا تھا۔ وہ سر جھٹک کر کچن میں چلی گئی۔ شیر خورمے کا ڈونگا ٹرے میں رکھا ساتھ میں چمچ اور پلیٹیں اور باہر آ گئی۔ چھوٹی میز کرسی پر آ کر بیٹھ جانے والے شاہ صاحب کے برابر رکھی اور ٹرے رکھ دی۔

''چائے پئیں گے چاچو!'' اس نے کچن سے ہی پکار کر پوچھا تھا جب عبدالہادی اپنے حصے کے گوشت کی بڑی ٹرے اٹھائے کچن میں آیا اور سلیب پر رکھ کر مڑ گیا۔

''نہیں بیٹے! ضرورت نہیں، جزاک اللہ۔''

''چلیں چاچو!'' عبدالہادی نے بائیک کی چابی اٹھاتے انہیں دیکھا۔

''پہلے کچھ کھا لو اللہ کے بندے! نہا دھو لو، پھر چلے جائیں گے۔'' انہوں نے نرمی سے ٹوکا تھا۔

''نہیں، پہلے یہ کام نپٹنے دیں۔'' اس کی سنجیدگی میں فرق نہیں آیا تھا۔ شاہ صاحب نے کاندھے اچکا دیے۔ پھر علیزے کو پکار کر دروازہ بند کرنے کا کہتے اس کے پیچھے چلے گئے۔

''یہ رشتہ داروں کا حصہ ہے، پیکٹ بنا رکھنا بیٹے! یہ لڑکا آج اس بڈھے کو اپنے ساتھ خود بھی چین سے بیٹھنے نہیں دے گا۔'' انہوں نے مزاح کے رنگ میں کہا تھا، علیزے محض مسکرا دی۔

دروازہ بند کرنے کے بعد اس نے پہلے لہسن پیاز ڈال کر گوشت دھو کر ککر میں چولہے پر چڑھایا پھر گوشت کے پیکٹ بنا کر باقی ماندہ گوشت فریز کرنے لگی۔ جو قیمہ بنانا تھا اس کو الگ نکال لیا۔ اس کے بعد صحن میں موجود ڈھیری کی جانب متوجہ ہوئی تھی۔ اور سبھی رشتہ داروں کے حصے الگ کیے۔ یہاں تک کہ شاہ صاحب کا بھی، پیکٹ ایک بڑے شاپر میں ڈال کر پرات میں رکھا اور فریج کے نچلے خانے میں رکھ چھوڑا۔ اس کے بعد پائپ لگا کر دھلائی میں مصروف ہوئی تھی۔ جب تک عبدالہادی لوٹا۔ وہ رگڑائی مانجھائی کر کے پھر سے چمکا چکی تھی۔ مگر خود سر سے پاؤں تک شرابور تھی۔ عبدالہادی نے متاسفانہ نظروں سے اس کا حلیہ ملاحظہ کیا۔

''آپ کو کیا ضرورت تھی یہ سب کرنے کی؟''

''تو پھر اور کون کرتا؟'' وہ نا چاہتے ہوئے بھی تلخ ہوگئی۔

''میں خود کر لیتا۔'' عبدالہادی کے جواب پر وہ تنفر سے بھر گئی۔ اور پیر پٹختے ہوئے اندر گئی تھی۔

''وائپر میں لگا لیتا ہوں۔'' وہ بائیک اسٹینڈ کر کے آیا تو جلدی سے اس کے ہاتھ سے وائپر پکڑنا چاہا تھا۔ علیزے نے ہاتھ پیچھے کر لیا۔

''میرے کام میں مداخلت نہیں کرو سمجھے؟'' وہ جیسے غرائی تھی۔

''میں نہیں چاہتا اس دن کی طرح پھر آپ......''

''اگر تم خود اپنی نظروں پر کنٹرول رکھو گے تو ایسا ضروری بھی نہیں ہے۔'' وہ جھلا کر کہہ گئی تھی۔ جواباً

عبدالہادی کی آنچ دیتی نظروں کو سہنا آسان نہیں رہا تھا۔ وہ دانستہ رُخ پھیر کر لرزتے ہاتھوں کی پھسلتی گرفت سے چھوٹے وائپر کو سنبھالے اپنے کام میں مصروف ہوئی تھی۔ وہ کچھ دیر یونہی اسے دیکھتا رہا تھا پھر پلٹ کر کمرے میں چلا گیا۔ علیزے دوبارہ نہا کر آئی تو اسے چولہے کے آگے کھڑے سالن بھونتے پایا تھا۔ ہلکے بادامی کرتا شلوار میں اس کی دراز قامت کچھ اور بھی نمایاں ہو رہی تھی۔ چہرے کی رنگت جیسے لباس سے مل رہی تھی۔ ہلکی نمی لیے سر کے گھنے بال اور ریشمی چھوٹی داڑھی...... اگر تعصب اور نفرت کو ہٹا کر دیکھا جاتا تو اس کا یہ نکھرا ستھرا مقدس روپ اور چہرے کی انوکھی چمک دل میں انوکھی کشش کے احساس کو جنم دیتی تھی۔

''میرا خیال ہے اگر مجھے سالن چڑھانا آتا تھا۔ تو اسے بھوننا بھی آتا ہی تھا۔'' اس نے چونکہ پہلی بار اسے ذرا غور سے دیکھا تھا۔ اور دل میں نرمی کا ابھرتا تاثر خاصا گراں گزرا تھا۔ جبھی ترُخ کر کہتے گویا اپنی تسلی کی تھی۔ عبدالہادی چونک کر پلٹا۔ اسے آف وائیٹ خوبصورت سی کڑھائی کے لباس میں نم بالوں کے ہمراہ خفا خفا تاثرات کے ساتھ کھڑے پا کر خفیف سا ہو گیا۔

''آئی ایم سوری اگر آپ کو اچھا نہیں لگا تو۔ ایکچو لی مجھے کچھ زیادہ ہی بھوک لگی ہوئی تھی جبھی......''

بات ادھوری چھوڑتا وہ چمچ رکھ کر خود سائیڈ پر ہو گیا تھا۔ علیزے کچھ نہیں بولی اور فریج سے کچھ فروٹ اور مٹھائی کے ساتھ شیر خورمہ نکال کر ٹرے میں رکھنے کے بعد اس کے سامنے رکھ دیا۔ عبدالہادی نے مہربانی کے اس مظاہرے کو خوشگواریت میں گھر کر محسوس کیا تھا۔ اسے اگر وہ چائے پیش کرتی رہی تھی۔ تو یہ اس کی مجبوری تھی کہ کوئی نہ کوئی موجود ہوتا تھا۔ وہ اسے بہرحال تب چھوڑنے کی پوزیشن میں نہیں ہوا کرتی تھی۔

''جزاک اللہ! نوازش مہربانی۔'' وہ ٹرے پکڑتے ہوئے بے ساختہ چہکا۔

''اتنی محبت سے اگر آپ زہر بھی پیش کریں تو وہ بھی پی جائیں۔ گو کہ اس کی طلب نہیں تھی مگر وہی بات کہ آپ کے لیے تو......''

''یہاں سے جاؤ ورنہ میں لحاظ نہیں کروں گی۔'' وہ چیخ پڑی تھی۔ عبدالہادی سرد آہ بھرتا کچن سے نکلا تھا۔ علیزے نم آنکھوں سے ہانڈی سے اٹھتی بھاپ کو دیکھتی رہی۔ دل عجیب خالی خالی سا ہو رہا تھا۔

☆......☆......☆

''کچھ کھا لو بیٹی! صبح سے بھوکی ہو۔'' مولانا صاحب کی بیوی یعنی خاتونِ خانہ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر ہمدردانہ انداز میں کہا تھا۔

''مجھے بھوک نہیں ہے خالہ جان! میرا دل نہیں کر رہا۔'' وہ سسکتی ہوئی بولی تھی۔ اس کا دل ہر لحہ لرزتا اور کانپتا تھا۔ زندگی کیسے گزرے گی؟ عزت کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ اس فکر پہ ہر فکر شرما جاتی تھی۔ پیٹ کی آگ تک، جبھی تو پچھلے دو دنوں سے یہ احساس ہی مرا ہوا تھا۔

ہوسٹل سے نکل کر وہ ماری ماری کسی دوسرے ہوسٹل کی تلاش میں پھرتی رہی تھی۔ مگر حالات کا ہی نہیں قسمت کا چکر بھی شروع تھا۔ روز و شب گردش میں تھے۔ جبھی تو ایک پر دوسری افتاد آ پڑی تھی۔ وہ سارہ ہی تھی۔ کسی موٹے، لٹکی توند والے گنجے مگر اپنی سے دوگنی عمر کے شخص کے ہمراہ جس نے اسے نہ صرف دیکھا تھا بلکہ پہچان بھی لیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اُترتی مکارانہ خوشی میں عبیر کی موت پوشیدہ تھی۔ اسے نہیں پتا تھا۔ اس بدحواسی میں وہ کدھر کو بھاگی تھی اور کتنا بھاگی تھی۔ سر پر اترتی رات اور پیچ در پیچ پھیلی گلیاں، خوف اس کے سر پر منڈلاتا تھا۔ اور امان

کہیں نظر نہیں آتی تھی۔ وہ روتی تھی اور اللہ سے پناہ طلب کرتی تھی۔ معاً فضا میں کہیں قریب سے عشاء کی اذان کی پکار اٹھی تھی۔ وہ ٹھٹک کر تھم گئی۔ اسے لگا تھا۔ اللہ نے ایک بار پھر اسے اپنی موجودگی اپنے ساتھ کا یقین دلایا ہے۔

اُس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ انرجی سیور کی روشنی میں پتنگے اس کے سر پر ناچتے تھے۔ یہ انرجی سیور سنگ مرمر کی سیڑھیوں کے اوپر کھلے دروازے کی پیشانی پر نصب سبز بورڈ پر لگا ہوا تھا۔ سنہرے حروف میں مسجد کا نام درج تھا۔

''جامع مسجد رحمت اللہ!'' نیچے پورا ایڈریس لکھا تھا۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اس نے پلٹ کر گلی میں دور تک نگاہ دوڑائی۔ گھروں کے دروازے مضبوطی سے بند تھے اور گلی سنسان پڑی تھی۔ اکثر گھروں سے ٹی وی چلنے اور عورتوں اور بچوں کی آوازیں باہر تک سنائی دے رہی تھیں۔

اس نے سیڑھی پر پیر رکھا اور اندر جھانکا۔ مسجد روشن تھی۔ احاطہ سامنے تھا۔ دروازے کھلے ہوئے تھے پنکھے چلتے تھے۔ خدا کا گھر خدا کے بندوں کا منتظر تھا۔ اسے سوائے موذن کے کوئی نظر نہیں آیا جو قبلہ رُخ کھڑا اذان میں مصروف تھا۔ اس نے اندر قدم رکھ دیا۔ اس نے خود کو ہر خطرے سے بچا کر خدا کی پناہوں میں دے دیا۔ داہنی جانب سیڑھیاں اوپری منزل کو جا رہی تھیں۔ وہ بے آواز اوپر چڑھتی چلی گئی تھی۔ اوپر بھی قطار وار کمرے تھے۔ دروازے بند اور لائٹس نہ ہونے کی وجہ سے اندھیرا، اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ ایک دروازہ دھکیلا تو اندازہ ہوا باہر سے لگا ہوا ہے۔ اس نے ٹٹول کر چٹخنی اُتاری اور اندر داخل ہوگئی اور پیچھے دروازہ بند کر دیا۔ لرزتا کانپتا سراپا اک انوکھی طمانیت اور سکون کی کیفیت میں آ گیا تھا۔ رات اس نے دوبارہ پھر قدم باہر رکھا تھا جب مسجد نمازیوں سے خالی ہوئی اور تالے لگنے کی آواز اس نے اپنے کانوں سے سنی صرف صحن کا بلب روشن تھا۔ وہ چلتی ہوئی وضو خانے میں آ گئی۔ وضو کیا اور ایسے خشوع و خضوع سے نماز ادا کی جو اس نے قبل کبھی نصیب ہی نہ بن سکا تھا۔ دُعا کو ہاتھ پھیلاتے وہ ضبط کھو گئی تھی۔ ایک بار پھر سوائے عزت کی بقا اور سلامتی کے وہ کچھ نہیں مانگ سکی۔ ساری رات اسی گریہ و زاری میں گزری تھی جیسے اور صبح دم جانے کیسے آنکھ لگ گئی۔ ہڑبڑائی تو اس وقت جب ایک بزرگ ہستی اس کو آوازیں دے رہی تھی۔ وہ تڑپ کر اٹھی اور کانپتی ہوئی سمٹ کر بیٹھ گئی۔

''کون ہو بیٹی؟ یہاں کیسے؟'' بزرگ کی حیرانی تمام نہ ہوئی تھی۔ وہ زار و قطار رو پڑی۔

''جب کہیں پناہ نہ ملی تو اللہ سے مانگ لی۔ اُس نے تو انکار نہیں کیا۔''

''بیٹی آپ کی بات بجا ہے، مگر اس طرح...... آپ جوان جہان ہو۔ اس طرح کیسے؟'' میں موذن ہوں۔ یہاں جماعت بھی کرا دیتا ہوں مولانا صاحب یا ان کے صاحبزادے کی غیر موجودگی میں، مسجد کی دیکھ بھال کا کام بھی میرے ذمے ہے۔ اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں آج وقت سے بہت پہلے آ گیا۔ آپ پہ کسی اور کی نگاہ نہیں پڑی۔'' عبیر نے جواباً الف تا یے اپنی ساری داستانِ الم سنا ڈالی تھی۔

''آپ ہی بتایئے بابا جی! کہاں جاتی میں؟ ہر طرف عزت کی چادر کو چیرنے پھاڑنے والے بھیڑیے موجود ہیں۔ مجھے یہیں رہنے دیجیے خدارا۔''

''یہ تو ممکن نہیں ہے بیٹی! یہاں آپ کی موجودگی کو مخفی رکھنا ممکن نہیں۔ آپ میرے گھر چلو۔ یہ مسجد کا حجرہ ہی ہے۔ میری بیوی وہاں موجود ہے۔ آپ ہماری بیٹی کی طرح ہو۔ سمجھو یہ بھی اللہ نے ہی پناہ کا انتظام کیا ہے۔ اللہ آگے بھی بہتر ہی کرے

گا۔''

انہوں نے سر پر ہاتھ رکھ کے تشفی کرائی تھی اور یوں وہ یہاں آ گئی تھی۔ مگر ایسے کہ دل ہر دم ہولتا تھا۔ وہ مام اور سار یہ کی فطرت سے آگاہ تھی۔ اگر اس نے اسے اس ایریے میں دیکھا تھا تو وہ کونہ کونہ بھی چھان ماریں گی۔ یہی خوف اسے قاری صاحب کے سامنے وہ بات کہنے پر اُکسا گیا تھا جو عام حالات میں وہ لاج کے مارے کبھی زبان پر نہ لاتی۔

''بابا جی! کسی بھی شریف آدمی سے میرا عقد کرا دیجیے۔ عمر کی بھی کوئی قید نہیں۔ بس وہ اتنا اعلیٰ ظرف ضرور ہو کہ میری حقیقت جاننے کے باوجود مجھے پوری آمادگی سے اپنا لے۔ باقی میں ہر طرح کے حالات کو سہنے کا حوصلہ رکھتی ہوں۔''

اور جواب میں بابا جی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کے تسلی دی تھی۔ دو دن گزر گئے تھے۔ مگر ہزار دعاؤں کے باوجود ابھی تک اُمید نہیں بر آئی تھی۔ قاری صاحب کی گھر آمد پر وہ ہر بار ایسی امید سے انہیں تکتی گویا وہ کہیں گے کہ بیٹی تیار ہو۔ ہم تمہارا عقد کر رہے ہیں۔

☆......☆......☆

واش بیسن پر جھکی وہ مسلسل ابکائیاں لے رہی تھی۔ پچھلے پندرہ منٹ سے اور جیسے نچڑ کر رہ گئی تھی۔ عبدالغنی نے بڑھ کر اسے بے حد محبت سے شانوں سے تھام لیا۔

''اگر طبیعت نہیں سنبھل رہی تو ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔'' لاریب نے کلی کرتے ہوئے لحہ بھر کو اسے گردن موڑ کر دیکھا اور بے حد نقاہت کے باوجود ہلکا سا مسکرائی۔

''نہیں ٹھیک ہے۔ آج ڈاکٹر کہاں ملیں گے۔ خوار ہونے کا فائدہ، آپ بس سورۃ فاتحہ کا پانی دم کر کے پلا دیں مجھے۔ ٹھیک ہو جاؤں گی۔'' وہ اس کا سہارا لے کر بستر پر آ گئی۔ عبدالعلی جو ماں کو نڈھال اور بے حال دیکھ رہا تھا۔ سہا ہوا آ کر اس سے چپک کر رہ گیا۔

''ماما کو کیا ہوا ہے بابا جانی؟'' وہ منمنایا تھا۔ عبدالغنی نے اس کا گال سہلایا اور پانی دم کر کے لاریب کو دے دیا۔

''ابھی ٹھیک ہو جائیں گی بیٹے! آپ پریشان نہیں ہو۔ جاؤ دیکھو عبداللہ بھائی اور بو آ رہے ہیں؟''

''اور لیزے بو بھی آئیں گی ناں؟'' وہ اچھل کر کھڑا ہوتا ہوا مستفر ہوا تھا۔

''ہاں بیٹے! وہ بھی آئیں گی۔'' عبدالغنی مسکرایا۔ پھر اس کے جانے کے بعد لاریب کو دیکھنے لگا۔

''کچھ بہتر محسوس کر رہی ہو خود کو؟'' لاریب نے سر کو اثبات میں ہلا دیا تھا۔

''علیزے کو بلوا لیا ہوتا۔ اتنا کام کیسے سمٹے گا؟'' میں تو جیسے ہی باہر جاتی ہوں۔ گوشت کی باس سے جی الٹنے لگتا ہے۔'' اس کی آواز پست تھی۔ عبدالغنی نے اس کا ہاتھ تھپتھپایا تھا۔

''آئی ہو گی علیزے! باقی تم فکر نہ کرو۔ میں دیکھ رہا ہوں یہ کام، حصے کر لیے ہیں۔ تقسیم کا کام میں نے کچھ لڑکوں کے سپرد کیا ہے۔ عبدالہادی نے بھی کہا تھا مدد کر دے گا۔ یہ گھر کی صفائی وغیرہ جو ہے اس کے لیے میں نے شیخ صاحب کی ملازمہ سے کہہ دیا تھا۔ وہ کر لے گی۔''

''یہ تو بہت ہی اچھا کیا آپ نے۔ میری آدھی پریشانی ختم ہو گئی۔ سچ پوچھیں تو اب تک اُم جان کے سر پر عیش کیے میں نے۔ اتفاق دیکھیں اُم جان بھی حج پر چلی گئیں اور علیزے کی بھی شادی ہو گئی۔ صرف یہیں پر اکتفا نہیں ہوا یہ صاحب بھی ابھی وارد ہو گئے

ہیں۔'' اس کا اشارہ اپنی پریگیننسی کی جانب تھا۔ لہجہ حجاب آلود تھا۔ عبدالغنی اسے مسکراتی نظروں سے دیکھتا رہا۔

''الحمد اللہ سارے ہی اتفاق حسین اور برکت والے ہیں۔''

''ابھی سے سُن لیں۔ ام جان اور بابا جان کے واپس آنے پر میں مکمل آرام کروں گی پریگیننسی پیریڈ میں، اور آپ سے خوب ہی ناز اٹھوانے والی ہوں۔ اولاد کا مزید تحفہ کچھ تو مہنگا پڑے آپ کو، تاکہ اگلا پروگرام سوچ سمجھ کر طے کریں۔'' وہ شرارت سے کہہ رہی تھی۔ عبدالغنی نے گہرا سانس بھرا۔

''یہ پروگرام طے کرنے کی ہماری آپ کی کیا مجال ہے۔ یہ اللہ کی دین ہے بلاشبہ!'' اس کا انداز ناصحانہ تھا۔ لاریب ایک دم خفت زدہ ہوگئی۔

''اللہ مجھے معاف فرمائے۔ زبان پھسل جاتی ہے۔''

''آمین۔'' جہاں تک آپ کی ناز برداری کی بات ہے تو ہم جی جان سے حاضر ملیں گے آپ کو انشاء اللہ!'' عبدالغنی کا لہجہ شرارتی تھا۔ لاریب جھینپ کر ہنس دی تھی۔

☆......☆......☆

بہت خوبصورت شام دھرتی پر اُتری تھی۔ مرد حضرات عشاء کی نماز پڑھ کر گھر آچکے تھے۔ خواتین نے بھی نماز ادا کرلی تھی۔ بار بی کیو لاریب کی خواہش تھی۔ جس کی خوشبو دلفریب احساس لیے فضاؤں میں بکھر رہی تھی۔ مرد اور خواتین الگ گروپس کی شکل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جب ہارون کو جانے کیا سوجھی تھی کہ اچانک فرمائش کردی تھی۔

''ایسی گیدرنگ میں اگرچہ محفل موسیقی نہیں بھی رکھی جاسکتی تو کم از کم شاعری کا ذوق ضرور جانچنا چاہیے۔ کون کتنا باذوق اور بدذوق ہے۔ کیا خیال ہے؟'' جواباً لاریب ہنسنے لگی تھی۔ اور شوخ نظروں سے عبدالغنی کو دیکھا تھا۔

''یہ تو سمجھیں آپ نے میرے دل کی بات کردی ہے بھائی! میں ضرور جاننا چاہوں گی عبدالغنی کوئی نظم پڑھتے کیسے لگتے ہیں۔ وہ بھی میرے لیے۔'' اور عبدالغنی واقعی خفت سے سرخ پڑ گیا تھا۔

''یہ تو واقعی بہت اہم بات ہے۔ معاملہ ذوق کا ہے اور آپ کو ثابت بھی کرنا ہوگا۔ ہو جایئے شروع۔'' ہارون نے عبدالغنی کا کاندھا تھپکا۔ وہ خاصا جز بز ہوا تھا۔

''اس وقت تو کچھ بھی ذہن میں نہیں آرہا۔'' اس نے سٹپٹا کر کہا تھا۔

''اگر محبت کرتے ہوں گے تو پھر لازماً کچھ یاد آجائے گا۔'' اب کی بار علیزے نے گویا چیلنج کیا۔

''یہ بات تمہیں عبدالغنی سے نہیں عبدالہادی بھائی سے کہنی چاہیے تھی غالباً۔'' لاریب نے اس کی بات پکڑ لی۔ سب ہنس پڑے۔ علیزے کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ بنا پلکیں اٹھائے بھی اس نے عبدالہادی کی پرتپش نگاہوں کو اپنا حصار باندھتے پایا تھا۔

''پھر کیا خیال ہے عبدالغنی صاحب کو ذہن کو کھنگالنے کا موقع دیتے ہم محترم عبدالہادی کو پکڑتے ہیں۔ کیا خیال ہے عبدالہادی؟'' ہارون آج بہت موڈ میں تھا۔ بریرہ اسے حیران ہوکر دیکھتی رہی۔

''نیک خیال ہے۔'' جواباً عبدالہادی نے بھی آمادگی میں دیر نہیں کی۔ اس کی اس برجستگی پر خاصے فقرے کسے گئے تھے۔ وہ بجائے شرمندہ ہونے کے مسکراتا رہا۔

کہا اس نے کہ دنیا درد ہے اور تم دوا جیسے
لگا تم سے محبت ہے مجھے اس نے کہا جیسے
طلب کی اس نے جب مجھ سے محبت کی وضاحت تو
بتایا دشت کے ہونٹوں پہ بارش کی دعا جیسے

وہ سب ایسے زاویے سے بیٹھے تھے کہ خواتین پر نظر نہیں جاتی تھی۔ یعنی پردے کا خیال ملحوظ خاطر تھا۔ مگر عبدالہادی نے نظم شروع کرنے سے قبل پلیٹ میں کباب اور چلی ساس لیا تھا اور دوبارہ بیٹھتے ہی ایسی پوزیشن سنبھالی کہ علیزے اس کی نظروں کے فوکس میں آ گئی تھی۔ اس کی اس حرکت کو علیزے کے علاوہ بھی سب نے محسوس کیا تھا۔ لاریب نے شرارتی انداز میں اس کے پہلو میں بھی کہنی ماری تھی اور اس کے کان میں گنگنائی۔

چِٹا کوکڑ بینرے تے
کاشنی دوپٹے والیے منڈا عاشق تیرے تے

اور وہ محض صبر کے گھونٹ ہی بھر کے دانت کچکچانے کے سوا کچھ نہیں کر سکی۔ جبکہ وہ اپنے ہی جذب سے کہہ رہا تھا۔

سُنو کیوں دل کی بستی کی طرف سے شور اٹھتا ہے
بتایا حادثہ احساس کے گھر میں ہوا جیسے
کہو اے گل کبھی خوشبو کا تم نے عکس دیکھا ہے
کہا قوسِ قزح کے سارے رنگوں کی صدا جیسے

وہ رُکا۔ تھما اور اس کی توجہ حاصل کرنے کو باقاعدہ کنھکارا کہ علیزے دانستہ نگاہ جھکائے بیٹھی تھی جب سے، اس حرکت پر جیسے اور غصہ آیا۔ اور ضد باندھ لی پلکیں نہیں اٹھائے گی۔ وہ بھی جیسے اسی کا استاد تھا۔ اپنی جگہ چھوڑ کر اس کے قریب آیا اور اپنی سجی سجائی پلیٹ اس کے سامنے پیش کر دی۔ علیزے نے جھلا کر سر اٹھایا اور اس کی جیسے ضد اور خواہش پوری ہوئی۔

سنو خواہش کی لہروں پر سنبھلنا کیوں ہوا مشکل
بتایا پانیوں پر خواب کی رکھی بنا جیسے

اس کا لہجہ، اس کی نظریں معنی خیز تھیں۔ علیزے جو اسے گھورنا چاہتی تھی جیسے گڑبڑا کر پلکیں جھکا گئی۔

بھلا تم روح کی ان کی کرچیوں میں ڈھونڈتے کیا ہو
کہا یہ اتنی روشن ہیں کہ سورج ہے دیا جیسے

اس کے پلیٹ جھپٹ لینے پر وہ گویا سر تسلیم خم کر کے باقاعدہ مسکرایا پھر اس کی آنکھوں میں جھانک کر باقاعدہ خوبصورت انداز میں مسکرایا تھا۔

سنو آنکھوں ہی آنکھوں کا بیاں کیسا لگا تم کو
لگا پھولوں سے سرگوشی کرتی ہے صبا جیسے

وہ اپنی جگہ پر آیا اور سر کو جھکا کر مستقل مسکرائے گیا تھا۔ ہارون نے باقاعدہ اسے داد دی تھی۔ عبدالغنی مسکرانے پر اکتفا کر چکا تھا۔

''عبدالغنی کچھ یاد آیا؟'' لاریب کے سوال پر ہارون کی ہنسی چھوٹ گئی تھی۔

''یہ باگڑبلی آج آپ کی جان نہیں چھوڑنے والی۔'' عبدالغنی سر ہلاتے ہوئے مسکرایا تھا۔ پھر گلا کھنکارا۔

''مجھے اس کو پڑھنے کا تجربہ نہیں ہے لہجے میں زیر و بم نہ ہوا تو مذاق نہیں اڑائے گا کوئی۔'' اس حفظِ ماتقدم انداز پر سب ہی ہنس پڑے۔ لاریب نے دونوں ہاتھ اٹھا دیے۔

''کوئی نہیں اُڑا سکتا آپ کا مذاق۔ آپ شروع تو کریں سرتاج!'' اس کی شوخی عروج پر تھی۔ عبدالغنی نے پھر گلا کھنکارا۔ سب سے زیادہ لاریب کا اشتیاق قابلِ دید تھا۔

خواب سارے، خیال سارے
حقیقتوں کا لبادہ اوڑھے
تمہاری ہنسی سنوار جائیں
یہ چاند سورج یہ سارے تارے
چراغ جتنے بھی جل رہے ہیں
تمہارے چہرے کے رنگ دیکھیں تو ہار جائیں

لاریب کا چہرہ جگمگانے لگا تھا۔ اس نے گردن اکڑا کر یہ تعریف موصول کی تھی گویا۔

(باقی انشاء اللہ ماہِ نومبر میں ملاحظہ فرمائیے)

دکان کے شیشے کے پار اسے اپنی پسند کے جوتے دکھائی دیے۔ ''میں پیسے پتا کر کے آتا ہوں۔'' جوزی جانے لگا تو انجلی نے اسے بازو سے پکڑ کر روکا۔ ''بہت مہنگے ہوں گے تُو رہنے دے ناں۔'' وہ منمنائی۔ ''او...... پاگل پیسے پوچھنے کے پیسے تو نہیں لگتے ناں۔'' وہ بازو......

خواہشوں کی آنکھ مچولی، افسانے کی صورت

ایک ہی کمرے میں لال، پیلی، ہری جھنڈیاں بساط بھر خوشی کا اظہار کر رہی تھیں۔ کمرے میں لگا واحد پیلا بلب اپنی مدقوق سی روشنی کے باعث ہر شے پر پیلاہٹ بکھیرے ہوئے تھا۔ جوزی نے اندر آتے ہی دروازے کی کنڈی لگائی اور سیج نما بستر پر بیٹھی انجلی کے گلے میں ہار ڈال کر اسے بانہوں میں سمیٹ لیا۔

آج جوزی اور انجلی کی شادی ہوئی تھی۔ انجلی اس کی پھوپی کی بیٹی تھی۔ جوزی پیشے کے لحاظ سے خاکروب تھا۔ اسے اپنے علاقے کی گلیاں اور سڑکیں صاف کرنی ہوتی تھیں۔ اوور ٹائم الگ لگاتا۔ اسے صرف دو دن کی چھٹی ملی تھی۔ مگر وہ پورا ایک ہفتہ اپنی شادی منانا چاہتا تھا۔

پندرہ سیڑھیاں چڑھ کر یہ واحد کمرہ تھا۔ باہر ایک کونے میں بیت الخلاء اور دوسرے کونے پر چھپڑ ڈال کر کونے میں چولہا رکھا تھا۔ اس کا بھی ایک ہزار کرایہ تھا، جو اسے ہر حال میں ادا کرنا ہوتا تھا۔

انجلی سانولی، دبلی پتلی، عام شکل و صورت کی لڑکی تھی۔ مگر جوزی اسے دل و جان سے چاہتا تھا، محبت، روپ کی محتاج نہ تھی۔

اِس وقت وہ دلہن بنی، ستا سا گلابی رنگ کا سوٹ پہنے، رنگ برنگی چوڑیاں اور تیز لال لپ اسٹک لگائے، اسے ساری دنیا سے زیادہ خوبصورت لگی۔

رات اپنے فسوں خیز لمحات ان پر نچھاور کر رہی تھی۔ یہاں تک کہ اُجالا نمودار ہو گیا۔

☆......☆......☆

جوزی نے انگڑائی لے کر انجلی کو بازوؤں میں لے لیا، اور اس پر بوسوں کی برسات کر دی۔ انجلی چھوئی موئی ہوئی اس میں سماتی گئی اور جوزی بے خود ہوتا گیا۔

کہیں صبح کے بارہ بجے وہ دونوں بیدار ہوئے۔ جوزی کو بھوک نے ستایا۔ نئی دلہن بھی بھوک سے بے تاب نظر آئی۔

''چل اب اٹھ جا۔'' جوزی نے اس کا چہرہ تھام کر آنکھ ماری تو انجلی نے نگاہیں جھکا لیں۔ جوزی اس کی ادا پر مر مٹا۔ وہ اٹھا اور کمرے سے نکلتے ہوئے انجلی سے مخاطب ہوا۔

''حلوہ پوری کھائے گی ناں؟'' انجلی نے اثبات میں سر ہلایا اور جھک کر چار پائی تلے سے جوتا نکال کر پہننے لگی۔ جوزی کی نگاہیں اس کی چپلوں پر جم کر رہ گئیں۔ ڈیڑھ، دو سو روپے والی عام سی چپل، دلہن

تھی وہ ...... مگر حالات جانتا تھا۔ انجلی جلدی سے پاؤں چارپائی کے نیچے چھپانے لگی۔ شرمندہ شرمندہ سی، جوزی چلتا ہوا اس کے پاس آیا اور اس کے کندھے پر نرمی ومحبت سے ہاتھ رکھ کر بولا۔

''اے! کیا ہوا، میں دلاؤں گا ناں تجھے خوبصورت جوتا۔ وہ اسے کیا کہتے ہیں کورٹ شوز، کالے چمکدار، ایڑی والے تُو فکر نہ کر۔'' انجلی اس کی بات پر اٹھی اور اس سے لپٹ گئی۔ تب جوزی مسکراتا ہوا باہر چلا گیا۔

☆......☆......☆

شادی کو کئی دن گزر گئے۔ مگر انجلی کی آنکھوں کے سامنے کالے سُنہری پٹی والے کورٹ شوز لہراتے رہتے۔

ایک دفعہ جوزی اسے بازار لے گیا۔ دکان کے شیشے کے پار اسے اپنی پسند کے جوتے دکھائی دیے۔

''میں پیسے پتا کر کے آتا ہوں۔'' جوزی جانے لگا تو انجلی نے اسے بازو سے پکڑ کر روکا۔

''بہت مہنگے ہوں گے تُو رہنے دے ناں۔'' وہ منمنائی۔

''او...... پاگل پیسے پوچھنے کے پیسے تو نہیں لگتے ناں۔'' وہ بازو چھڑا کر دکان کے اندر چلا گیا۔

چند منٹوں بعد آیا تو اداس چہرہ اور پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ سامنے تھا۔ انجلی سمجھ گئی کہ بہت قیمتی ہوگا۔ اور ان کی استطاعت سے باہر۔

''چل...... چلیں گھر۔'' وہ کوئی بات کیے بنا گھر آ گیا۔

جوزی نے دل میں ٹھان لی تھی کہ وہ انجلی کو یہ جوتے کبھی نہ کبھی ضرور دلائے گا۔

☆......☆......☆

آج وہ کام پر جانے لگا تو انجلی اُداس ہوگئی۔

''آ...... جاؤں گا جلدی...... تُو آرام کر۔ روٹی لیتا آؤں گا۔''

جوزی نے اسے ساتھ لگا کر محبت سے کہا، تو انجلی اداس آنکھوں سے اسے دیکھتی چپ ہوگئی۔ جوزی بھی افسردہ دکھائی دے رہا تھا۔

☆......☆......☆

''یہ لے جوزی۔'' حسبِ معمول ہاشمی صاحب کی بیگم نے اسے شاپر تھمایا۔ رات ان کے بیٹے کی منگنی تھی۔ پلاؤ، زردہ، اور سالن انہوں نے جوزی کو دیا

اکثر وبیشتر اسے کھانا، کپڑے دیا کرتی تھیں۔

''بھلا ہو آپکا جی۔'' وہ ممنونیت سے بولا۔

جوزی اس علاقے میں تین سال سے کام کر رہا تھا۔ اس کی دیانت اور شرافت کے سب گواہ تھے۔ سال پہلے کوڑے کے ڈھیر میں سے اسے ایک چمکتی ہوئی چیز دکھائی دی۔

''سونے کی انگوٹھی۔'' وہ اٹھا کر دیکھنے لگا۔ شکر تھا کہ قریب کوئی نہ تھا۔

اگلے دن ہاہاکار مچی کہ بیگم ہاشمی کی انگوٹھی گم تھی۔

جوزی ان کے دروازے پر آیا اور بیگم صاحبہ کو احترام کے ساتھ ان کی امانت لوٹا دی۔ تب سے بیگم ہاشمی اس کی شرافت کی قائل ہوگئیں۔ اور اسے واپسی پر آنے کا کہہ دیتیں۔ کبھی کبھار اسے روٹی، سالن کبھی فروٹ کوئی پرانا جوڑا دے دیتیں، جوزی خوشی سے قبول کر لیتا، آج بھی وہ اسے شاپر دینے لگیں، تو قدرے پریشانی سے بولیں۔

''رحیماں کام چھوڑ گئی ہے۔ بہت تنگ ہو رہی ہوں۔ کوئی کام والی نظر میں ہو تو میرے پاس بھیجنا۔'' وہ بہت پریشان دکھائی دے رہی تھیں تب لمحہ بھر میں جوزی نے فیصلہ کر لیا۔

''وہ جی میری گھر والی سارا کام جانتی ہے۔

آپ کہو تو اسے لے آؤں کام پر لگالو۔'' جوزی نگاہیں جھکا کر بولا۔

''ارے کیوں نہیں...... تم اسے کل ہی لے آؤ۔ اس سے اچھی کیا بات ہے۔ بس صفائی کرواؤں گی۔ اتنا بڑا گھر ہے۔ باقی کاموں کے لیے تو ملازمین ہیں۔'' وہ خوش ہو کر بولیں تو جوزی سر ہلاتا واپس آ گیا۔

انجلی نے سُنا تو وہ بھی خوش ہوئی۔ ''بوریت سے جان چھوٹے گی چار پیسے بھی آ جائیں گے۔'' پلاؤ، زردہ، قورمہ اُڑاتے ہوئے انجلی خود کو ہواؤں میں اُڑتا محسوس کرنے لگی۔

☆......☆......☆

''انجلی جیسی پھرتیلی اور ایماندار کام کرنے والی قسمت والوں کو ملتی ہے۔'' پندرہ دن بعد اس نے بیگم ہاشمی کو کسی سے فون پر کہتے سنا۔ وہ مطمئن ہو گئی۔ نا صرف بیگم ہاشمی بلکہ ان کے برابر والی مسز خواجہ نے بھی اسے روزانہ دو گھنٹے کام پر رکھ لیا۔ یوں دو گھروں کا کام ختم کر کے وہ آ جاتی۔

جوزی نے دو چابیاں بنوالی تھیں ایک خود رکھی اور ایک انجلی کو دے دی کہ دیر سویر کا انتظار کیے بنا وہ گھر آ جایا کرے۔ دونوں اب اپنی زندگی میں خوش تھے۔

☆......☆......☆

بیگم ہاشمی کے بیٹے کی شادی شروع ہو گئی۔ انجلی کا کام بڑھ گیا۔ انجلی کو دو راتوں کے لیے وہیں رکنا تھا۔ جوزی کو کوئی اعتراض نہ تھا۔ مہمان بھی بہت سارے آ رہے تھے۔ پورے گھر کی صفائیاں ہو رہی تھیں۔ انجلی دل لگا کر کام کر رہی تھی۔

بار بار صفائی کرتی پھر ڈھیر اکٹھا ہو جاتا۔ مہمان بھی کافی سارے تھے۔ اچانک مہمانوں سے بھرا گھر صاف کرتے کرتے وہ جب کمرے کے قالین پر

گلاب

گلاب کے پھول کو اللہ تعالیٰ نے بے انتہا خوبیوں سے نوازا پر یہ وہ واحد پھول ہے جس کا استعمال تقریباً ہر گھر میں ہوتا ہے' چاہے وہ گھر خوشی کا یا غمی کا۔ گلاب کا پھول دونوں موقعوں پر استعمال ہوتا ہے جب زندگی کے کسی بھی مرحلے میں انسان کامیابی حاصل کرتا ہے تو بھی مرحلے میں انسان کامیابی حاصل کرتا ہے تو وہ گلاب کے پھول کا ہار اپنے گلے میں پہنتا ہے اور جب اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو گلاب کے پھولوں کی چادر پہنتا ہے۔

مرسلہ: مدیحہ شاہ۔ لاہور

برش لگا رہی تھی تو اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ بیڈ کے نیچے جوتے، جانے مہمانوں میں سے کس کے کورٹ شوز تھے۔ وہی کالے، سُنہری پٹی والے، اگلے ہی پل جوتے انجلی کے پیروں میں تھے۔ چم چم کرتے نوئے نکور جوتے......

ذرا سی آہٹ پر اس نے فوراً اتار کر وہیں رکھ دیے مگر دل تھا کہ ہمک ہمک کر جوتوں کی طرف پلٹا جاتا تھا۔

اگلے دن میلاد تھا۔ تین بجے تھے۔ مہمان آ گئے۔ ہال کمرے میں قالین پر سفید چاندنیاں بچھی تھیں۔ اگربتی اور پرفیوم کی ملی جلی خوشبو نے ماحول معطر کر رکھا تھا۔ جوتوں کا اِک ڈھیر تھا۔ تبھی مہمانوں میں سے ایک نفیس لڑکی آئی اور اس نے جوتوں کے ڈھیر میں اپنے چمکیلے، کالے کورٹ شوز رکھ دیے اور خود جا کر سپارہ پڑھنے لگی۔ کچھ خواتین گٹھلیاں پڑھ رہی تھیں۔

جانے کس لمحے انجلی کے دل میں شیطان نے

کروٹ لی۔ اس نے خاموشی سے، ہوشیاری سے ایک جوتا اٹھایا، بغل میں دابا اور اپنی چادر کے اندر چھپا کر واپس اپنے کاموں میں آ کر لگ گئی۔ دل دھک دھک کر رہا تھا۔ مگر وہ مطمئن سی تھی۔

گھنٹے بعد کورٹ شوز کی ڈھنڈیا مچی۔ اور کچھ دیر بعد خاموشی...... جوتا ہی تو تھا۔ بھلا یہ بڑے لوگ معمولی چیزوں کے کھو جانے پر شور و سوگ تھوڑی مناتے ہیں؟ اپنے اس کارنامے پر انجلی جی جان سے خوش تھی۔

بغل میں جوتا دابے وہ گویا خزانہ سمیٹے ہوئے تھی۔ تالا کھول کے اندر آ گئی، ابھی تک جوزی نہ آیا تھا۔ صندوق میں سب سے نیچے کپڑوں کیا اندر چھپا کر وہ جوتا اِک خواہش کے پورا ہونے پر سرشار تھی۔

کھانا گرم کر رہی تھی کہ جوزی آ گیا۔ دونوں نے کھانا کھایا جوزی لمبی تان کر سو گیا۔ انجلی کا دل بے قرار تھا کہ دیدار کرتی رہے جوتے کا۔ مگر جوزی کی موجودگی میں یہ ناممکن تھا۔

اگلا دن بیگم ہاشمی کے بیٹے کی بارات کا دن تھا۔ خوب ملے گلے کے بعد بارات دوسرے شہر روانہ ہو گئی۔ کل ان کی واپسی ہونا تھی۔ انجلی کو تھکن تھی وہ جلدی کام سمیٹ کر گھر آ گئی۔

☆......☆......☆

''او میری پھلاں والی کُرتی۔ ہوئی وکھیاں توں تنگ وے۔'' جوزی جھاڑو دے کر اب کوڑا اکٹھا کر رہا تھا۔ ساتھ گانوں کا شغل بھی جاری تھا۔ کوڑا ایک جگہ جمع کر کے وہ بڑے سارے ڈسٹ بن میں ڈالنے لگا تو ہاتھ رُک گئے۔ کوڑے کے اندر آدھا دھنسا جوتا کورٹ شوز اس نے جلدی سے کوڑا ہٹایا اور جوتا نکال لیا۔ بالکل وہی جوتا...... اِدھر اُدھر کوڑا کیا کہ دوسرا جوتا دکھائی دے۔ مگر وہاں تو ایک ہی تھا۔ بالکل ویسا ہی بائیں پاؤں کا جوتا، دوسرا ہوتا تو ملتا؟

جوزی نے جوتا، جھاڑو کے اوپر رکھ دیا اور تنکے پھیلا دیے کہ کوئی دیکھ نہ پائے۔ کام سمیٹ کر وہ جوتا چھپائے گھر آ گیا۔ یہ بالکل وہی جوتا تھا جو اس نے شوکیس میں دیکھا تھا اور انجلی کی حسرت بھری نگاہیں، وہ اب تک نہ بھولا تھا۔

مگر یہ ایک جوتا میرے اور انجلی کے کس کام کا؟ کیوں اٹھایا؟ جوزی کا دل چاہا اسے واپس کوڑے میں پھینک دے، پھر ہنس دیا اور گھر آ گیا جوتا جھاڑو کے نیچے چھپا دیا۔

انجلی اس کے آنے پر غنودگی میں اٹھ بیٹھی دونوں نے کھانا کھایا۔

''کیا بات ہے بڑے خوش نظر آ رہے ہو۔'' انجلی نے اس کے چہرے پر عجیب خوشی دیکھی۔ تب جوزی دانت نکال کر پھر مسکرایا۔

''تیری آدھی خواہش پوری کر پایا ہوں۔'' وہ ہولے سے بولا۔

''کیا مطلب؟'' انجلی ناسمجھی سے بولی۔ جوزی اُٹھا اور اکلوتا جوتا انجلی کے سامنے لہرایا۔

انجلی کو یہی اُمید تھی۔ اس کا پلان کامیاب ہوا تھا۔ مگر جوزی کا کیا ردِعمل ہوگا دونوں جوتے دیکھ کر وہ اب خوفزدہ تھی۔

''یہ ایک جوتا کہاں سے ملا یہ تو بالکل وہی ہے۔ جو تم نے دلانے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر میں اس ایک جوتے کا کیا کروں۔'' انجلی کے سانولے چہرے پر اُداسی سی تھی۔ مگر اندر ہی اندر خوشی۔

''ہاں...... میں تو خود حیران ہوں۔ یا تو کسی نے غلطی سے کوڑے میں پھینک دیا پتا نہیں۔'' جوزی اُلجھ کر بولا۔

''تو اسے رکھ دے۔ کیا پتا کل کو دوسرا بھی مل جائے۔'' انجلی مسکرا کر بولی۔

''تیرے تو ہو گئے ناں مفت میں مزے۔'' اب

اُداس کیوں ہے۔آ...... میرے پاس آ...... جا۔'' یہ کہہ کر جوزی نے انجلی کا ہاتھ پکڑ کر خود سے لپٹایا۔

☆......☆......☆

انجلی اپنی ترکیب پر بہت خوش تھی۔ آج جوزی کے آنے سے پہلے اس نے دونوں جوتے برابر رکھ کر ان پر کپڑا ڈال دیا۔ اس روز جوزی کو دیر ہوگئی۔ انجلی کو لمحہ لمحہ صدیوں برابر لگ رہا تھا۔ وہ آیا اور کھانا کھا کر آج ملنے والی تنخواہ گن رہا تھا۔ مگر ہنوز اُداس تھا۔ پتا نہیں کب اتنی رقم جمع کر پائے گا کہ انجلی کو جوتے دلا سکے۔ اس بار بھی نہیں۔

''کیا ہوا؟'' وہ اسے خود کلامی کرتے دیکھ کر بولی۔

''اس بار بھی تجھے جوتے نہ دلا سکوں گا۔'' وہ ٹھنڈی آہ بھر کر بولا۔

''رہنے دے جوتے اور حساب کتاب، ہمیں نہیں لینے نئے جوتے۔'' وہ اٹھلا کر بولی اور جوزی کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

کیا مطلب!'' وہ حیران سا ہوا۔

''یہ دیکھ۔'' انجلی کے کپڑا ہٹایا۔ دونوں جوتے چمک رہے تھے۔

''کہاں سے آیا یہ دوسرا جوتا؟'' جوزی پیسے جیب میں ڈال کر ہکا بکا اُٹھ کر جوتے اُٹھا کر جانچنے لگا۔ اور سوالیہ نظریں انجلی پر جمائیں۔

''میں آج صفائی کر کے کوڑا ڈبے میں ڈالنے آئی تو اس میں پڑا تھا۔ یہ ایک جوتا۔ میں اُٹھا لائی۔ چوری نہیں کی۔'' انجلی معصومیت سے بولی۔

اور جوتے اس کے ہاتھ سے لے کر پہن کر کمرے میں ٹک ٹک کرنے لگی۔ اس کے چہرے پر خوشی بکھری تھی جبکہ جوزی کا چہرہ فکر مند۔

☆......☆......☆

صبح دونوں کام پر چلے گئے۔

آدھے گھنٹے بعد جوزی گھر آیا۔ جوتے ایک شاپر میں ڈال کر بیگم ہاشمی کے پاس چلا آیا۔ شادی کا گھر تھا۔ انہی میں سے کسی کے ہوں گے۔

''یہ جی آپ کی امانت۔'' جوزی نے جوتے ان کے قدموں میں رکھ دیے۔

''ارے...... یہ تمہیں کہاں سے ملے۔'' وہ حیرانی سے بولیں۔

''مجھے یہ کوڑے میں سے ملے ہیں صاف ستھرے کر دیے ہیں میں نے۔'' وہ قدرے ہکلا کر بولا۔ ''دیکھ لیں جی مجھے اندازہ تھا۔ شادی والے گھر میں سے کسی کے ہوں گے۔''

تب انہیں یکدم یاد آیا کہ ان کی حیدر آباد والی بھانجی ربیعہ کے جوتے گم ہوئے تھے۔

''ہاں...... مگر وہ تو اب چلی گئی جس کے تھے۔ اب میں ان کا کیا کروں۔'' وہ دل ہی دل میں ایک بار پھر جوزی کی ایمانداری کی قائل ہوگئیں۔

''آں...... ایسا کرو۔ انجلی کو دے دینا میری طرف سے۔ اسے پورے آجائیں گے۔'' وہ اسے اشارہ کرتے ہوئے بولیں اور جوزی نے سکھ کا سانس لیا۔

''مہربانی آپ کی جی۔'' وہ مزید کوئی بات کئے جوتے لے کر سیدھا گھر آیا اور وہیں رکھ دیے۔ اب اسے اطمینان سا ہو رہا تھا کہ اپنی ایمانداری کو ثابت کر دیا تھا۔ انجلی نے جو کیا وہ بھی مجبور تھی۔ اسے اب دل پر کوئی بوجھ محسوس نہ ہو رہا تھا۔ اس نے خود کلامی کی۔

''انجلی اب تم بنا ہچکچاہٹ انہیں استعمال کرنا۔'' اس کے دل میں سکون کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

وہ تالا لگا کر دوبارہ کام دھندے کی طرف متوجہ ہوگیا۔

☆☆......☆☆

ملک سے باہر جانے سے ایک گھنٹہ پہلے اذہان شاہ آخر رابیل سے ملنے کے لیے تیار ہوگیا تھا یہ اور بات تھی کہ عیشہ گیلانی نے کس طرح اسے راضی کیا تھا رابیل سے ملنے کے لیے۔ اور اب رابیل اذہان شاہ کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی کافی دیر خاموش......

محبت کی ایک خوب صورت کتھا، افسانے کی صورت

نجانے کیوں اُسے لگتا تھا وہ بھی محبت کر ہی نہیں سکتی، کسی سے بھی نہیں۔ پتا نہیں اسے یہ وہم کیونکر ہوگیا تھا؟ یا شاید یہ وہم اس کے دل میں کہیں یقین کی چادر اوڑھے بیٹھا تھا۔ ہاں بس اتنا تھا کہ جب کبھی اس کو کوئی ہم مزاج شخص ملتا تو اُسے لگتا اُسے محبت ہے اس شخص کے ساتھ اور کبھی کبھی تو اسے یقین ہونے لگتا کہ اب واقعی محبت ہے اور بے پناہ ہے مگر پھر کھلتا نہیں یہ محبت تو نہیں تھی۔ یہ تو بس اک وقتی جذبہ تھا جس کو اُس نے محبت کا لبادہ پہنا دیا تھا۔

اس کے ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ کوئی بھی چیز اس کے دل میں زیادہ دیر کے لیے ٹھہرتی نہیں تھی۔ وہ یکسانیت سے اُکتا جاتی تھی۔ بے زار ہوجاتی ہے۔ وہی بندہ، وہی چیز جو کبھی اس کی ہارٹ فیورٹ کی کیٹگری میں آتا تھا، وہی اس کے دل سے یوں اتر جایا کرتی کہ اُسے نفرت سی ہوجاتی تھی۔ اور اس کی دوست عیشہ کہتی تھی۔

''ڈیئر! محبت تمہارے بس کا روگ نہیں ہے۔ محبت یکسانیت ہے۔ اس میں انسان صرف کسی ایک کا ہو کر رہتا ہے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ اور تم...... تمہاری تو طبیعت ہی ایک جگہ ٹھہرنے والی نہیں ہے۔ تم کبھی ایک ہی بندے کے ساتھ تمام زندگی بتا ہی نہیں سکتی ہو۔ تم تو میرے ساتھ زیادہ دیر بیٹھ جاؤ تو تمہیں کوفت ہونے لگتی ہے۔''

اور بس تب سے اِسے یقین ہونے لگا تھا کہ وہ محبت کر ہی نہیں سکتی۔ اور اب تو یہ یقین اس کے دل میں جڑ سی پکڑ گیا تھا۔ کبھی اس کی دوست عیشہ گیلانی اس سے پوچھتی کہ تم شادی کس سے کرو گی؟

''جس سے میں محبت کرتی ہوں۔'' اس کا جواب ہوتا۔

''مگر محبت، تو تم کو ہر دوسرے دن کسی نہ کسی بندے سے ہوجاتی ہے۔'' وہ شرارت سے کہتی۔

''نہیں عیشہ وہ محبت نہیں ہوتی، مگر مجھے نجانے کیوں لگتا ہے اب کی بار یہ محبت ہے پر سچ تو یہ ہے کہ محبت میرے نصیب میں نہیں ہے۔ یہ تو بہت خوش

نصیب لوگوں کا مقدر ہوتی ہے ناں؟'' وہ کچھ دیر کو خلاؤں میں تکنے لگی۔ پھر بولی۔

''اور میں اتنی خوش قسمت بھلا کیسے ہو سکتی ہوں کہ مجھے محبت مل جائے۔ میری دل کی بنجر دھرتی پر محبت کا بادل کبھی نہیں برسے گا۔ مجھے لگتا ہے، میں پیاسی ہی رہوں گی۔ محبت کبھی مجھے سیراب نہیں کرے گی۔'' وہ سنجیدگی سے کہتے ہوئے بولی۔ اور نجانے کیا تھا اس کے لہجے میں، اس کی آنکھوں میں جس نے عیشہ گیلانی کو چونکا دیا تھا۔ اُسے لگا تھا اس لمحے اس کی آنکھوں میں اک عجیب سی اُداسی در آئی ہو۔

رابیل بخاری کا لہجہ، اس کی آنکھیں لمحہ بھر کو بھیگ سی گئی ہوں۔

''کیا ہوا ہے تمہیں رابیل!'' عیشہ نے کچھ چونک کر اس سے دریافت کیا تھا۔

کچھ نہیں عیشہ ڈیئر۔ کچھ نہیں بس یونہی آج دل بھر سا آیا تھا۔'' رابیل نے آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا اور عیشہ نے اسے کُریدنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

☆......☆......☆

آج پھر عیشہ گیلانی نے دیکھا رابیل کچھ زیادہ ہی پریشان لگ رہی تھی۔ پچھلے پندرہ منٹ سے وہ اضطرابی انداز میں مسلسل اِدھر اُدھر ٹہل رہی تھی۔ آخر عیشہ نے پوچھ ہی لیا کہ کیا بات ہے؟''

مگر رابیل نے جواباً کچھ نہیں کہا تو وہ کچھ چونک سی گئی کہ عموماً وہ ایسا نہیں کرتی تھی۔ وہ اپنی ہر

پریشانی، ہر خوشی عیشہ گیلانی سے شیئر کرتی تھی۔ کچھ دنوں سے وہ مسلسل پریشان سی نظر آتی تھی مگر بتاتی نہیں تھی کہ کیا بات ہے۔ اور آج رابیل زیادہ ہی ڈپریس لگ رہی تھی۔ عیشہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر اس کے پاس گئی اور پھر پوچھا کہ آخر تم بتا کیوں نہیں دیتیں کہ کیا بات ہے؟ ایسا کون سا دکھ ہے جو تمہیں اندر ہی اندر کھائے جارہا ہے؟''

''کوئی خاص بات نہیں ہے عیشہ! بس ایسے ہی۔'' رابیل نے جواب دیا تھا مگر عیشہ گیلانی مطمئن نہیں ہوئی تھی۔ تبھی بولی تھی۔

''نہیں رابیل تم مجھ سے ضرور کچھ چھپا رہی ہو۔ پلیز بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟ تم آج سے پہلے کبھی اتنی ڈپریس نہیں لگی ہو مجھے۔ تمہاری آنکھوں میں اب یہ اُداسی سی کیوں رہنے لگی ہے۔ پلیز ٹیل می ڈیئر واٹ اِز یُور پرابلم؟'' عیشہ نے اس کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھ کر اصرار کرتے ہوئے کہا اور تب رابیل کو جانے کیا ہوا تھا وہ یکدم ہی اس کے گلے لگ کر روتی چلی گئی تھی۔ پھر جب تھمی تو بولی۔

''پتا نہیں عیشہ کیوں مجھے لگتا ہے محبت میری قسمت میں نہیں ہے اور مجھے اس کی ضرورت محسوس ہونے لگی ہے عیشہ۔ میرا دل چاہتا ہے محبت مجھے ملے۔ مجھے سیراب کرے اتنا ٹوٹ کر برسے کہ میری روح تک جل تھل ہوجائے۔ مگر اب تو مجھے لگنے لگا ہے محبت مجھے کبھی سیراب نہیں کرے گی۔ میں پیاسی ہی مرجاؤں گی۔ پتا ہے عیشہ میرے اندر محبت کی عجیب سی ہوس پیدا ہوگئی ہے اور وہ اذہان شاہ! اُسے نجانے کیوں میری محبت کا یقین ہی نہیں آتا۔ وہ سمجھتا ہے میں اس کے ساتھ فلرٹ کررہی ہوں۔ عیشہ میں نے اس بار بھی ہمیشہ کی طرح اس کو وقتی جذبہ قرار دیا تھا۔ مگر گزرتے وقت نے مجھے احساس دلایا کہ نہیں اب کی بار ایسا نہیں ہے۔ اب کی بار واقعی مجھے محبت ہوگئی ہے۔ میں اس کی پسند میں خود کو سرتاپا بدلنے پر تیار ہوں۔ بدل سکتی ہوں۔ اس کی خاطر میں اپنا سب کچھ تیاگ سکتی ہوں مگر اُسے میرے جذبوں کا، میری محبت کا یقین ہی نہیں آتا۔''

رابیل نے اس کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ لاوا جو اتنے دنوں سے اس کے دل میں پک رہا تھا، آج اُبل کر باہر آچکا تھا۔ اور عیشہ نے اس کا دکھ سنا تو خود بھی بہت دکھی ہوگئی تھی۔ پھر اس کو تسلی دیتے ہوئے بولی تھی۔

''رابیل ڈیئر! تم فکر مت کرو۔ میں خود اذہان شاہ سے بات کرتی ہوں۔ میں اسے تمہاری محبت کا یقین دلاؤں گی۔ مگر رابیل تم سے ایک بات کہوں، پلیز مائنڈ مت کرنا۔ کیا واقعی تمہیں اذہان شاہ سے محبت ہوگئی ہے؟ کہیں یہ بھی وقتی جذبہ تو نہیں ہے؟ تم کچھ وقت انتظار کرو۔ خود کو وقت دو پھر کوئی فیصلہ کرنا۔'' عیشہ نے اس سے سوال کیا تھا اور ساتھ سمجھایا بھی تھا۔

''عیشہ میں نے تمہیں بتایا ہے ناں کہ میں نے پہلے واقعی اس کو محض اک وقتی جذبہ اور وقتی کیفیت سمجھا تھا۔ جب پہلی بار میں اذہان شاہ سے ملی اور اس کے خیالات سُنے، اس کی باتیں سنیں۔ تو اس کی شخصیت نے مجھے اپنے حصار میں جکڑ سا لیا تھا۔ وہ خوبصورت تو تھا مگر مجھے اس کی خوب سیرتی نے متاثر کیا تھا۔ میں نے سوچا اب کی بار بھی شاید مجھے صرف وقتی طور پر کسی کی شخصیت نے متاثر کیا ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے ہر بار مجھے کوئی نیا ہم مزاج بندہ متاثر کرتا ہے۔ کیونکہ اس کے اور میرے خیالات بہت ملتے جلتے تھے۔ مگر محض خیالات کے ملنے سے کسی سے محبت تھوڑی ہوجاتی ہے۔ میں نے سمجھا تھا اب کی بار بھی میں کچھ روز بعد اذہان شاہ سے بالکل لاتعلق ہوجاؤں گی۔

مگر جب بہت سارے دن گزر گئے اور میں اذہان شاہ کے خیالات سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکی پھر مجھ پر ادارک ہوا کہ میں اس سے محبت کرنے لگی ہوں۔ عیشہ گیلانی میں یعنی رابیل بخاری جو بقول تمہارے محبت کر ہی نہیں سکتی۔

مجھے بھی محبت ہوگئی۔ اور وہ بھی اذہان شاہ سے جو مجھے دیکھنا تک پسند نہیں کرتا۔ میرا دل چاہتا ہے اذہان ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے رہے۔ مجھے ہر شخص میں اذہان کے الوژن ہونے لگے ہیں۔ میں ہر صورت میں اذہان کی صورت تلاش کرتی ہوں۔ تم ہی بتاؤ عیشہ کیا پہلے کبھی میرے ساتھ ایسا ہوا تھا؟ اور اذہان شاہ کی محبت نے مجھے بہت بے بس کر دیا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ میری زندگی کو اگر کوئی شخص سنوار سکتا ہے تو وہ اذہان شاہ ہے۔'' رابیل بخاری بڑے جذب کے عالم میں کہہ رہی تھی۔

''رابیل میں تمہارے ساتھ ہوں۔ مجھے تمہاری محبت پر یقین ہے۔ تمہارے جذبوں پر اعتبار ہے مگر کیا تم نے اذہان سے اپنی محبت کا اظہار کیا ہے؟ کیا وہ تمہارے جذبوں کی شدت سے واقف ہے؟'' عیشہ گیلانی نے پھر پوچھا تھا۔

''ہاں عیشہ میں نے اپنی محبت کا اظہار اُس سے کیا تھا۔ اسے یقین دلایا تھا کہ مجھے اس سے شدید محبت ہے۔ مگر نجانے کیوں اُسے میری باتوں کا، میری محبت کا یقین نہیں آتا۔ وہ کہتا ہے کہ میری طرح کی لڑکیوں کو کبھی محبت ہو ہی نہیں سکتی جو ہر وقتی جذبے پر محبت کے نام کا ٹیگ لگا دیتی ہیں۔ عیشہ مجھے بہت دکھ ہوا تھا۔ اس کی یہ بات سُن کر۔ میں نے اُس کو اپنی محبت کا یقین دلانے کی بہت کوشش کی مگر سب بے سود......! مجھے واقعی لگنے لگا ہے کہ محبت میری قسمت میں نہیں ہے۔ میرے لیے نہیں ہے۔'' آخر میں رابیل ایک بار پھر رونے لگی تھی اور عیشہ گیلانی نے اُسے چپ کراتے ہوئے پورے یقین کے ساتھ یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ اپنی اس پیاری سی دوست کے لیے اذہان شاہ سے ضرور بات کرے گی۔

☆......☆......☆

اگلے دن عیشہ گیلانی اذہان شاہ کے آفس میں اس کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی اور پچھلے آدھے گھنٹے سے وہ اُسے اُس پاگل سی لڑکی رابیل بخاری کے بارے میں بتا رہی تھی جو اب واقعی محبت کر بیٹھی تھی اور اذہان شاہ کی محبت میں پاگل تھی۔

''دیکھیں اذہان بھائی رابیل واقعی آپ سے بہت محبت کرتی ہے۔ وہ آپ کو ٹوٹ کر چاہنے لگی ہے۔ آپ آخر کیوں اُس کی محبت پر یقین نہیں کرتے؟ کیوں اُس کے جذبوں کا مذاق اُڑا رہے ہیں؟''

عیشہ گیلانی واقعی اس وقت اپنی دوست کی خاطر جذباتی ہو رہی تھی۔ تب اذہان شاہ نے خاموشی سے اس کی ساری بات سُن کر کہا تھا۔

''عیشہ! رابیل پر اس وقت صرف وقتی جذبہ طاری ہے، جسے وہ محبت کا نام دے رہی ہے۔ ورنہ کیا آپ کو پتا نہیں ہے کہ وہ پہلے بھی کتنی محبتیں کر چکی ہے؟'' اذہان نے آخر میں کچھ طنزیہ انداز میں کہا تھا۔

''نہیں اذہان بھائی۔ رابیل واقعی پہلے ہر وقتی کیفیت کو محبت کا نام دیتی رہی ہے۔ مگر اب کی بار ایسا نہیں ہے۔ پہلے اس کی محبت فقط چند روز پر مشتمل ہوتی تھی اور پھر وہی محبت اس کے دل سے اُتر چکی ہوتی تھی۔ مگر اب کی بار چند روز نہیں بلکہ پورے تین ماہ ہو چکے ہیں اور اس کے جذبوں میں کمی نہیں ہو رہی بلکہ شدت آتی جا رہی ہے۔ اس کی محبت بڑھتی ہی جا رہی ہے۔

آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ وہ آپ سے کتنی محبت کرتی ہے۔ پاگل ہے وہ آپ کے لیے، آپ کے الوژن ہونے لگے ہیں ہر جگہ اُسے۔ پتا نہیں وہ محبت کے کس موڑ پر کھڑی ہے۔ جہاں آپ کے علاوہ اسے کچھ نظر ہی نہیں آتا۔'' عیشہ گیلانی نے رابیل کا دفاع کرتے ہوئے کہا تھا اور ساتھ ہی اُسے کنوینس کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر ازہان شاہ شاید کچھ بھی سُننے کے موڈ میں نہیں تھا۔ ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولا تھا۔

''پلیز عیشہ آپ مجھے اس معاملے میں مجبور نہیں کر سکتیں۔ یہ دل کے معاملے ہوا کرتے ہیں۔ جب میرا دل ہی رابیل بخاری سے محبت کرنے پر آمادہ نہیں تو میں کیسے کر سکتا ہوں؟ اور ویسے بھی یہ محبت کا بھوت اس کے سر سے بہت جلد اُتر جائے گا کیونکہ میں ملک سے باہر جارہا ہوں۔ یہاں رہ کر میں بار بار ڈسٹرب ہو جاتا ہوں اس کے آنے سے۔''

''ازہان بھائی صرف ایک بات بتا دیں کہ کیا کوئی اور ہے آپ کی زندگی میں جس کے لیے آپ رابیل کی محبت کو ٹھکرا رہے ہیں؟'' عیشہ نے سوالیہ انداز میں پوچھا تھا۔

''نہیں عیشہ ایسا کچھ نہیں ہے مگر اس کے باوجود میں اپنے دل کو رابیل کی محبت سے خالی پاتا ہوں اور میں خود کو اس سے محبت کرنے پر مجبور تو نہیں کر سکتا ناں!'' ازہان نے اطمینان سے جواب دیا تھا۔ عیشہ گیلانی مزید کچھ پوچھے بغیر اُداس سی وہاں سے آ گئی تھی۔

☆......☆......☆

عیشہ نے آ کر رابیل بخاری کو سب بتایا تھا تو کتنے ہی لمحے وہ ساکت سی رہ گئی تھی۔ پھر عجیب سی کیفیت میں گھر کر بولی تھی۔

''عیشہ میں ازہان شاہ سے آخری بار ملنا چاہتی ہوں۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ کیا میری محبت میں اتنی شدت بھی نہیں ہے کہ وہ ازہان شاہ کے دل کو موم کر سکے۔ اس کے دل میں میرے لیے ذرا سی جگہ نہ بنا سکے؟ میں اس سے پوچھنا چاہتی ہوں عیشہ کہ میری محبت میں آخر کیا کمی ہے؟ جو میرے جذبوں کی شدت اس کے دل کو پگھلا نہیں سکی۔''

اور عیشہ گیلانی نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا کیونکہ وہ خود بھی بہت دُکھی ہو رہی تھی اس وقت۔ اور اس سے رابیل کا یہ دکھ دیکھا نہیں جا رہا تھا۔

☆......☆......☆

ملک سے باہر جانے سے ایک گھنٹہ پہلے ازہان شاہ آخر رابیل سے ملنے کے لیے تیار ہو گیا تھا یہ اور بات ہے کہ عیشہ گیلانی نے کس طرح اسے راضی کیا تھا رابیل سے ملنے کے لیے۔ اور اب رابیل ازہان شاہ کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی کافی دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولی۔

''ازہان! مجھے نہیں معلوم آپ ملک سے باہر کیوں جا رہے ہیں۔ اگر آپ میری وجہ سے ایسا کر رہے ہیں تو میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ میں آئندہ کبھی آپ کو ڈسٹرب نہیں کروں گی۔ آپ سے ملنے نہیں آیا کروں گی۔ مگر آپ کو ایک بات بتاؤں محبت دوری سے اور زیادہ بڑھتی ہے۔ اس میں اور شدت آتی ہے۔ اور بقول شاعر

دُور جاؤ گے تو اور بھی یاد آؤ گے
فاصلے قرب کی بنیاد ہوا کرتے ہیں

ازہان شاہ! محبت کو اس سے کوئی سروکار نہیں ہوتا کہ محبوب اس کو کیا دیتا ہے کیا نہیں۔ یہ تو صرف دین ہوتی ہے۔ دیتی ہے اور دیتے ہی چلی جاتی ہے۔ بے غرض ہو کر، بے لوث ہو کر اپنا سب کچھ لٹا دیتی ہے۔

آپ اگر یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کے اس طرح چلے جانے سے میرے دل میں آپ کی محبت ختم ہو جائے گی۔ تو یہ بھول ہے آپ کی۔ آپ جہاں بھی جائیں گے میری محبت کی شدتیں ہر قدم پر آپ کے ساتھ

ہوں گی۔ آپ کی محبت دُعا بن کر میرے ہونٹوں پر ہمیشہ رہے گی۔''

آخر میں اپنی بات کے اختتام پر رابیل بخاری کے آنسو انتہائی ضبط کے باوجود اس کی پلکوں کے بند توڑ کر گالوں پر آ گئے تھے۔

اُس نے بھیگی آنکھیں اُٹھا کر اذہان شاہ کی طرف دیکھا تھا۔ وہ بھی پوری طرح سے رابیل بخاری کی طرف متوجہ تھا۔ دونوں کی نظریں لمحہ بھر کو ملیں تھیں۔ رابیل نے جلدی سے نگاہیں چُرا لیں اور آنسو پونچھنے لگی مگر اذہان شاہ کو لگا تھا کہ اس نے یکے بعد دیگرے کئی ہارٹ بیٹ مس کی ہوں۔

تبھی رابیل پھر سے بھیگے لہجے میں بولی تھی کہ کیا میری محبت میں اتنی شدت بھی نہیں ہے کہ اس کی آنچ سے آپ کا دل پگھلتا؟ آپ کے دل میں کیا تھوڑی سی جگہ بھی میرے لیے نہیں ہے؟'' اور اذہان شاہ جواب تک چپ تھا کسی گہری سوچ سے چونک کر بولا۔

''رابیل میں باہر جا رہا ہوں۔ پتا نہیں کب واپس آؤں۔ میرا انتظار مت کرنا۔ میرے دل میں آپ کے لیے کوئی جذبہ بیدار نہیں ہوا اور شاید کبھی ہو بھی نہیں۔'' بہت اطمینان سے اس نے یہ سب کہا۔

اور پھر واقعی وہ چلا گیا تھا۔ اُمید کا کوئی بھی جگنو اس کے ہاتھوں میں تھمائے بغیر۔

اور رابیل بخاری کی زندگی ویران سی ہو گئی تھی۔ اذہان کے چلے جانے سے اُسے لگتا تھا ساری دنیا بے رنگ ہو گئی ہو۔ اک عجیب بے کلی، اک اُداسی ہمہ وقت اس پر طاری رہتی تھی۔ آنکھیں تھیں کہ دہلیز سے ہٹتی ہی نہیں تھیں۔ ہر آہٹ پر اس کا گمان گزرتا تھا۔ ہر آواز اسے اذہان شاہ کی آواز لگتی۔

☆......☆......☆

وقت کو جانے کیا ہو گیا ہے
جب سے تم گئے ہو ٹھہر سا گیا ہے

رابیل بخاری کی زندگی واقعی ایک جگہ رُک گئی تھی وقت جیسے ٹھہر سا گیا تھا۔ ہر لمحہ مسکرانے والے ہونٹ مسکرانا بھول گئے تھے۔ رت جگوں نے اس کی آنکھوں میں ڈیرے ڈال لیے تھے۔ وہ سراپا انتظار ہر وقت منتظر سی رہتی اور عیشہ گیلانی اس کو دیکھتی تو خود بھی گہرے تاسف میں گھر جاتی تھی۔ وہ اکثر اُسے کہتی کہ رابیل یہ کیا حال بنالیا ہے تم نے اپنا؟ کچھ خیال کرو۔ اپنا نہیں تو انکل آنٹی کا، اپنے اردگرد موجود رشتوں کا جن کی ساری خوشیاں تم سے مشروط ہیں۔ تمہیں پتا ہے کہ انکل آنٹی کتنا پریشان ہیں تمہارے لیے؟ تم صرف ایک شخص کی خاطر ان سب رشتوں کو کیوں اگنور کر رہی ہو؟ کیا صرف ایک شخص کی محبت ان سب محبتوں پر بھاری ہو گئی ہے؟ کیا فقط ایک بندے کے لیے تم ساری دنیا چھوڑ دو گی؟ شخص بھی وہ، جسے تمہاری محبت کی قدر ہی نہیں ہے۔ پلیز خود کو سنبھالو اور اذہان شاہ کو بھول جاؤ۔'' عیشہ گیلانی نے اسے سمجھایا تھا۔

''ٹھیک کہتی ہو عیشہ تم، آئندہ میں ایسا نہیں کروں گی۔ مجھے اب ان رشتوں کے لیے جینا ہے، ورنہ زندگی میں میرے جینے کا کوئی مقصد تو نہیں رہا۔ مگر عیشہ اس شخص کی محبت کو دل سے نکالنا میرے بس میں نہیں ہے۔ تم دیکھنا عیشہ وہ ایک دن لوٹ آئے گا۔ اسے میری محبت واپس لائے گی۔ میں نے ہر لمحہ دعاؤں میں اپنے رب سے اس کے سوا کچھ نہیں مانگا۔ وہ ایک شخص میری زندگی میں آ گیا تو میری زندگی میں کہیں کوئی کمی نہیں رہے گی۔ میری زیست مکمل ہو جائے گی۔ مجھے یقین ہے میری دعائیں ضرور قبول ہوں گی ضرور۔'' رابیل نے جواباً کہا تھا۔

تبھی عیشہ نے 'انشاء اللہ' کہا اور دل ہی دل میں اپنی پیاری سی دوست کی خوشیوں کے لیے ڈھیر ساری دعائیں مانگ ڈالی تھیں۔

☆......☆......☆

میری یاد کا موسم
جو ہر اک دکھ سے گہرا ہے
نہ جانے کتنی مدت سے
ہمارے من میں ٹھہرا ہے
مگر تم نے نہیں سوچا
مگر تم نے نہیں سمجھا
تمہارے بعد کا موسم
اک کالی رات جیسا ہے
جو جیتی اور نہ ہاری ہو
اِک ایسی مات جیسا ہے
مگر تم نے نہیں دیکھا
مگر تم نے نہیں جانا

رابیل بخاری نے خود پر اپنے لبوں پر مسکراہٹ کا اِک خول سا چڑھالیا تھا۔ اپنے اردِ گرد موجود رشتوں کی خاطر وہ بظاہر سب کو بہت خوش نظر آتی تھی مگر کوئی اس کی آنکھوں میں جھانک لیتا تو جانتا کہ بظاہر ہنسنے والی یہ لڑکی اندر سے کتنی دکھی ہے۔

اب وہ ہنستی تو تھی مگر آنکھیں اُس کا ساتھ نہیں دیتی تھیں۔ اک کھوکھلی سی ہنسی سے وہ سب کو خوش ہونے کا یقین تو دلا سکتی تھی مگر ایک عیشہ گیلانی تھی۔ جو اس کے اندر کے دکھ سے واقف تھی۔ اس کی اُداسی کا سبب جانتی تھی۔

اذہان شاہ کی یادیں ہمہ وقت اس کے ساتھ ہوتیں۔ وہ اب بھی ہواؤں کے ہاتھ اذہان شاہ کے نام محبت بھرے سندسے بھیجا کرتی تھی۔ اِس بات سے بے پروا کہ ہوا نجانے اس کا سندیسہ اذہان تک پہنچاتی ہے یا نہیں۔

میری بے لوث محبت کے گواہ چاند بتا
میں نے ہر روز اُسے یاد کیا ہے یا نہیں
وہ جو معروف ہے، مشہور ہے لوگوں کے لیے
دل کو اُس کے لیے آباد کیا ہے یا نہیں

☆......☆......☆

رابیل بخاری نے واقعی سرتاپا خود کو بدل لیا تھا۔ وہ جو ہمیشہ جینز میں ملبوس رہتی تھی اب شلوار قمیض پہننے لگی تھی۔ اسکارف کی جگہ اب بڑا سا دوپٹا اوڑھنے لگی تھی۔ نماز کی کبھی وہ پابند نہیں تھی۔ اب پابندی سے پانچ وقت کی نماز ادا کرنے لگی تھی۔

عیشہ گیلانی اُسے دیکھ کر حیران ہوتی تھی کہ کیا کوئی کسی کے لیے خود کو اتنا بدل سکتا ہے؟

وہ اکثر رابیل سے کہا کرتی کہ اگر آج اذہان شاہ تمہیں دیکھ لے تو حیرت زدہ ہو کر رہ جائے۔ خود سے اپنی محبت پر نازاں ہو جائے کہ آج کے دور میں اتنی پُرخلوص اور بے لوث محبتیں فقط خواب ہو کر رہ گئی ہیں۔ میں سمجھتی تھی رابیل! کہ محبت آج کے دور میں صرف کتابوں، کہانیوں میں مقید ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کا حقیقی زندگی سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ مگر تمہیں دیکھ کر لگتا ہے نہیں ایسا نہیں ہے۔ محبت اب بھی حقیقت میں اپنا وجود رکھتی ہے۔ محبت اب بھی تم جیسے لوگوں میں زندہ ہے۔ تمہیں دیکھ کر محبت پر یقین اور پختہ ہو جاتا ہے۔ محبت کا اگر کوئی نام ہے تو وہ رابیل بخاری ہے۔'' عیشہ کے لہجے میں فخر بول رہا تھا۔

''رابیل کیا واقعی محبت اتنی طاقت اتنی شدت ہوتی ہے کہ وہ انسان کو اس حد تک بدل دے؟'' عیشہ نے پوچھا تھا۔ رابیل بخاری اس کی بات سُن کر دھیمے سے لہجے میں بولی تھی۔

''عیشہ! محبت میں انسان 'میں' نہیں رہتا 'تم' ہو جاتا ہے۔ محبت تو نام ہی خود کو مٹا دینے کا ہے۔ محبت کے رنگ میں رنگ جانے کا ہے۔ انسان کا اپنا آپ کہیں نہیں رہتا بس سب کچھ محبت کا ہو جاتا ہے۔ اس اِک شخص کے نام ہو جاتا ہے جس سے آپ محبت کرتے ہیں۔ انسان کی باگیں پھر محبت کے ہاتھوں میں ہوتی ہیں۔ محبت جدھر چاہے باگ موڑ دے۔ جب چاہے انسان کی زندگی کا رُخ بدل دے۔ محبت

انسان کو مکمل بدل کے رکھ دیتی ہے عیشہ۔'' رابیل نے اسے طویل جواب دیا تھا۔

''ایک بات تو بتاؤ رابیل، اتنا عرصہ گزر گیا۔ کیا اب بھی تم اذہان کو بھول نہیں پائی ہو؟'' عیشہ نے ایک بار پھر استفسار کیا تھا۔ تب رابیل بخاری کی آنکھوں میں یک لخت ڈھیر سارے آنسو جمع ہو گئے تھے۔

''عیشہ ڈیئر! بھولا تو انہیں جاتا ہے جو یاد نہ ہوں اور جو ہر وقت ہماری یادوں میں ہوں۔ جو ہمارے ذہنوں پر، ہماری سوچوں پر مستقل قابض ہوں۔ ان کو بھلا کیا یاد کرنا اور کیسا بھولنا۔ وہ تو زندگی بن کر ہماری روحوں میں بسے ہوتے ہیں۔ پھر وہ ذہن سے کیسے محو ہو سکتے ہیں؟ ان کو کیسے بھولا جا سکتا ہے عیشہ کیسے؟'' آخر میں رابیل کی آواز بھرا سی گئی تھی اور آنسو بے اختیار بہہ نکلے تھے۔ اور عیشہ نے اُسے اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔

☆......☆......☆

اور محبت کے آسمانی لمحے نے تو شاید اسے بہت پہلے کبھی چھو بھی لیا تھا۔ اپنے اندر رابیل بخاری کا ہونا تو شاید وہ اسی لمحے جان گیا تھا جب رابیل ایئرپورٹ پر اذہان کو ملنے آئی تھی آخری بار۔ تب ایک پل لگا تھا اذہان شاہ کو رابیل بخاری کی آنکھوں میں ڈوبنے میں۔

اس نے جب اپنی بھیگی آنکھیں اُٹھا کر اذہان کی طرف دیکھا تھا تو وہ اک لمحہ اذہان کی ساری زندگی پر بھاری ہو گیا تھا۔ اذہان شاہ پورے کا پورا ڈوب گیا تھا ان جھیل سی گہری آنکھوں میں۔ اور وہ مکمل طور پر ہار گیا تھا اپنا آپ اس لڑکی سے۔ جس کے لیے وہ اپنے دل کو ہر طرح کے جذبے سے خالی پاتا تھا۔ پھر دل اچانک اس کی محبت سے کیسے بھر گیا تھا ایک لمحے میں۔ وہ مسلسل اس حقیقت کو بھلانے کی کوشش میں تھا کہ اس کو رابیل سے محبت نہیں ہے۔ کبھی ہو بھی نہیں سکتی۔ مگر محبت نے اس کو پوری طرح سے زیر کر لیا تھا۔ اپنا آپ فقط اک لمحے میں منوا لیا تھا۔ تبھی وہ ہار مانتے ہوئے ایک فیصلے پر پہنچ کر مطمئن ہو گیا تھا۔

اور آج پورے تین سال بعد وہ رابیل بخاری کے سامنے تھا اور رابیل نے اس کو اپنے سامنے دیکھا تو حیرت سے گنگ رہ گئی تھی۔ کتنے ہی پل تو اُسے یقین ہی نہیں آیا تھا اذہان شاہ اس کے سامنے کھڑا ہے۔ رابیل بخاری اسے اپنا وہم سمجھی تھی کہ اُسے تو یوں بھی ہر وقت اذہان شاہ کے ہی وہم ہوتے رہتے تھے، تب ہی سر جھٹک کر وہاں سے گزر جانا چاہا تھا مگر دو ہاتھوں نے مضبوطی سے اس کو تھام لیا تھا۔ تب وہ چونکی اور نظریں اُٹھا کر دیکھا تھا۔ اور آنکھوں نے گویا اس کے چہرے سے ہٹنے سے انکار کر دیا تھا۔ رابیل بخاری کی آنکھوں میں بے یقینی سی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ کیا یہ واقعی حقیقت ہے؟ وہ جس کے خواب دیکھا کرتی تھی آج تعبیر بن کر اس کے روبرو کھڑا تھا۔

اُسے اعتبار نہیں آ رہا تھا کہ محبت میں وہ بھی پانے والوں میں ہو سکتی ہے۔ اذہان شاہ نے اس کی آنکھوں میں حیرت و بے یقینی دیکھی تو تھوڑا سا مسکراتے ہوئے بولا تھا۔

''یقین کیوں نہیں آ رہا تمہیں رابیل بخاری؟ یقین کر لو یہ میں ہی ہوں اذہان شاہ، تمہاری محبت میں ہارا ہوا اذہان شاہ۔ جسے کبھی محبت پر یقین نہیں تھا مگر محبت نے اپنا آپ مجھ سے منوایا۔ میں تین سال تک یہی سمجھتا رہا کہ یہ وقتی جذبہ ہے مگر پھر مجھ پر کھلا محبت تو مجھے شروع سے ہی تم سے تھی۔ ہاں بس اس کے احساس سے میں آشنا نہیں تھا اور پھر جب محبت کے احساس سے آشنا ہوا تو اس وقت میں تم سے بہت دور جا رہا تھا۔ میں نے سوچا میں پردیس جا کر تمہیں بھول جاؤں گا۔ مگر یہ میری خام خیالی تھی۔ وہاں جا کر تو تم مجھے اور شدت سے یاد آتی تھیں۔

یقین کرو رابیل! تمہاری بھیگی آنکھیں ایک پل کو بھی مجھے بھولی نہیں تھیں۔ میں تمہاری آنکھوں میں ڈوب گیا تھا۔ پورا ڈوب گیا تھا۔''

اذہان شاہ نے قدرے تفصیل سے اسے بتایا تھا اور پھر گزرے تین سالوں کی ساری داستان اُسے کہہ سنائی تھی اور رابیل بخاری جو اس تمام عرصے میں خاموش، ساکت سی کھڑی تھی یکدم اس کے کاندھے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

''دیکھو! اب تو میں آ گیا رابیل ڈیئر پھر یہ آنسو کیوں بہا رہی ہو؟ تمہیں میرے آنے کی خوشی نہیں ہوئی؟'' اذہان شاہ نے اسے چپ کرواتے ہوئے مصنوعی دکھ چہرے پر سجا کر پوچھا تھا۔

اچانک چونک کر اس کے کندھے سے سر اٹھاتے ہوئے رابیل جلدی سے اپنے آنسو صاف کرنے لگی تھی پھر بھیگے لہجے میں بولی۔

''اذہان شاہ! زندگی میں کبھی میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ محبت مجھے ایسے زیر کرے گی کہ میں بے بس ہو جاؤں گی۔ میں وقتی جذبوں کو محبت کا نام دینے والی لڑکی! میں نے سمجھا تھا اذہان کے لیے میری دل میں جو جذبات ابھر رہے ہیں سب وقتی ہیں۔ ہمیشہ کی طرح محض کچھ دنوں کے لیے ہیں۔ چند روز بعد میرے دل میں تمہارے لیے کوئی جذبہ باقی نہ رہے گا۔ مگر مجھے نہیں پتا تھا کہ محبت تو مجھے اپنا اسیر کر چکی ہے میں جو خدا سے دُعا کرتی تھی کہ میری طبیعت میں ٹھہراؤ آ جائے۔ مجھے محبت مل جائے۔ میں تو محبت کے لمس سے نا آشنا تھی۔ مجھے محبت سے آشنائی تم نے، تمہاری محبت نے کروائی اذہان۔''

اور اذہان شاہ نے تب بہت غور سے اس کا بھرپور جائزہ لیا تھا وہ پنک اینڈ وائٹ کاٹن کے سادہ سے سوٹ میں ملبوس سر پر بڑا سا دوپٹا اوڑھے بہت معصوم، بہت پاکیزہ لگ رہی تھی۔ خوبصورت چہرے پر دو اُداس آنکھیں بہت بھلی لگ رہی تھیں۔ واقعی اس نے خود کو بہت بدل لیا تھا۔

آج کی رابیل بخاری میں اور کل کی رابیل میں بہت فرق تھا اور یہ فرق بہت اچھا لگ رہا تھا اذہان شاہ کو۔ رابیل بخاری مکمل طور پر اس کے آئیڈیل کے روپ میں کھڑی تھی۔

اذہان کو بہت دکھ ہوا تھا کہ تین سال کا عرصہ کیسے ضائع ہو گیا؟ اتنی پیاری سی لڑکی کو اس نے کتنے دکھ دیے اور وہ کتنی عظیم تھی کہ پھر بھی اک حرفِ شکایت بھی لبوں پر نہیں لائی تھی۔ بس اپنی محبت کا یقین مانگا تھا اور یہ یقین اب اذہان شاہ نے رابیل کو دینا تھا سو مدھم لہجے میں بولا تھا۔

''رابیل میں بہت خوش نصیب ہوں کہ تم مجھے اتنا چاہتی ہو۔ پلیز مجھے معاف کر دو۔ میں اپنے پچھلے رویے پر شرمندہ ہوں۔'' وہ نادم سا ہوا تھا۔

محبت بھلا کب محبت کو نادم و شرمندہ دیکھ سکتی ہے۔

''نہیں اذہان معافی کس بات کی؟ میں تو خود تمہاری احسان مند ہوں کہ تمہاری محبت نے مجھے خدا کے قریب کیا۔ مجھے اس کا قرب بخشا، میں تمہاری بہت شکر گزار ہوں اذہان۔'' رابیل نے اس کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا اور اذہان شاہ سرشاری کی کیفیت میں گھر کر گویا ہوا تھا۔

''رابیل آج کے بعد کبھی کوئی جدائی ہمارے درمیان نہیں آئے گی، ہم محبت کو محبت ہی سے سینچیں گے۔ اب کبھی ہجر کی دھوپ ہمارے جیون میں نہیں آئے گی۔''

اذہان شاہ نے اس کے ہاتھوں کو مضبوطی سے تھامتے ہوئے کہا تھا اور رابیل نے آسودگی سے مسکراتے ہوئے آنکھیں موند کر سر اس کے کاندھے سے ٹکا دیا تھا۔

وہ دونوں خوش نصیب تھے کہ ان کی گمشدہ محبت ان کو مل گئی تھی۔ انہوں نے محبت کو پا لیا تھا۔

☆☆......☆☆

''ہیں......ایسا کون سا دوست ہے۔جس کے پاس رہ بھی لیتا ہے؟'' آنٹی عشرت کو کافی حیرت ہوئی۔ ''کیا اس دوست کے بال بچے نہیں ہیں؟'' ''نہیں۔ اس کے بیوی بچے نہیں ہیں۔ بیوی کا کافی سال پہلے وصال ہو گیا تھا۔بس کافی محبت کرتے تھے اپنی......

زندگی کی کٹھنائیوں کو عیاں کرتے،ایک خوبصورت ناولٹ کا پہلا حصہ

''امی......امی جی......'' مینا ایک کمرے سے دوسرے میں جاتے ہوئے ماں کو آوازیں دے رہی تھی۔

برآمدے میں تین کمرے ایک ترتیب سے بنے ہوئے تھے، جن میں استعمال میں زیادہ تر درمیان والا کمرہ رہتا تھا، جسے 'وہ ہال کمرہ' بھی کہتے تھے۔ لیکن سلطانہ کو اس ہال کمرے میں نہ پا کر مینا نے کچن کا رخ کیا۔ تیسرا کمرہ سیف کے زیر استعمال تھا اور اس وقت سلطانہ کا وہاں ہونا ناممکن تھا اس لیے مینا کچن کی طرف چلی گئی۔

کچن برآمدے کے دائیں کونے میں تھا، جو کہ کافی کشادہ تھا،لیکن ہوادار نہیں تھا، اسی لیے گرمیوں میں کچن میں کام کرنا محال ہو جاتا تھا اور اس شدید گرمی میں جس طرح سلطانہ روٹیاں پکا رہی تھی، اس کا اندازہ تو صرف اسے ہی تھا۔

مینا کو ماں کچن میں نظر آ گئی تھی۔

سلطانہ پسینے میں شرابور، پورے انہماک سے روٹیاں پکانے میں مصروف تھی۔ اس نے لان کا سوٹ پہنا ہوا تھا جو کافی حد تک ملگجا سا تھا۔

''امی رطابہ میرے بسکٹس کھا گئی!!'' مینا نے روہانسی ہو کر کہا۔

''بہت گندی ہے رطابہ۔ تم نے تالے والی دراز میں کیوں نہیں رکھا تھا۔'' سلطانہ نے روٹی کو توے پر ڈالتے ہوئے کہا۔

''میں نے تو تالے والی دراز میں ہی رکھا تھا، لیکن جب میں ساتھ والی آنٹی کو بلانے گئی تو اس نے میرے بیگ سے چابی نکالی اور بسکٹ اٹھا کر کھا گئی۔'' مینا کے ماتھے پر تیوری تھی اور باقی چہرے کے تاثرات بھی غضب ناک تھے۔

''اچھا میں رطابہ سے پوچھتی ہوں۔ یہ لڑکی بہت بدتمیز ہو گئی ہے۔''

سلطانہ نے سرسری سا کہا تھا۔ اس کا پورا دھیان توے پر موجود روٹی پر تھا کہ وہ کہیں جل نہ جائے۔

''آپ کچھ نہیں کہیں گی اسے، ایک تھپڑ بھی نہیں

ماریں گی آپ اس کو۔ کیوں کہ وہ آپ کو بہت زیادہ اچھی لگتی ہے۔ کبھی آپ نے اسے مارا ہے؟ مجھے تو آپ ہر وقت مارتی رہتی ہیں۔'' اس وقت مینا کو ماں کی بے دھیانی کافی کھلی تھی۔ اس لیے جو اس کے دل میں تھا، اسے لفظوں کی شکل بھی دے دی تھی۔

''تمہیں کب مارا ہے میں نے۔'' سلطانہ نے

ایک دم نگاہیں اوپر کو اٹھائیں۔

''پرسوں۔'' سلطانہ کی بات ابھی پوری ہی نہ ہوئی تھی کہ مینا نے جھٹ سے جواب بھی دے دیا۔

''تو کیا تم نے شیشے کا جگ نہیں توڑا تھا۔'' سلطانہ نے مینا کو اس کی غلطی جتائی۔

''وہ میں نے خود تھوڑی توڑا تھا۔ میں تو اٹھا کر آ رہی تھی اور رطابہ دروازے کے پیچھے کھڑی تھی۔ اس نے مجھے ڈرایا تو وہ جگ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور آپ نے مجھے ہی مارا تھا، جبکہ رطابہ کو صرف ڈانٹا تھا۔'' مینا نے پھر سے سلطانہ کو وضاحت کرتے ہوئے بتایا تھا کہ وہ اپنی دونوں بیٹیوں میں فرق کرتی ہے۔

''اچھا اب میں اسے ماروں گی، کیوں کہ وہ تمہارے بسکٹ کھا گئی ہے۔ بڑی ندیدی ہوگئی ہے وہ۔ آج دیکھ لینا کس طرح میں اس کی پٹائی کرتی ہوں۔'' سلطانہ نے آخری روٹی توے پر ڈالتے ہوئے کہا اور مینا خوش ہوگئی۔

''لیکن امی میرے بسکٹس!'' بسکٹس پھر اس کے ذہن میں آ گئے۔

''اور لے لینا۔'' سلطانہ نے بات ختم کرنی چاہی۔

''نہیں امی وہ سعودی عرب والے بسکٹس تھے جو ماموں لائے تھے۔ وہ نہیں ملیں گے۔'' مینا کو بسکٹس کا کافی زیادہ غم تھا۔

''اوہ اچھا میں پیسے دے دوں گی۔''

''سچ؟'' مینا خوش ہوگئی۔

''ہاں بھئی ہاں۔'' سلطانہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس نے آخری روٹی کو توے سے اتار کر ہاٹ پاٹ میں رکھتے ہوئے اسے خوب اچھی طرح سے بند کر دیا۔

''رطابہ کو بھی ماریں گی نا؟'' مینا نے کچھ دھیمے سے پوچھا۔

''اسے بھی دو ہاتھ لگاؤں گی، بڑی بدتمیز ہوگئی ہے۔'' سلطانہ کا واقعی رطابہ سے سختی سے پیش آنے کا ارادہ تھا۔ مینا خوش ہوتی ہوئی کچن سے باہر چلی گئی۔

اب جا کر اس نے رطابہ کو بتانا تھا کہ چوری کے بسکٹس کھا کر وہ کس قدر بڑی مشکل میں گرفتار ہوگئی ہے۔

سلطانہ نے ہاٹ پاٹ اٹھا کر شیلف پر رکھا۔ سالن وہ پہلے ہی تیار کر چکی تھی، بس تھوڑی دیر میں سیف آ جاتے تو سب مل کر کھانا کھاتے۔

چند منٹ میں سلطانہ نے کچن کا کام سمیٹا۔ چولہے کے اردگرد کی جگہ صاف کی، جہاں روٹی پکانے کے دوران خشک آٹا گرتا رہا تھا۔ کچن سے نکل کر اس نے واش روم کا رخ کیا۔ منہ ہاتھ دھو کر وہ کمرے میں آ گئی۔

رطابہ اور مینا حسب معمول کسی بات پر الجھ رہی تھیں۔ ان دونوں نے جب سلطانہ کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا تو ایک دوسرے کی شکایت کرنے لگیں۔

سلطانہ نے پہلے تو رطابہ کی کافی کھنچائی کی۔ کان بھی مروڑا اور کمر پر ہلکے سے چپت بھی رسید کی۔

جواباً رطابہ یقیناً روتی اگر سلطانہ تنبیہ نہ کرتی کہ اگر وہ روئی تو سلطانہ اسے مزید مارے گی۔

رطابہ کے بعد انہوں نے مینا کی طرف رخ کیا اور اسے بھی ڈپٹتے ہوئے کہا کہ اب وہ چھوٹی بچی نہیں رہی کہ ہر بات پر یوں رطابہ سے لڑ پڑے اور مینا کچھ خائف سی ہو کر ماں کی نصیحت سننے لگی۔

ویسے وہ رطابہ کی کھنچائی کی وجہ سے اندرونی طور پر کافی خوشی محسوس کر رہی تھی۔

سلطانہ نے مینا کو نصیحت کرنے کے بعد دونوں لڑکیوں کی اکٹھی کلاس لی اور انہیں پیار محبت سے

رہنے کی نصیحت کی...... لڑکیاں برابر سر ہلا کر ماں کو یقین دلا رہی تھیں کہ وہ نہ صرف پیار محبت بلکہ محتاط بھی رہیں گی، لیکن سلطانہ کو محسوس ہو رہا تھا کہ لڑکیوں پر اس کی بات کا کوئی اثر نہیں ہو رہا ہے، اس لیے وہ چپ ہو گئی۔

''جانے کب یہ لڑکیاں سدھریں گی۔'' سلطانہ حقیقتاً دونوں سے پریشان تھی، لیکن کیا کرتیں، یہ بھی صحیح طرح سے سمجھائی نہیں دیتا تھا، بس وقتاً فوقتاً انہیں سمجھاتی اور ڈانٹتی رہتی۔

مینا گیارہ اور رطابہ نو سال کی ہونے والی تھی۔ ان کی عمروں میں دو سال کا فرق تھا، لیکن وہ ایک دوسرے کی پکی دشمن تھیں۔ ہر وقت ایک دوسرے کو ستاتی رہتی تھیں۔ لڑتی بھی بہت تھیں۔ بعض اوقات تو سلطانہ کو یہ گمان ہوتا کہ وہ بہنیں نہیں، بلکہ دشمن ہیں، جو ہر وقت ایک دوسرے کے لیے جال بننے کے لیے تیار رہتی ہیں، لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر رہتی بھی نہیں تھیں۔ اس بات کا اندازہ سلطانہ کو چھ مہینے پہلے ہوا تھا، جب امتحان کے بعد مینا چھٹیاں گزارنے ماموں کے گھر گئی تھی تو پیچھے دو دن میں ہی رطابہ نے مینا کو یاد کر کر کے بُرا حال کر لیا تھا۔ تیسرے دن اس نے نہ صرف سلطانہ سے وعدہ کیا، بلکہ قسمیں بھی کھائیں کہ وہ آئندہ کبھی بھی مینا سے نہیں لڑے گی اور اس کی چیزیں بھی نہیں کھائے گی۔ دوسری طرف مینا بھی بے چین تھی کہ کب گھر آئے، اس لیے چوتھے دن ہی وہ گھر آ گئی تھی، لیکن اس کے آنے کے بعد دونوں میں دو گھنٹوں کے اندر اندر زبردست لڑائی ہوئی تھی جس میں رطابہ بار بار اسے یہی کہتی رہی کہ جب تک وہ ماموں کے گھر تھی تب تک گھر میں چین تھا، اب پھر سے وہی ہنگامے'' اور مینا اس بات پر صرف پیچ و تاب کھاتی رہ گئی تھی۔

''ابو آ گئے......''

سیف کو دیکھ کر رطابہ نے چیخ کر کہا تھا۔ رطابہ کی چیخ کی وجہ سے سلطانہ کے چہرے پر ناگوار تاثرات ابھرتے تھے۔ رطابہ کو جھڑکنے سے اپنے آپ کو باز رکھتے ہوئے اس نے سیف کو سلام کیا۔

''وعلیکم السلام۔'' سیف نے خوشگوار انداز میں جواب دیا تھا۔

تھوڑی سی غیر ضروری گفتگو کے بعد سلطانہ مینا کو لے کر کھانا لگانے کچن کی طرف آ گئی۔ مینا منہ بسورے کام کرتی رہی۔

''میں کیوں کام کر رہی ہوں؟ جبکہ رطابہ ابو کے ساتھ بیٹھی ہوئی ہے۔''

مینا اپنے انداز سے سلطانہ کو جتا رہی تھی، لیکن سلطانہ کے لیے یہ معمول کی بات تھی، اس لیے اس نے اس طرف زیادہ توجہ نہ دی تھی۔

فرشی دسترخوان بچھ چکا تھا۔ سالن روٹی اور سلاد۔ بس یہی دسترخوان پر رکھا تھا، گھر کے چاروں افراد قانع طبیعت کے مالک تھے۔

''اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔'' کھانا کھانے کے بعد سیف نے کہا تھا، جبکہ سلطانہ نے ''الحمدللہ'' کہا تھا۔

کھانے کے بعد سیف اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔ ترتیب میں موجود تین کمروں میں سے تیسرا کمرہ سیف کے لیے مخصوص تھا۔ وہ کچھ تنہائی پسند واقع ہوئے تھے۔ گرمیوں کی لمبی دوپہریں تھیں۔ دسترخوان سمیٹنے کے بعد سلطانہ نے نماز ادا کی، جب تک لڑکیاں کسی اوٹ پٹانگ کام میں مصروف رہیں، پھر سلطانہ نے ڈپٹ کر ان کو سلا دیا۔

سیف کچھ مذہبی رجحان رکھتے تھے۔ مین بازار میں ان کی کپڑے کی دکان تھی، گو کہ ان کا کاروبار

کافی مندا رہتا تھا، اس لیے گھر کے حالات بس ٹھیک ہی تھے، کسی حد تک انہیں اچھا بھی کہا جا سکتا تھا۔ سلطانہ خود بڑی صابر وشاکر اور قانع طبیعت کی مالک تھی، لیکن وہ اپنی زندگی سے کافی مطمئن تھی۔

ان کا گھر کوئی خاص بڑا تو نہ تھا۔ برآمدے میں تین کمرے ترتیب میں اور دائیں طرف ایک باورچی خانہ تھا، جبکہ بائیں طرف اسٹور تھا اور واش روم صحن میں تھا۔ اس کے علاوہ صحن کے ایک کونے میں ایک بڑا سا کمرہ تھا جس کا ایک دروازہ باہر کی طرف بھی کھلتا تھا۔ یہ مہمان خانہ تھا، جسے وہ لوگ بیٹھک کہتے تھے۔

ان کی زندگی پرسکون گزر رہی تھی۔ ایک خوشگوار احساس ہر وقت ساتھ رہتا تھا، لیکن ایک کمی بھی تھی زندگی میں...... ان کے ہاں اب تک بیٹا نہیں ہوا تھا۔ رطابہ کے بعد سلطانہ دوبار حمل سے ہوئی تھی۔ ایک بار تو مردہ بیٹا پیدا ہوا تھا اور دوسری بار میں حمل ضائع ہو گیا تھا۔

بیٹے کی کمی کا احساس سلطانہ کو شدت سے ہوتا تھا، لیکن سیف نے کبھی یہ خواہش ظاہر نہیں کی تھی کہ کاش ان کے ہاں بیٹا ہوتا۔ اس بات پر سلطانہ جس قدر خدا کا شکر ادا کرتی کم تھا، لیکن پھر بھی اسے خواہش تھی کہ خدا اسے بیٹا دے۔ بلاشبہ بڑی بیٹی مینا بھی گیارہویں سن میں تھی، لیکن پھر بھی سلطانہ کے دل میں یہ خواہش شدت سے تھی کہ ان کے ہاں بیٹا ہو اور اس کے لیے وہ اکثر دعا گو رہتی تھی...... لیکن زندگی کبھی ایک ہی سُر تال پر سر نہیں ہلاتی۔ تقدیر کا اثر زندگی میں بہت سی تبدیلیاں پیدا کرتا ہے۔

سلطانہ اس بات سے واقف تھی، لیکن کبھی اس بات کا تجربہ اسے نہیں ہوا تھا۔

☆......☆......☆

''امی آج ٹیچر نے رطابہ کو سزا دی تھی'' مینا نے سلطانہ کو جوش وخروش سے بتایا تھا، لیکن اس کی نگاہیں رطابہ پر تھیں اور انداز خالصتاً چڑانے والا تھا۔

سلطانہ اس وقت کڑھائی کر رہی تھی۔ بڑی مہارت اور صفائی تھی اس کے ہاتھوں میں، دیکھنے والا حیران رہ جاتا تھا...... کڑھائی کا اسے شوق نہیں بلکہ چسکا لگا ہوا تھا۔ ایک سے بڑھ کر ایک کڑھائی کر لیتی تھی۔

مینا کی بات سن کر سلطانہ کا ہاتھ رک گیا۔

''کیوں بھئی...... ٹیچر نے کیوں سزا دی تھی؟......'' سلطانہ نے قدرے سخت لہجے میں پوچھا اور کڑھائی کا فریم اس نے سائڈ پر رکھ دیا جس کا صاف مطلب تھا کہ وہ اس موضوع پر پوری تفصیل سے گفتگو کرے گی۔

''وہ امی یہ...... یہ مینا جھوٹ بول رہی ہے۔'' رطابہ نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ مینا یہ بات سلطانہ کو بتا دے گی۔

''امی میں جھوٹ نہیں بول رہی، مجھے رمشا نے بتایا ہے کہ آج اس کا ہوم ورک مکمل نہیں تھا، اس لیے ٹیچر نے اسے ایک گھنٹہ کھڑا کیے رکھا۔ اس کے علاوہ اس نے یہ بھی بتایا کہ ہفتے میں ایک دو بار ٹیچر رطابہ کو ضرور سزا دیتی ہے۔ اکثر اس کا ہوم ورک مکمل نہیں ہوتا۔'' مینا نے بنا بریک لگائے ساری بات من وعن سلطانہ کے گوش گزار کر دی تھی۔

اس دوران رطابہ مینا کو کٹیلی نظروں سے دیکھتی رہی۔

رطابہ کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ مینا کا سر دیوار سے اتنی بار ٹکرائے کہ اور نہیں تو کم از کم سو بار مینا کو اس سے معافی مانگنی پڑے۔

ابھی وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ سلطانہ نے اس کا کان اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

''رطابہ! تم نے جھوٹ بولا۔'' اس کا انداز کافی

جارحانہ تھا۔

''نن نہیں......'' رطابہ ہکلا گئی۔

''ایک اور جھوٹ......'' سلطانہ نے رطابہ کا کان موڑتے ہوئے غضب ناک لہجے میں پوچھا۔

''سوری'' رطابہ نے کچھ دبے دبے لہجے میں نا صرف اپنی غلطی مان لی تھی، بلکہ معذرت بھی کی۔

سلطانہ نے رطابہ کے کان کو اپنے ہاتھ کی گرفت سے آزاد کر دیا۔

''جھوٹ بولنا ایک بہت بُری بات ہے۔ اس سے نہ صرف دینی، بلکہ دنیاوی نقصان بھی ہوتا ہے۔ جھوٹ کسی صورت نہیں بولنا چاہیے۔ یہ بڑے گناہوں میں سے ہے۔ ہمارے رسول اللہ ﷺ نے بھی جھوٹ بولنے کی بہت ممانعت کی ہے۔ جھوٹ مت بولا کرو......''

سلطانہ نے رطابہ کو نرمی سے سمجھانا شروع کر دیا۔ سلطانہ کو احساس تھا کہ جو بات وہ نرمی سے سمجھا سکتی ہے۔ وہ تیز لہجے میں نہیں سمجھا سکتی۔

رطابہ کو اپنی بات پر قدرے شرمندگی ہوئی۔ اس لیے اس نے دل ہی دل میں پکا ارادہ کیا کہ اب وہ کبھی جھوٹ نہیں بولے گی۔

سلطانہ کچھ دیر مزید رطابہ کو سمجھاتی رہی اور اسے تاکید کی کہ کبھی جھوٹ نہ بولنا اور پھر یہی تاکید مینا کو بھی کی۔ اس کے بعد سلطانہ اس سے پھر ہوم ورک کے بارے میں پوچھنے لگی۔

''امی بس ویسے ہی نہیں کیا......'' رطابہ نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

رطابہ کا جواب مبہم تھا، لیکن سلطانہ سمجھ گئی کہ رطابہ سستی کرنے لگی ہے۔

''میں نے کل تمہیں ساتھ تو بٹھایا تھا کہ ہوم ورک کر لو پھر بھی تم نے نہیں کیا۔'' رطابہ سر جھکائے بیٹھی رہی وہ شرمندہ تھی یا نہیں، سلطانہ کو کچھ اندازہ نہ ہوا۔

''میری خواہش ہے کہ میں تمہیں ڈاکٹر بنا دیکھوں اور تم اس طرح...... دیکھو رطابہ محنت اور ہمت ہمیشہ ضروری ہے۔ ایک پڑھنا ہی تمہارے ذمے ہے اور اس میں ہی تم لاپروائی کرتی ہو۔ اچھے بچے ہمیشہ اپنا کام مکمل کرتے ہیں۔ اگر ابھی سے تم نکمی ہو جاؤ گی تو ڈاکٹر کیسے بنو گی۔'' سلطانہ نے کوشش کی کہ اس کے دل میں بھی ڈاکٹر بننے کی خواہش پیدا ہو اور اس کے علاوہ سلطانہ نے اسے محنت کرنے اور سستی سے دور رہنے کی بھی ہدایت کی تھی۔

سلطانہ واقعی بہت اچھے طریقے سے بات سمجھاتی تھی کہ بات بالکل دل میں اُتر جاتی تھی۔ سلطانہ نے صرف میٹرک کیا تھا، لیکن اندازِ گفتگو واقعی لاجواب تھا۔

سلطانہ ابھی رطابہ کو مزید سمجھانا چاہتی تھی۔ اس کے علاوہ دونوں بہنوں کو چغلی نہ کرنے کی بھی نصیحت کرنا چاہتی تھی، لیکن عین وقت پر آنٹی عشرت آ گئیں۔

آنٹی عشرت سلطانہ کی اپنی والدہ کی عمر کی تھیں۔

''اے بہو کیا کر رہی ہو......؟؟'' آنٹی عشرت سلطانہ کو بہو کہہ کر مخاطب کرتی تھیں۔

''کچھ نہیں، بس بچیوں کو ذرا سمجھا رہی تھی......'' سلطانہ نے آنٹی عشرت کی بات کا جواب دیا۔

''کھڑی کیوں ہیں آپ...... بیٹھ جائیں نا؟'' آنٹی عشرت ابھی تک کھڑی ہوئی تھیں۔

''نہیں نہیں، بیٹھوں گی نہیں۔ ذرا جلدی میں ہوں، بس کھڑے کھڑے آئی ہوں۔'' یہ کہہ کر آنٹی عشرت بیٹھ گئیں اور سلطانہ کے لبوں پر مسکراہٹ آ کر ٹھہر گئی۔

''اور تم سناؤ۔ ٹھیک ہونا، باقی سب خیر خیریت

ہے نا۔'' آنٹی عشرت روز آتی تھیں اور روز یہی سوال کرتی تھیں۔

''جی اللہ کا شکر ہے، خیریت سے ہوں، آپ سنائیں انکل مرزا کیسے ہیں؟'' سلطانہ نے آنٹی عشرت کے شوہر کے بارے میں پوچھا۔

مرزا صاحب ریٹائرڈ فوجی تھے اور ریٹائرمنٹ کے بعد اسی طرح زندگی گزار رہے تھے، جس طرح ریٹائرڈ لوگ گزارتے ہیں۔

''وہ بھی خدا کے کرم سے ٹھیک ہیں۔ کہہ رہے تھے آج کل کم نظر آرہا ہے۔ اب کچھ دنوں تک ڈاکٹر کے پاس چلیں گے۔'' آنٹی عشرت نے شوہر کا حال بتایا۔

''اور نعیم ملنے آیا......؟؟'' سلطانہ اب آنٹی عشرت سے بیٹے کے بارے میں دریافت کررہی تھی۔ نعیم آنٹی عشرت اور مرزا صاحب کی اکلوتی اولاد تھا، جو ان سے الگ رہتا تھا۔ اپنی بیوی کے ساتھ..... حنا اور آنٹی عشرت کی کبھی نہیں بنی تھی۔ اس کی وجہ صرف یہ نہیں کہ حنا اچھی بہو نہیں تھی، بلکہ یہ بھی تھی کہ آنٹی عشرت اچھی ساس نہیں تھیں۔ اسی لیے شادی کے چھ ماہ بعد ہی نعیم اپنی بیوی کو لے کر علیحدہ ہوگیا تھا اور اب گھر میں آنٹی عشرت اور مرزا صاحب ہی رہتے تھے۔

''آیا تھا کل ملنے.....'' آنٹی عشرت نے ٹھنڈی سانس لی اور پھر سے بات شروع کی۔ ''کچھ فروٹ بھی لیے ہوئے تھے اس نے اور کچھ پیسے بھی دے کر گیا ہے۔ یہی کوئی چار ہزار، میں نے لے لیے۔ مرزا صاحب کو اس کے آنے کا تو بتایا ہے لیکن پیسوں کے بارے میں نہیں بتایا، انہیں بتاؤں گی بھی نہیں۔ بس ایسے دو منٹ بیٹھا تھا پھر چلا گیا۔ کم بخت حنا کے پورے دام میں ہے۔ یہاں آتا ہے تو بھی حنا کی ہی باتیں کرتا رہتا ہے۔''

آنٹی عشرت حنا سے کچھ بدظن تھیں۔ بلاشبہ حنا کوئی اچھی بہو نہیں تھی، بلکہ ایک اچھی بیوی تھی۔ اگر آنٹی عشرت اور حنا میں نہیں بنتی تھی تو اس میں آنٹی عشرت بھی برابر کی قصوروار تھیں، لیکن آنٹی عشرت سلطانہ سے کافی خوش تھیں اور سلطانہ بھی انہیں پسند کرتی تھی۔ بس زبان کی ذرا تیکھی تھیں۔ تھوڑا بہت بغض بھی رکھ لیتی تھیں، لیکن بہت مہربان طبیعت اور مشکل میں کام آنے والی تھیں۔ اگر حنا ہی تھوڑی عقل سے کام لے لیتی تو حالات قدرے مختلف ہوتے، لیکن خیر۔

ایسی ہی چند ایک معمول کی باتیں سلطانہ اور آنٹی عشرت کے درمیان ہوئیں۔ رطابہ اور مینا پڑھنے کی بجائے ان کی گفتگو پورے انہماک سے سن رہی تھیں۔ ان دونوں کو آنٹی عشرت کا انداز گفتگو بہت پسند تھا۔ اسی لیے وہ جب بھی آتیں تو دونوں لڑکیاں 'سارے کام' چھوڑ کر انہیں سننے بیٹھ جاتیں۔ سلطانہ نے جب دیکھا لڑکیاں اسکول کا کام نہیں کررہی تو انہیں ہال کمرے میں جاکر اسکول کا کام کرنے کی سختی سے ہدایت کی اور یہ بھی کہا کہ کچھ دیر بعد وہ انہیں چیک کرتی ہے۔ رطابہ اور مینا منہ بسورتے ہوئے ہال میں چلی گئیں۔ اتنے میں آنٹی عشرت کی نظر پاس پڑے اس فریم پر پڑی جس میں موجود کپڑے پر سلطانہ کڑھائی کررہی تھی۔

''ہائے بہو!!......'' ان کے منہ سے بس اتنا ہی نکلا اور وہ منہ کھول کر کڑھائی کو دیکھنے لگیں۔ ان کی نظر کافی اچھی تھی اور وہ کافی انہماک سے اس سوٹ پر موجود کڑھائی کو دیکھ رہی تھیں۔

دو منٹ وہ اس کڑھائی کا معائنہ کرتی رہیں جو سلطانہ کررہی تھی۔ سلطانہ کو معلوم تھا کہ تھوڑی دیر بعد وہ اس کڑھائی کی تعریف کریں گی، لیکن پھر بھی وہ اشتیاق سے ان کے معائنے کا 'معائنہ' کرتی رہی۔

''مینا کا ہے یا رطابہ کا......'' آنٹی عشرت نے پوچھا تھا۔ کڑھائی کو ابھی تک وہ اسی اشتیاق سے دیکھ رہی تھیں۔

''یہ مینا کا ہے رطابہ کا پہلے ہی کاڑھ چکی ہوں۔''

''بہو مجھے بھی ایک آدھ سوٹ پر کچھ اسی طرح کڑھائی کردو، پہلے بھی تم سے کہہ چکی ہوں......اتنی اچھی کڑھائی کرتی ہو تم ماشاء اللہ کسی کی نظر نہ لگے۔''

''آنٹی آپ مجھے سوٹ لادیں اور یہ بھی بتادیں کہ کیسی کڑھائی کرنی ہے، میں کردوں گی۔ میں نے پہلے بھی آپ سے کہا تھا، لیکن آپ سوٹ لا کر ہی نہیں دیتیں۔'' سلطانہ نے دل سے کہا تھا۔ اگر آنٹی عشرت کو واقعی اس کی کڑھائی پسند ہے تو وہ انہیں کردے گی۔ اس کے لیے یہ کوئی باعث مشقت بات نہیں تھی۔

''ایک تو یہ میری عقل بھی نا...... بھول جاتی ہوں، لیکن اب دیکھ لینا میں سوٹ لے کر آؤں گی۔'' آنٹی عشرت نے اپنی عقل کو کوستے ہوئے اپنا مستقبل کا ارادہ بتایا۔ کچھ دیر یوں ہی بس کڑھائی پر باتیں ہوتی رہیں، جس میں زیادہ تر آنٹی عشرت سلطانہ کی کڑھائی کی تعریف کرتی رہیں اور آنٹی عشرت نے یہ بھی بتایا کہ انہیں بھی کڑھائی سیکھنے کا بڑا شوق تھا لیکن سیکھ نہ پائیں۔

''اور تم سناؤ سیف کیسا ہے؟؟......'' آنٹی عشرت نے سلطانہ سے شوہر کے بارے میں پوچھا۔ سیف کی والدہ فرخندہ سے بھی آنٹی عشرت کی کافی دوستی تھی اور ایک دوسرے کے گھر بھی آتے جاتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد بھی یہ سلسلہ موقوف نہیں ہوا تھا، لیکن اب صرف آنٹی عشرت ہی آتی تھیں......سلطانہ تو بس عید پر ہی ہو آتی۔

''وہ بھی ٹھیک ہیں'' سلطانہ نے کچھ اٹکتے ہوئے بتایا۔ چند لمحے یوں ہی بیٹھے رہنے کے بعد اس نے آنٹی عشرت سے کہا ''کل رات نہیں آئے اور آج دوپہر کے کھانے پر بھی نہیں آئے، وگرنہ قیلولہ کرنے تو ضرور آتے ہیں۔''

''کیوں بھئی!!...... کیوں نہیں آئے۔'' آنٹی عشرت کو حیرت ہوئی۔

''کہتے ہیں کوئی دوست ہے......کافی امیر ہے، بس اسی کے پاس رہ جاتا ہوں۔'' سلطانہ نے کچھ ٹھہر کر کہا تھا۔

''ہیں...... ایسا کون سا دوست ہے جس کے پاس رہ بھی لیتا ہے؟'' آنٹی عشرت کو کافی حیرت ہوئی۔

''کیا اس دوست کے بال بچے نہیں ہیں؟''

''نہیں۔ اس کے بیوی بچے نہیں ہیں۔ بیوی کا کافی سال پہلے وصال ہوگیا تھا، بچہ کوئی ہوا نہیں۔ بس کافی محبت کرتے تھے اپنی بیوی سے۔ اتنے سال گزر جانے کے بعد بھی اسے یاد کرتے رہتے ہیں۔ سیف کہتے ہیں کہ اسے ان کی ضرورت ہے بس پھر اس لیے وہ جاتے ہیں وہاں۔ سیف تو یہ بھی بتا رہے تھے کہ کبھی کبھی بیوی کی یاد میں دورے بھی پڑتے ہیں بس پھر اسی لیے...... ویسے بتا رہے تھے کافی امیر ہے۔ کئی فیکٹریاں ہیں اس کی۔ دل چاہا تو فیکٹری پر توجہ دے دی ورنہ وہ بھی مینیجروں کے سہارے چل رہی ہیں۔'' سلطانہ نے ساری ''رام کتھا'' مختصراً بیان کی اور آنٹی عشرت حیرت سے منہ کھولے سلطانہ کا چہرہ دیکھتی رہیں۔

''سیف کی کب سے یہ دوستی ہے۔'' آنٹی عشرت نے پوچھا تھا۔ ایک تو اس دوست کی شخصیت عجیب وغریب تھی۔ دوسری عجیب بات یہ تھی کہ سیف کی اس سے دوستی تھی ورنہ جہاں تک آنٹی عشرت سیف کو جانتی تھیں وہ تو کافی لیے دیے رہنے والا

انسان تھا، پھر یہ دوستی...... آنٹی عشرت کافی حیرت میں پڑ گئی تھیں۔

''جی کہہ رہے تھے بچپن سے ہے۔'' سلطانہ کا جواب سن کر آنٹی عشرت کافی شش و پنج میں مبتلا ہوگئیں۔ واقعی فرخندہ کے ہوتے ہوئے تو کبھی فرخندہ نے سیف کے کسی امیر دوست کے بارے میں نہیں بتایا تھا اور اگر بچپن میں سیف کا کوئی دوست امیر ہوتا بھی تو بھی فرخندہ سیف کو اس سے دور رکھتیں۔

''لیکن پھر بھی بہو...... رات رہنا مناسب نہیں۔ پیچھے تم اور بچیاں بھی تو اکیلی ہوتی ہو۔'' آنٹی عشرت نے کہا تھا، ان کی بات میں کافی وزن تھا۔

''میں کہتی ہوں، وہ ہر بار کہتے ہیں بس یہ آخری دفعہ قیام کیا تھا، آئندہ نہیں ہوگا، لیکن پھر مہینے میں ایک دو دن نہیں آتے۔ سلطانہ آج شاید سب کچھ بتانے کا ارادہ کیے بیٹھی تھی۔

''تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟؟'' آنٹی عشرت کا شکوہ بجا تھا۔

''وہ بس اس لیے......'' سلطانہ سے جواب نہیں بن پا رہا تھا۔ وہ کیا بتاتی کہ پہلے اسے بتانا مناسب نہیں لگا۔ اگر پہلے مناسب نہیں تھا تو اب کیوں بتا رہی تھی، شاید اب وہ بھی کافی خوف کا شکار تھی۔

آنٹی عشرت نے سلطانہ کے جواب کا انتظار نہ کیا اور کہا۔

''بہو بُرا مت ماننا، مجھے تو دال میں کچھ کالا محسوس ہو رہا ہے۔ تم سیف سے سختی سے کہو کہ وہ رات گھر سے باہر نہ گزارے اور اس سے یہ بھی کہو کہ وہ اپنے اس دوست سے تمہیں بھی ملوائے۔''

''لیکن میں...... میں ان کے دوست سے کس طرح ملوں، میں تو حجاب کرتی ہوں۔'' سلطانہ کو عشرت آنٹی کی دوسری بات پر اعتراض تھا۔

''اگر وہ سیف کا اچھا دوست ہے اور دوستی گاڑھی بھی ہے تو ایک مرتبہ ملاقات میں کوئی حرج نہیں ہے اور تم اب سیف کو بھی کھینچ کر رکھو...... اس طرح تمہیں چھوڑ کر رات باہر گزارنا بہت معیوب بات ہے۔ ویسے تم نے بھی غیریت برتی ہے۔ اگر مجھے پہلے بتا دیتیں تو...... چلو چھوڑو اس بات کو۔ پھر بھی تمہیں رات اکیلے گزارنے میں، وہ بھی اتنے بڑے گھر میں عجیب نہیں لگتا؟'' آنٹی عشرت نے نصیحت کی اور اس نصیحت کے درمیان ہلکا سا شکوہ بھی کر لیا تھا۔

سلطانہ نے ان کی بات غور سے سنی اور اس کا واقعی سیف سے بات کرنے کا ارادہ بن گیا تھا کہ وہ رات گھر سے باہر نہ گزارے، البتہ اس کے دوست سے ملنے پر اسے اعتراض تھا۔

آنٹی عشرت آدھ گھنٹہ مزید بیٹھی رہیں اور سلطانہ سے ارد گرد کی باتیں کرتی رہیں، کیوں کہ انہیں 'جلدی' تھی، اس لیے وہ چلی گئیں اور سلطانہ بھی ان کے جانے کے بعد گھر کے دیگر کاموں میں مصروف ہوگئی۔

☆......☆......☆

اس رات بھی سیف گھر نہیں آیا۔ سلطانہ کو طرح طرح کے وسوسوں نے تنگ کیے رکھا۔ رات کی تاریکی نے بھی وحشت میں مبتلا کیے رکھا۔ اسی لیے ساری رات وہ سو نہ سکی۔ ایک خوف اس کے دل میں گھر کر گیا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب سیف اکٹھی دو راتیں گھر سے باہر رہا تھا، اس لیے سلطانہ کے لیے یہ بات کافی پریشان کن تھی۔ ثانوی طور پر اس کے دل میں یہ وہم بھی آیا کہ کہیں سیف کو کچھ ہو نہ گیا ہو۔ اسی لیے وہ سیف کی سلامتی کی دعا بھی کرتی رہی۔

رات کا کام گزرنا تھا، سو وہ گزر گئی۔ صبح اس کا سر

رات بھر نہ سونے کی وجہ سے بوجھل تھا، سر میں ہلکا ہلکا درد بھی تھا، اس لیے بے دلی سے اس نے بچیوں کے لیے ناشتا تیار کیا تھا۔ رطابہ اور مینا ابھی ناشتا ہی کر رہی تھیں کہ سیف آ گئے۔ رات بھر کی گھبراہٹ اور پریشانی کی وجہ سے سلطانہ کافی ڈپریس تھی۔

''کہاں تھے آپ، دو دنوں سے گھر نہیں آئے۔'' سلطانہ نے کمال ضبط سے پوچھا تھا، ورنہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ رونے بیٹھ جائے۔

موقع تو ایسا تھا کہ وہ سیف سے غصہ کرتی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اسے غصہ کرنا نہیں آتا تھا۔

''وہ وحید کی طبیعت بہت خراب تھی نا...... اسپتال میں داخل تھا۔ وہ...... بس اس لیے نہیں آ سکا۔'' سیف نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

''اور میں اور میری بچیاں...... یہ سوچا تھا کہ وہ رات کس طرح گزاریں گی؟'' سلطانہ ضبط کی انتہا پر تھی۔

''سوچا تھا...... لیکن سلطانہ میں مجبور تھا۔ اسے میری ضرورت تھی۔'' سیف کے لہجے میں بے چارگی تھی۔

سلطانہ کا دل چاہا کہ کوئی چیز اٹھا کر اپنے سر پر دے مارے، لیکن وہ یہ چاہ کر بھی نہیں کر سکتی تھی۔ پچھلی رات اس نے کس قدر وحشت میں گزاری تھی، اس کا اندازہ اسے ہی تھا۔

مینا اور رطابہ بھی اب کوئی دودھ پیتی بچیاں نہیں تھیں۔ انہیں بھی پتا چل رہا تھ کہ ان کی ماں کے لہجے میں تلخی کی وجہ ان کے باپ کی راتوں کی غیر حاضری ہے۔

''سیف! آپ کا دوست آپ کی ذمہ داری نہیں۔ اس کے کئی چاہنے والے ہوں گے، لیکن میں آپ کی ذمے داری ہوں، مجھے آپ کی ضرورت ہے۔ آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ میں نے پچھلی رات کس قدر مشکل سے گزاری ہے۔'' سلطانہ نے سب کچھ سیف پر واضح کر دیا۔ وہ واقعی سیف کے بنا ادھوری تھی۔

''سوری۔'' سیف نے کچھ بے چارگی سے کہا تھا۔ وہ کچھ اُلجھا اُلجھا سا تھا۔ ''آئندہ قیام نہیں کروں گا۔'' سیف نے تھوڑے وقفے سے کہا تھا۔

سلطانہ کچھ دیر سیف کا منہ دیکھتی رہی اور پھر بنا کچھ کہے کچن کی طرف چلی گئی۔ اسے سیف کے 'آئندہ قیام نہیں کروں گا' پر اعتبار نہیں تھا۔ اس کا اب ارادہ بن گیا تھا کہ وہ سیف سے کہے گی کہ وہ وحید سے ملنا چاہتی ہے۔

سلطانہ کے کچن میں جانے کے بعد سیف نے ایک گہرا سانس لیا تھا اور خود کلامی کے انداز میں کہا تھا۔

''وہ بھی میری ذمے داری ہے، سلطانہ بیگم۔''

☆......☆......☆

''می...... نا...... مینا......'' مینا کچھ سوچتے ہوئے اپنا نام دہرا رہی تھی۔

''می...... ی ی ی...... نا۔'' اب کی بار اس نے مینا کی ''ی'' کو کافی کھینچا تھا۔ اب وہ ناک بھوں چڑھائے کچھ سوچ رہی تھی۔

سلطانہ ساتھ بیٹھی کڑھائی کر رہی تھی۔ بڑے انہماک سے وہ کڑھائی کرنے میں مصروف تھی، جبکہ رطابہ کی ایک کلاس فیلو نے اس کی انگلیاں گن کر گیارہ کی تھیں۔ اسے اب تک یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ الٹا گننے سے اس کی انگلیاں گیارہ کس طرح ہو جاتی ہیں اور وہ اسی لیے بار بار الٹے سیدھے سب طریقے سے انگلیاں گن رہی تھی اور بے حد 'مصروف' تھی۔

مینا نے الجھے ہوئے انداز میں رطابہ اور سلطانہ کو

دیکھا اور ماں کو مخاطب کیا۔

''امی......'' ساتھ ساتھ اس نے ماں کا کندھا بھی ہلانا شروع کر دیا۔

''مینا......'' بہری نہیں ہوں، کندھا ہلانا ضروری تھا؟ دیکھو سوئی کہیں گر گئی ہے۔'' سلطانہ نے کچھ سخت الفاظ میں مینا کو ٹوکا تھا۔

مینا نے اپنا ہاتھ سلطانہ کے کندھے سے ہٹا دیا۔

''امی آپ نے میرا نام مینا کیوں رکھا تھا؟'' مینا نے کچھ الجھتے ہوئے سلطانہ سے پوچھا تھا۔

''کیا مطلب......؟'' سلطانہ کو مینا کا سوال سمجھ نہیں آیا تھا۔ وہ ہنوز کڑھائی کر رہی تھی۔

مینا کا سوال سن کر رطابہ بھی ان کی طرف متوجہ ہوگئی۔ شاید وہ تھک گئی تھی اور اسے ابھی تک یہ سمجھ نہیں آیا تھا کہ الٹا گننے سے انگلیاں کس طرح گیارہ ہو جاتی ہیں۔

''یہی کہ آپ نے میرا نام مینا کیوں رکھا تھا؟'' مینا نے اپنا سوال پھر سے دہرایا تھا۔

''کیوں کہ مینا نام مجھے اچھا لگتا تھا...... بلکہ بہت اچھا لگتا تھا۔'' سلطانہ نے سرسری سا جواب دیا تھا۔ اس کی اب بھی ساری توجہ اس بیل پر تھی جسے وہ کاڑھ رہی تھی۔

''می......نا...... یہ بھی کوئی نام ہے؟'' مینا نے اپنا نام دو ٹکڑوں میں ادا کیا تھا۔ مینا کی بات سن کر سلطانہ نے ہاتھ روک کر تیکھی نظروں سے مینا کو دیکھا تھا اور پھر سے اپنے کام میں مصروف ہوگئی تھی۔

سلطانہ کی نظروں سے مینا لمحہ بھر کے لیے گڑبڑا سی گئی تھی، لیکن پھر اس نے اپنی سابقہ پوزیشن برقرار کر لی۔ رطابہ اس منظر پر ہلکا سا مسکرا دی تھی۔

''امی پھر تو آپ نے مجھ سے زیادتی کی تھی۔'' مینا کو ہمیشہ یہی قلق رہتا کہ اس سے زیادتی کی جاتی ہے اور رطابہ کو اس پر فوقیت دی جاتی ہے۔ اسے آج اسی قسم کی ہونے والی زیادتی یاد آ رہی تھی۔

سلطانہ نے مینا کی بات پر زیادہ توجہ نہ دی اور وہ بیل کاڑھنے میں ہی مصروف رہی تھی۔ اسے اندازہ تھا اب بھی وہ کوئی اوٹ پٹانگ سی بات کرنے والی ہے، پھر بھی اس نے سرسری سا پوچھ لیا تھا۔

''کیسی زیادتی......؟''

''دیکھیں نا، میرا نام کتنا چھوٹا ہے، بس مینا۔ جبکہ رطابہ کا نام کتنا بڑا ہے...... رط...... طابہ...... ویسے بھی مینا نام بہت عام سا ہے، خود میری کلاس میں بھی ایک لڑکی پڑھتی ہے، اس کا نام بھی مینا ہے، جبکہ رطابہ نام کی ہمارے پورے اسکول میں کوئی دوسری لڑکی نہیں ہوگی۔'' مینا نے اپنا موقف بیان کیا۔

مینا کی بات سن کر رطابہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ چپک گئی تھی۔ بہن کو چڑانے کا ایک اور موضوع جو اس کے پاس آ گیا تھا۔

سلطانہ کو بھی کچھ ایسی ہی اوٹ پٹانگ سی بات کی توقع تھی، لیکن اب مینا کو مطمئن بھی کرنا تھا۔ چنانچہ سلطانہ نے دونوں لڑکیوں کو ان کے نام کا پس منظر بتانا شروع کیا۔ اس دوران اس نے بیل کاڑھنا بند نہیں کی، البتہ اس کے کام میں آہستگی ضرور آ گئی تھی۔

''جب میں چھوٹی تھی تو ہمارے گھر کے پاس ایک آنٹی رہتی تھی جو بچوں کو پڑھاتی تھی۔ ان کا نام مینا تھا۔ مجھے وہ نام بڑا پسند تھا۔ شادی کے بعد ایک دن سیف نے مجھ سے پوچھا کہ تمہیں کوئی نام پسند ہے تو میں نے جواب میں 'مینا' کہا تھا۔ اسی لیے انہوں نے پہلی بیٹی کا نام مینا رکھا تھا جو مجھے بہت اچھا لگا تھا۔ رطابہ کے وقت بھی انہوں نے مجھ سے پوچھا تھا کوئی نام پسند ہے تو بتا دو۔ میں نے کہا تھا جو نام آپ کو پسند ہو وہی مجھے اچھا لگے گا تو پھر انہوں نے

دوسری بیٹی کے لیے ''رطابہ'' پسند کیا تھا۔'' سلطانہ نے انہیں مختصر مختصر سب کچھ بتا دیا۔

مینا اور رطابہ سلطانہ کی بات پوری توجہ سے سنتی رہیں۔ سلطانہ کی بات ختم ہونے کے تھوڑی دیر بعد مینا پھر بولی۔

''یعنی میرا نام آپ نے اپنے دور کی آنٹی کے نام سے رکھا تھا۔'' اسے واقعی یہ سن کر بہت دکھ ہوا تھا کہ اس کا نام اتنا پرانا ہے۔

''مینا......'' سلطانہ نے کچھ اونچی آواز میں الفاظ کو چباتے ہوئے کہا۔

''چپ کر کے بیٹھو اور میرا سر نہ کھاؤ۔'' مینا نے شاکی نظروں سے ماں کو دیکھا اور وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔

''گیارہ سال کی ہوگئی ہے اور ابھی تک ذرا بھی عقل استعمال نہیں کرتی۔'' سلطانہ نے سوچا تھا۔

''امی ہمارا کوئی بھائی کیوں نہیں ہے؟؟''

رطابہ نے کچھ اٹکتے ہوئے پوچھا تھا۔ سلطانہ کو اس سوال کی توقع ہرگز نہ تھی جس بات کی اسے خود حسرت تھی اور جس بات کی محرومی کا احساس اسے خود ہوتا تھا، آج اس بارے میں اس کی بیٹی پوچھ رہی تھی۔

سلطانہ کے پاس رطابہ کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ رطابہ ماں کا چہرہ دیکھتی رہی کہ شاید وہ کچھ بولیں گی، لیکن کافی دیر جب ہ کچھ نہ بولی تو رطابہ نے ہی بات شروع کی۔

''امی، وہ جو میری دوست ہے نا، رمشا، اس کے چار بھائی ہیں۔ وہ کہتی ہے میرے بھائی بہت اچھے ہیں، ہمیں بہت پیار کرتے ہیں، بڑے بھائی تو اسے خود موٹر سائیکل پر چھوڑنے بھی آتے ہیں۔ آج اس نے بریک میں جو چاکلیٹ کھائی تھی، وہ اسے اس کے چھوٹے بھائی نے دی تھی۔ اس کا چھوٹا بھائی بہت چھوٹا ہے۔ ابھی ون کلاس میں پڑھتا ہے۔ مجھے بہت اچھا لگتا ہے امی وہ ٹائی بھی لگاتا ہے......''

رطابہ بولے جا رہی تھی اور سلطانہ بس اسے دیکھے جا رہی تھی۔

رطابہ کو بھائی کی خواہش ہو رہی تھی، جبکہ سلطانہ کو بیٹے کی حسرت ہو رہی تھی، لیکن تقدیر کے آگے سب بے بس ہوتے ہیں۔

'امی ہمارا بھائی آخر کیوں نہیں ہے؟'' رطابہ نے اپنی بات کے آخر میں دوبارہ وہی سوال کیا تھا۔

سلطانہ نے رطابہ کو جواب دینا تھا اور وہ اس کے سوال کا جواب دینے کے لیے اپنے آپ کو تیار کر رہی تھی۔

''رطابہ، اللہ کی مرضی ہے، وہ جسے چاہے جو چیز چاہے دے دے۔'' رطابہ کے ساتھ ساتھ سلطانہ اپنے آپ کو بھی یہ بات سمجھا رہی تھی، لیکن رطابہ کی طرح اسے خود بھی یہ بات صحیح طرح سمجھ نہیں آئی تھی۔

''لیکن مجھے تو بھائی چاہیے۔'' رطابہ نے منہ پھلاتے ہوئے کہا تھا۔

رطابہ کی فرمائش نما ضد سن کر سلطانہ کے گلے میں کوئی چیز پھنس سی گئی تھی۔ یہ آنسوؤں کا گولہ تھا فوراً سے پیشتر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ سجا کر بولی۔

''تو پھر اللہ سے دعا کرو، وہ تمہیں بھائی دے دے۔'' سلطانہ کی آنکھیں جلنا شروع ہوگئی تھیں۔ اس لیے اس نے مسلنا شروع کر دیں کہ شاید جلن کم ہو جائے۔ آج سے پہلے کبھی اسے اس قدر محرومی کا احساس نہیں ہوا تھا۔

''اگر ہم اللہ سے دعا کریں گے تو وہ ہمیں بھائی دے دے گا؟؟'' رطابہ نے معصومیت سے پوچھا تھا۔ اس کے معصوم سے سوال سلطانہ کے لیے جتنی

بڑی آزمائش تھے، اس کا اندازہ صرف سلطانہ کو ہی تھا۔

''ہوں، دل سے دعا کرو گی تو وہ ضرور پوری کرے گا۔'' سلطانہ کے چہرے پر ابھی تک وہ مصنوعی پھیکی مسکراہٹ موجود تھی۔

''دل سے دعا...... وہ کس طرح کرتے ہیں؟ مجھے تو ہاتھوں سے دعا کرنا آتی ہے۔ اس طرح......'' رطابہ نے اپنے دونوں ہاتھ دعا کے سے انداز میں اٹھا کر ماں کو دکھائے تھے۔

''دل سے دعا کا مطلب ہے یوں سمجھو کہ اللہ ہماری دعا سن رہا ہے اور وہ ہماری دعا ضرور قبول کرے گا۔''

''ہوں...... تو پھر میں ابھی اللہ سے دعا کرتی ہوں کہ وہ ہمیں بھائی دے دے۔'' رطابہ نے اسی وقت اپنا چھوٹا سا دوپٹا سر پر رکھا اور ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے لگی۔

''اے اللہ کریم! مجھے بھائی دے دو، آپ مجھے بھائی ضرور دینا، کیوں کہ میں آپ سے دل سے دعا مانگ رہی ہوں۔'' رطابہ اونچی آواز میں دعا مانگ رہی تھی اور سلطانہ ایک اَن دیکھا درد سینے میں محسوس کررہی تھی۔ آج سے پہلے وہ کبھی بیٹے کی حسرت کے لیے روئی نہیں تھی۔ آج رونے کو دل کررہا تھا، لیکن وہ ضبط کیے بیٹھی تھی۔

رطابہ نے جیسے ہی منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ''آمین'' کہا تو ساتھ ہی سلطانہ نے بھی ''آمین'' کہا تھا۔

''امی اب ہمارا بھائی بھی آجائے گا نا، کب آئے گا۔'' رطابہ کا یہ سوال سب سے بڑی آزمائش تھا۔ کیا جواب دے اس کا، سلطانہ کو سمجھ نہیں آرہا تھا۔

''امی میں مینا کو بتانے جارہی ہوں کہ ہمارا بھائی بھی آرہا ہے۔'' رطابہ خود ہی اٹھ کر اندر کی طرف بھاگ گئی۔

رطابہ کے جانے کے بعد سلطانہ کی آنکھوں میں تھوڑی سی نمی آئی، لیکن سلطانہ نے اسے پونچھ لیا۔

اور وہ پھر سے فریم کی طرف متوجہ ہوئی، لیکن پتا ہی نہ چلا کہ کیا کرے۔ سو اس نے کڑھائی کا فریم ایک طرف رکھ دیا۔

☆......☆......☆

''سلطانہ! تم سے ایک بات کرنی ہے۔'' سیف نے پراٹھے کا ایک لقمہ منہ میں رکھتے ہوئے کہا تھا۔ ان کے لہجے میں کچھ تذبذب تھا۔

''جی کہیے، سلطانہ کو کچھ حیرت ہوئی۔ سیف کھانے کے دوران بولا نہیں کرتے تھے، لیکن وہ شاید کوئی خاص بات کرنا چاہتے تھے اس لیے سلطانہ کو ذہنی طور پر تیار کررہے تھے۔

''ناشتا ختم کرلوں...... پھر'' سیف نے بے دلی سے پراٹھے کا ایک اور لقمہ توڑا۔ ناشتا کافی مزیدار تھا، لیکن سیف جو بات کرنا چاہتے تھے وہ سیف کے دماغ پر چھائی ہوئی تھی، اسی لیے ناشتا کرنے کا اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔

سلطانہ نے سیف کی عدم دلچسپی محسوس کرلی تھی، لیکن کچھ بولی نہیں تھی۔ اس کا دل بڑی شدت سے دھڑکا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ کوئی انہونی ہوچکی ہے یا ہونے والی ہے۔

مینا اور رطابہ اسکول جاچکی تھیں، عموماً سیف ناشتا بچیوں کے ساتھ ہی کرتے تھے اور ان کے جانے کے بعد وہ بھی چلے جاتے تھے، لیکن آج ان کے جانے کے بعد کافی دیر سے ناشتا کررہے تھے اور سلطانہ سے بھی کوئی خاص بات کرنا چاہتے تھے۔

''شاید وہ آج دکان پر دیر سے جائیں۔'' سلطانہ نے یہی سوچا تھا۔

سیف کے سامنے چنگیر میں چند لقمے رہ گئے تھے۔ سلطانہ اندر کچن میں گئی اور سیف کے لیے چائے لے آئی۔ سیف ناشتے کے بعد چائے ضرور پیتے تھے۔ چائے انہیں کافی اچھی لگتی تھی، بلکہ ان کا پسندیدہ مشروب چائے تھی، لیکن وہ بہت زیادہ گرم چائے نہیں پیتے تھے۔

سلطانہ چائے کبھی کبھار ہی پیتی تھی، آج اس نے صرف سیف کے لیے ہی چائے بنائی تھی۔ وہ چولہے سے ابھی اتار کر آئی تھی۔ چائے کافی گرم تھی۔ سلطانہ نے چائے سیف کو پکڑائی۔

''یہاں میرے ساتھ بیٹھو۔'' سیف نے سلطانہ کو اپنے ساتھ بٹھایا۔ وہ اس وقت برآمدے میں بچھے تخت پر بیٹھے تھے۔

صبح صبح موسم کافی اچھا تھا۔

برآمدے میں ہال کمرے اور سیف کے کمرے کے دروازے کے درمیان کافی جگہ تھی۔ تخت وہیں پر لمبائی کے رخ پڑا ہوا تھا، جس پر ایک کھیس اور کھیس کے اوپر جامنی رنگ کی چادر بچھی ہوئی تھی، جس پر بڑے بڑے سفید پھول پرنٹ تھے۔

سیف نے چائے کا کپ ہونٹوں سے لگایا اور جب ہٹایا تو وہ خالی تھا۔

سلطانہ ششدر رہ گئی۔ سیف نیم گرم چائے پیتے تھے اور آج اتنی گرم چائے اور وہ بھی ایک سانس میں...... آخر ایسی کیا بات ہے، سلطانہ کو اپنا دل بیٹھتا ہوا محسوس ہوا۔

چائے کا کپ سیف نے ایک طرف رکھ دیا اور کچھ دیر وہ یوں ہی بیٹھے رہے۔ سیف سلطانہ سے 'وہ' بات کرنا چاہتے تھے، بلکہ وہ سلطانہ کو 'وہ' بات بتانا چاہ رہے تھے۔

کتنے ہی لمحے یوں ہی گزر گئے۔ سلطانہ کا دل بڑی تیزی سے دھڑک رہا تھا، کیا بات ہے، خدا خیر کرے۔ اسے کچھ خوف محسوس ہونے لگا تھا۔

''کیا بات ہے۔ کچھ بتائیں بھی سہی۔'' سلطانہ نے دھڑکتے دل سے پوچھا تھا۔

''بتاتا ہوں۔'' سیف نے ایک گہرا سانس لیا اور چند لمحوں کے توقف کے بعد سلطانہ کو حقیقت بتائی۔

''میرا بیٹا پیدا ہوا ہے۔'' سیف کی آواز قدرے پست تھی۔

''کیا...... کیا کہا آپ نے؟؟'' سلطانہ کو لگا اسے سننے میں کچھ غلطی ہوئی ہے۔ سیف نے سلطانہ کا ہاتھ پکڑنا چاہا لیکن سلطانہ نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

''آپ نے ابھی کیا کہا ہے؟'' سلطانہ نے دانت پر دانت جمائے ہوئے تھے اور انداز کافی جارحانہ تھا۔ چہرے پر پریشانی، دُکھ اور اذیت کے آثار بھی کچھ کچھ واضح تھے۔

''کیا کہا ہے آپ نے؟'' اب کی بار سلطانہ نے قدرے اونچی آواز میں پوچھا تھا۔

''ہاں! میرا بیٹا پیدا ہوا ہے۔'' سیف نے کچھ دھیمے لہجے میں کہا تھا۔

نہ زمین ہلی تھی، نہ آسمان ٹوٹا تھا، زلزلے کے آثار بھی کہیں نہیں تھے۔ ہر چیز اپنے مقام پر اسی طرح ساکت و جامد تھی۔

ایک آنسو آنکھ سے بڑی تیزی سے نکلا تھا اور اسی شدت سے بہتا ہوا آیا اور ٹھوڑی پر اٹک گیا، لیکن چند لمحوں میں وہ آنسو گر گیا اور اس جامنی چادر پر موجود ایک سفید پھول میں جذب ہو گیا۔

جو آنسو چادر میں جذب ہوا تھا وہ اپنا نصف حصہ بہنے کی وجہ سے سلطانہ کے چہرے پر چھوڑ چکا تھا، جسے سلطانہ نے پونچھ لیا تھا، وہ کم از کم سیف کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھی۔

''میں دوسری شادی کر چکا ہوں۔'' سیف نے دانستہ 'چکا تھا' کی بجائے چکا ہوں استعمال کیا تھا، لیکن سلطانہ کو اس بات میں کوئی دلچسپی نہیں تھی، اس لیے اس نے کسی ردِّعمل کا اظہار نہ کیا، بلکہ چپ چاپ بیٹھی رہی تھی۔

سلطانہ نے ایک نظر سیف کو دیکھا ...... شکوہ بھری نگاہوں سے اور پھر سر جھکا لیا تھا۔

اس وقت سیف کو شدید شرمندگی محسوس ہوئی تھی۔

''دوسری شادی کا حق تو مجھے اسلام نے دیا ہے۔'' سلطانہ کو ایک اور جھٹکا لگا، کیا سیف ایسا بھی کہیں گے، دُکھ کی شدت سلطانہ کی برداشت سے باہر ہوگئی تھی، لیکن وہ برداشت کر رہی تھی۔ بنا روئے ......

سلطانہ کوئی شکوہ نہیں کرنا چاہتی تھی، کیوں کہ اب شکوہ فضول تھا۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا تھا۔ اب کیا ہوسکتا تھا؟ لیکن پھر بھی وہ شکوہ کر بیٹھی۔

''اور کیا آپ پر میرا کوئی حق نہیں؟'' سلطانہ نے کرب سے پوچھا تھا۔

''مجھے معاف کردو۔'' سیف نے ہاتھ جوڑ دیے۔

سلطانہ کا شوہر اس سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ رہا تھا۔

سیف کا ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنا سلطانہ کے لیے نا صرف حیران کن، بلکہ تکلیف دہ بھی تھا۔

''میں نے معاف کیا۔'' سلطانہ نے سیف کے ہاتھ نیچے کیے اور اٹھ کر کمرے میں آ گئی۔

سیف نے اسے پیچھے سے آواز نہیں دی۔

کنڈی لگانے تک اس کی آنکھوں میں آنسو آ چکے تھے۔ کمرے میں چار پائیاں بھی پڑی تھیں اور ایک کرسی بھی، لیکن سلطانہ گرنے کے سے انداز میں کرسی پر بیٹھی تھی۔ اب اس نے رونا شروع کر دیا اور وہ کافی دیر تک روتی رہی۔ بلک بلک کر...... سسک سسک کر......

کسی نے باہر سے دروازے کا ہینڈل ایک بار گھمایا تھا، لیکن اندر سے لاک پا کر دروازہ نہیں کھٹکھٹایا تھا۔

اور سلطانہ اندر روتی رہی...... کافی دیر......

وہ تھی اور تنہائی...... اس نے خدا سے بھی کوئی شکوہ نہیں کیا تھا۔

☆......☆......☆

''اے بہو! تین تو تم بندے ہو، کیا تم لوگوں کو یہ تین کمرے پورے نہیں ہوتے، جو چوتھا کمرہ بنوا رہے ہو۔ بج (گرہن) لگا رہے ہو آنگن کو نرا بج'' آنٹی عشرت آئی ہوئی تھیں۔ مہمان خانے کے ساتھ ایک نیا کمرہ بنوایا جا رہا تھا اور وہ اسی کے بارے میں استفسار کر رہی تھیں۔

کتنے دن ہوگئے تھے اسے معلوم ہوئے کہ پچھلے سات سالوں سے اس کی ایک عدد سوتن بھی موجود ہے اور اس کے دو عدد بچے بھی۔ سات سال یہ بات سیف نے اس سے راز رکھی تھی اور اس نے تو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ ایسا بھی ہوگا اور وہ جو ہفتے پندرہ دن بعد گھر سے باہر رات گزارتے تھے، تو وہ کسی دوست کے پاس نہیں گزارتے تھے، بلکہ اپنی دوسری بیوی کے پاس گزارتے تھے۔ ہائے اب ایک سوتن بھی اس گھر میں ......

درد کی ایک ٹیس سلطانہ کے سینے میں اٹھی تھی۔

زندگی نے یہ موڑ بھی دکھانا تھا۔

''اے بہو! کہاں کھوئی ہو؟'' آنٹی عشرت نے پھر پوچھا تھا۔

''جج ...... جی...... کیا کہا آپ نے......؟'' سلطانہ نے آنٹی عشرت کی بات سنی ہی نہیں تھی۔

''لو جی! کر لو بات...... تمہیں پتا بھی نہیں کہ میں نے کیا پوچھا ہے؟ میں نے پوچھا ہے......'' آنٹی عشرت نے اپنی بات وہیں پر روک دی اور سلطانہ کا ایک جائزہ لیا ''بہو یہ کیا حال بنایا ہوا ہے تم نے، ایسا لگ رہا ہے کتنے دنوں سے کنگھی بھی نہیں کی۔ میں نے تو پہلے دھیان ہی نہیں دیا، تم تو پوری جوگن لگ رہی ہو جوگن۔ کیا ہوا ہے کچھ بتاؤ گی بھی سہی یا بس یوں ہی؟ دوسرا نیا کمرہ بنایا جا رہا ہے۔ مجھے تو کچھ سمجھ ہی نہیں آ رہا۔ اب تم ہی کچھ بتاؤ گی تو پتا چلے گا۔''

آنٹی عشرت اپنی عادت کے مطابق بولتی چلی گئیں۔ سلطانہ بیٹھی ان کا منہ تک رہی تھی۔ اسے سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ آنٹی عشرت کو کس طرح بتائے کہ اس کی سوتن یہاں آ رہی ہے۔

''اے بہو اب تمہیں کیا مجھ سے بے زاری محسوس ہو رہی ہے کہ کسی بات کا جواب ہی نہیں دے رہی۔'' آنٹی عشرت کے دل میں جو کچھ آیا اسے لفظوں کی صورت دے دی۔

''سیف نے دوسری شادی کر لی ہے۔'' سلطانہ نے ایک ہی جملے میں انہیں سب باتوں کا جواب دے دیا۔

''کیا...... سیف نے دوسری شادی کر لی...... کب؟؟'' آنٹی عشرت کو حیرت کا جھٹکا لگا۔ یہ بات تو خلافِ توقع تھی۔ انہیں ایسی کوئی اُمید نہ تھی۔

آنٹی عشرت کے ''کب'' کا جواب دینا کافی مشکل تھا۔ اس ''کب'' کو سوچتے ہوئے سلطانہ کی آنکھوں میں نمکین پانی آ گیا۔ آنٹی عشرت نے بھی سلطانہ کے آنسو دیکھ لیے تھے۔

''اے بہو اب روؤ مت...... حوصلہ کرو...... پہلے مجھے پوری بات تو بتا دو۔'' آنٹی عشرت نے ہاتھ بڑھا کر اس کے آنسو پونچھ لیے۔

ہفتے بھر پہلے سیف نے اسے بتایا تھا اور اب تک کوئی غم گسار نہیں ملا تھا۔ سیف تو بس نظریں چرا رہے تھے۔ ویسے بھی جب تک کوئی غم گسار نہ ملے تو غم کم نہیں ہوتا۔ سلطانہ کو معلوم تھا کہ آنٹی عشرت ہی اس سے مخلص ہیں، سوا سے اندازہ تھا کہ وہ اس کا دُکھ سمجھ لیں گی۔

سلطانہ کتنی دیر یوں ہی روتی رہی اور آنٹی عشرت اس کا ہاتھ پکڑ کر سہلاتی اور اسے دلاسا دیتی رہی تھیں، پھر آنٹی عشرت اٹھ کر پانی لے آئیں۔

''لو بہو! پانی پی لو۔'' سلطانہ نے چپ چاپ پانی پی لیا۔ تھوڑی دیر یوں ہی چپ بیٹھے گزر گئی، پھر آنٹی عشرت نے پوچھا۔

''بہو اب مجھے پوری بات بتاؤ کہ یہ کب اور کس طرح ہوا؟''

سلطانہ نے انہیں بتایا کہ سات سال پہلے سیف نے شادی کی تھی اور وہ جو رات گھر سے باہر گزارتے تھے، وہ کسی دوست کے ہاں نہیں، بلکہ وہیں پر گزارتے تھے، اس کے علاوہ وہاں سے بھی ان کا ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہے۔''

آنٹی عشرت کو کافی حیرانی ہو رہی تھی یہ سن کر......

''تم نے اپنے میکے میں بتایا ہے سب کچھ'' آنٹی عشرت نے کچھ پُرسوچ انداز میں پوچھا تھا۔

سلطانہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''تو پھر بتا دو۔''

''بتانے سے کیا ہوگا آنٹی...... ابو غصے کے کچھ تیز ہیں۔ وہ آ کر سیف سے جھگڑا کریں گے اور مجھے لے جائیں گے۔ مہینے پندرہ دن بعد میں واپس یہیں ہوں گی، کیا فرق پڑتا ہے اس سے......''

ٹھیک ہے نا تم گھر میں نہیں ہوگی تو تمہاری اہمیت پتا چل جائے گی انہیں۔ بچیوں کے نا ہونے سے ان کی یاد بھی ستائے گی۔''

''اہمیت اور یاد......'' سلطانہ کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ آ کر ٹھہر گئی۔ ''ہم نہیں ہوں گے تو دوسری کی اہمیت کا اندازہ بھی ہو جائے گا اور بچیوں کا کیا ہے دو اور بچے موجود ہیں نا۔'' سلطانہ کی بات سن کر آنٹی عشرت چپ ہو گئیں۔ سلطانہ واقعی صحیح کہہ رہی تھی۔

کافی دیر دونوں چپ بیٹھی رہیں۔ آنٹی عشرت کو سمجھ نہ آ رہی تھی کہ کیا بات کریں اور کس طرح سلطانہ کو دلاسا دیں، جبکہ سلطانہ کا ذہن کسی بھنور میں پھنسا ہوا تھا۔ وہ کوئی بات نہیں سوچ رہی تھی، لیکن اس کے ذہن میں کئی سوچیں تھیں۔

کتنے ہی لمحے ایسے ہی گزر گئے، پھر آنٹی عشرت ہی بولیں۔

''ایک بات کہوں بہو!......'' آنٹی عشرت نے سلطانہ کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''جی!'' سلطانہ نے یک لفظی جواب دیا۔

''ناراض مت ہونا بس میرے دل میں جو بات آئی ہے وہی کہہ رہی ہوں۔ کیا ان کا پہلا بچہ، شادی کے بعد کا ہوگا یا پھر......'' آنٹی عشرت نے تاثرات اور مختصر لفظوں میں مطلب واضح کیا تھا۔ یہ سن کر سلطانہ آنٹی عشرت کا منہ دیکھے گئی تھی...... بس۔

''وہ اصل میں...... تم یہ دیکھو نا کہ تم بتا رہی ہو کہ شادی سات سال پہلے ہوئی...... اور پھر اتنے سال مخفی رکھنے کی کیا تک ہے۔''

''نہیں سیف اتنے بُرے نہیں کہ......'' سلطانہ نے آنٹی عشرت کو ایک طرف جھٹلایا اور دوسری طرف اپنے آپ کو یہ بات سوچنے سے باز رکھا تھا۔

''تو پھر اسے دوسری شادی کرنے کی ایسی کیا ضرورت پیش آ گئی۔'' سلطانہ کے پاس اس بات کا جواب نہیں تھا۔

''محبت کرتی ہو، سیف سے......'' آنٹی عشرت نے سلطانہ کو جانچتی نظروں سے دیکھا تھا۔

سلطانہ کچھ گڑبڑا گئی۔ اس بارے میں تو اس نے کبھی اپنے آپ کو ٹٹولا ہی نہیں تھا۔

آنٹی عشرت نے جواب کا انتظار نہیں کیا تھا، شاید وہ جواب جان چکی تھیں۔

''اچھا اب میں چلتی ہوں...... پھر آؤں گی اور تم بھی اپنا حلیہ درست کرو، جو ہونا تھا، سو ہو چکا...... اس طرح سوگ منانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ گھنٹے دو گھنٹے تک پھر چکر لگاؤں گی تو بالکل فریش ملنا...... بہو کہتی ہوں تمہیں۔ اگر میری بات نہ مانی تو پھر پوری ساس کی طرح ہی پیش آؤں گی۔'' آنٹی عشرت نے سلطانہ کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور چل دیں۔

''کیا مجھے سیف سے محبت......'' سلطانہ کو سوچنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔

آنکھوں میں ایک بار پھر نمکین پانی آ گیا تھا، جسے سلطانہ نے خود ہی پونچھ ڈالا اور کچن کی طرف چل دی، تاکہ دوپہر کے کھانے کا انتظام کر سکے۔

☆......☆......☆

آج سلطانہ کے والدین آئے ہوئے تھے اور وہ سلطانہ کو ساتھ لے جانا چاہتے تھے، لیکن اس نے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا۔

''ابو کیا کروں گی میں جا کر؟ یہ میرا اپنا گھر ہے۔ جو ہو گیا، سو ہو گیا۔ اب ہم کیا کر سکتے ہیں......؟''

''میں اپنی بیٹی کے ساتھ یہ زیادتی برداشت نہیں کر سکتا۔ غریب ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر چھوٹی بڑی زیادتی برداشت کریں، ویسے بھی سات سال کم عرصہ نہیں ہوتا، اس بدبخت نے ہمیں دھوکے میں رکھا ہے اور خود عیش کرتا رہا ہے۔ میرے بس میں ہو تو...... اب بس، سیف کو اس نامراد کو طلاق دینی ہی

ہوگی جس نے میری بیٹی کے حق پر ڈاکہ ڈالا ہے۔''
ابو غصے سے کانپ رہے تھے۔
امی سب کچھ سپاٹ تاثرات سے دیکھ رہی تھیں۔ ابو جتنے سخت دل اور گرم طبیعت کے تھے، امی اتنی ہی ہمدرد، نرم دل اور دوسروں کے دُکھ کو اپنا دُکھ سمجھنے والی تھیں۔ سیف بھی چپ چاپ بیٹھا ہوا تھا۔ شاید اسے اس سب کی اُمید تھی۔

''ابو بس رہنے دیں...... میں مطمئن ہوں سیف سے بھی اور حالات سے بھی۔'' سلطانہ نے ہمت کر کے کہا تھا۔ اس بات کی بھی سیف کو اُمید تھی کہ سلطانہ اس کی وکالت ضرور کرے گی۔

''تمہیں معلوم نہیں سلطانہ، بے وقوفی مت کرو۔ کھا جائے گی تمہیں وہ ڈائن...... تم ہمارے ساتھ چلو۔ اب ایک منٹ بھی اس گھر میں نہیں ٹھہرنا۔'' ابو کھڑے ہوگئے اور وہ حقیقتاً سلطانہ کو لے جانا چاہتے تھے۔

''ابو وہ ایسی نہیں ہے، بلکہ وہ سلطانہ کا بھی خیال رکھے گی۔'' سیف نے دھیمے لہجے میں کہا تھا۔ سیف سلطانہ کے سامنے اس کی سوتن کی خوبیاں بیان کررہے تھے۔ سلطانہ کو کچھ چبھن سی محسوس ہوئی تھی۔

''ہاں! اب تو میرے سامنے میری بیٹی کی سوتن کی تعریف کرے گا ناہنجار۔'' ایک تو، تو نے گل کھلا لیے اور اوپر سے ڈھٹائی کا مظاہرہ کررہا ہے۔ بہت خوبیاں ہوں گی نا اس ڈائن میں، اسی لیے تو نے شادی رچالی اور کسی کو خبر بھی نہ ہونے دی۔ ہاں اب تو میری بیٹی میں خامیاں بھی نظر آتی ہوں گی۔ اسے کب طلاق دے گا......'' سلطانہ کو اپنا دل بند ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ کسی صورت بھی سیف سے علیحدہ نہیں ہونا چاہتی تھی، چاہے وہ دو اور بیویاں بھی لے آئے۔

''بس کریں آپ بھی...... کیا اول فول بولے جارہے ہیں۔ جانے دیں اب...... ایسے ہی بیٹی کی زندگی کو مشکل بنارہے ہیں......'' امی نے ابو کو مزید بولنے سے باز رکھا تھا۔

''اچھا ہم چلتے ہیں۔'' امی بادل نخواستہ کھڑی ہوگئیں۔

''بیٹا، بس اب ہماری بیٹی کا خیال رکھنا۔ اسے مزید کسی قسم کا دُکھ مت دینا اور اس کی کبھی قسم کی حق تلفی مت کرنا۔'' امی نے جلدی جلدی کہا تھا۔ ان کا لہجہ منت بھرا تھا۔ سیف خود ہی اپنی جگہ شرمندہ ہوگیا تھا۔ امی نے چادر اوڑھی اور سلطانہ کو گلے سے لگایا۔

''میں تو ہر بات بے باق کر کے ہی جاؤں گا۔''
ابو کا جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

''بیٹھیں آپ کھانا کھا کر جائیے گا۔'' سیف نے جانے کس سوچ کے تحت کہا تھا۔

''کھانا......'' ابو نے چبا کر کہا ''کھانا جائے بھاڑ میں......'' ابو کی آواز کافی تیز تھی، وہ بہت اونچا بول رہے تھے۔

''چلیں نا آپ......'' امی کے لہجے میں کافی التجا تھی۔

امی اور ابو دونوں ں کھڑے ہوئے تھے، جبکہ سطانہ چارپائی پر بیٹھی ہوئی تھی اور سیف پاس ہی ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ ابو کچھ اور کہنے والے تھے کہ امی نے ایک بار پھر کہا۔

''دیکھیں چلتے ہیں......'' امی کے لہجے میں اب پہلے سے زیادہ التجا تھی۔ ابو نے کینہ توز نظروں سے امی کو دیکھا تھا۔

اتنے میں سیف کھڑا ہوگیا۔ اس نے سر جھکایا ہوا تھا۔ امی اور ابو نے اسے اٹھتے ہوئے دیکھا تو اس کی طرف متوجہ ہوگئے۔

چند سیکنڈ یوں ہی گزر گئے۔ ابو کچھ کہنے ہی والے تھے کہ......

سیف نے ہاتھ جوڑ دیے۔

''مجھے معاف کر دیں۔'' اس کا سر جھکا ہوا تھا اور وہ ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ رہا تھا۔ سیف کے ساس سسر نے حیرت سے اسے اور اس کے جڑے ہوئے ہاتھوں کو دیکھا اور پھر ساتھ چارپائی پر بیٹھی بیٹی کو، جس نے بھی سر جھکایا ہوا تھا۔

امی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور ابو نے......

اور ابو نے بھی کچھ شکستگی سے سیف کے جڑے ہوئے ہاتھ تھام لیے تھے۔

☆......☆......☆

''کل کیا پکاؤں؟'' سلطانہ نے سیف سے پوچھا تھا۔

سلطانہ اس وقت فریز رکھول کر کھڑی ہوئی تھی۔ فریزر میں قیمہ اور چکن پڑا تھا۔

دراصل کل شاہین نے آنا تھا اسی لیے سلطانہ پوچھ رہی تھی کہ کیا پکائے۔ مہمان خانے کے ساتھ ایک کمرہ مکمل تعمیر ہو چکا تھا۔

سلطانہ کے تاثرات سپاٹ تھے۔ کچھ بھی ان سے اخذ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

''جو کچھ دل چاہے پکا لینا۔'' سیف نے کچھ اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

سلطانہ نے سیف کی اکتاہٹ محسوس کی تھی، لیکن کچھ نتیجہ نہیں اخذ کیا تھا۔ آخر یہ اکتاہٹ کس چیز کی تھی......؟؟

رات کافی بیت چکی تھی، دونوں بچیاں سو چکی تھیں، سلطانہ اور سیف اس وقت ہال کمرے میں تھے، جبکہ بچیاں ساتھ والے کمرے میں سوئی ہوئی تھیں۔ سلطانہ اس وقت فریج کے پاس کھڑی تھی، جبکہ سیف کچھ فاصلے پر افقی بچھی ہوئی چارپائیوں میں سے ایک پر بیٹھا ہوا تھا۔

''سلطانہ! میں نے تم سے کچھ بات کرنی ہے؟؟ سیف کافی تذبذب کا شکار تھا۔

سلطانہ نے جذبات سے عاری نظروں سے سیف کو دیکھا تھا۔

''شاید اب انہوں نے مل جل کر رہنے، باہمی تعاون سے رہنے، جھگڑا نہ کرنے اور اس جیسی دو چار اور نصیحتیں کرنی ہیں۔'' سلطانہ نے سوچا تھا۔ وہ چپ چاپ چلتی ہوئی آئی اور اسی چارپائی پر سیف سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گئی۔

خاموشی......

کتنا ہی وقت اسی خاموشی کی نذر ہو گیا۔ سلطانہ چپ چاپ بیٹھی سیف کے بولنے کا انتظار کرتی رہی۔

سیف نے ہونٹ آپس میں پیوست کیے ہوئے تھے۔

''سلطانہ'' کتنی دیر بعد سیف کے منہ سے بس اتنا ہی ادا ہوا تھا۔

سیف نے سلطانہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ سلطانہ کا دل چاہا سیف کا ہاتھ جھٹک دے، لیکن وہ چاہتے ہوئے بھی ایسا نہیں کر سکی۔ سلطانہ کی کلائی میں چار سونے کی چوڑیاں تھیں۔ یہ چوڑیاں اسے سیف نے حق مہر میں دی تھیں۔ اسے یہ چوڑیاں بہت عزیز تھیں۔ وہ یہ چوڑیاں ہر وقت پہنے رکھتی۔ سلطانہ کو یہ چوڑیاں سیف کی موجودگی کا احساس دلاتی تھیں۔

سیف نے سلطانہ کی چوڑیوں کو گھمایا تھا۔

خاموشی میں ایک کھنکھناہٹ پیدا ہوئی تھی۔

سلطانہ کو یہ کھنکھناہٹ کافی ناگوار محسوس ہوئی تھی۔ اس نے سیف کو بھرپور نگاہوں سے دیکھا تھا۔ سیف اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ دونوں کی نظروں کا تصادم ہوا تھا۔

''میں مجبور تھا۔'' سیف نے بدقت تمام یہ فقرہ ادا کیا تھا۔

''ہاں ہوگی کوئی معاشی، معاشرتی، اقتصادی مجبوری۔'' سلطانہ نے ناپسندیدگی سے سوچا اور پھر سے سیف کو دیکھنے لگی۔

سیف کے ہونٹ کپکپا رہے تھے، وہ بھی سلطانہ کو دیکھ رہا تھا۔

سیف نے آنکھیں بند کر دیں۔ بند آنکھوں سے ایک آنسو نکلا تھا۔ سیف نے سر جھکا لیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ سلطانہ اس کے آنسو دیکھے، لیکن سلطانہ اس کے آنسو دیکھ چکی تھی، پھر اس کی آنکھ سے ایک اور آنسو نکلا تھا۔

سلطانہ ششدر رہ گئی تھی۔ سیف کو مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔

ہائے یہ دل بھی انسان کو کس کس طرح مجبور کرتا ہے۔

''سنیں'' سلطانہ نے سیف کو اتنا کہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے سیف کے ہاتھ کو دبا دیا تھا۔ ہاتھ دبانے پر سیف نے جھکا ہوا سر اٹھایا تھا۔ سلطانہ کی آنکھوں میں بھی نمی تھی۔ کچھ کہنے سننے کی اب ضرورت نہ رہی تھی۔

سیف نے اپنا سر سلطانہ کی گود میں رکھ دیا اور رونا شروع کر دیا تھا۔ سلطانہ کی آنکھوں میں سے بھی آنسو نکلنے لگے تھے۔ سلطانہ اس کے بال سہلانے لگی تھی۔

''مجھے اس سے بہت محبت تھی۔'' سیف نے روتے ہوئے بس اتنا کہا تھا۔

'میں بھی آپ سے بہت محبت کرتی ہوں۔' سلطانہ نے روتے ہوئے بس اتنا سوچا تھا۔

☆......☆......☆

شادی سے پہلے سیف کسی سے محبت کرتا تھا۔ یہ بات سلطانہ کو معلوم تھی، بلکہ شادی سے پہلے بھی معلوم تھی۔

اب سلطانہ کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی کہ شاہین ہی اس کی گمشدہ محبت تھی۔ اسے تو سیف کے آنسو سے ہی سب کچھ پتا چل گیا تھا۔

محبوب کی آنکھوں میں آنسو، محبوب کی محبوبہ کے لیے......

''عورت سمجھوتا کر سکتی ہے اور سلطانہ نے بھی سمجھوتا کر لیا تھا۔

سیف مرد تھا، اس لیے اس نے سمجھوتا نہیں کیا تھا۔ یہ سلطانہ کی سوچ تھی۔ اسی لیے اس نے شاہین سے دوسری شادی کر لی تھی۔ سیف نے خود غرضی دکھائی تھی، لیکن وہ بھی کیا کرتا۔

وہ دل کے ہاتھوں بہت مجبور تھا۔ بچپن سے اس نے شاہین کے ہی خواب دیکھے تھے، لیکن شاہین کے باپ نے اس کی امیر گھرانے میں شادی کر دی تھی اور وہاں سے وہ مطلقہ آئی تھی۔

شاہین کی شادی کے وقت اور شادی کے بعد سیف کی جو حالت تھی، اگر سیف کے والدین زندہ ہوتے تو ضرور گواہی دیتے، لیکن خدا نے اسے صبر دے دیا تھا اور اس کی سلطانہ سے شادی ہوگئی۔

شادی کے بعد اس نے سلطانہ کو شاہین کی جگہ دینے کی کوشش کی تھی، لیکن دل اس کے ابو میں نہ آیا تھا، پھر بھی سلطانہ نے اس کے دل میں مقام ضرور بنایا تھا اور پھر اوپر تلے ہونے والی بیٹیاں۔ سلطانہ ہمہ وقت ان میں ہی مصروف رہتی تھی اور اسے سیف سے بھی شدید محبت تھی، لیکن اس نے سیف پر کبھی شک نہیں کیا تھا۔

سیف کو شادی کے بعد شاہین بہت یاد آتی تھی، لیکن وہ کیا کر سکتا تھا۔ وہ خدا کے قریب سے قریب تر ہوتا گیا۔

سلطانہ نے کبھی سیف کا دل ہی نہ ٹٹولا تھا، بلکہ اس نے کبھی اپنا دل بھی نہیں ٹٹولا تھا۔ بڑی سیدھی

سادی تھی سلطانہ، اسی لیے تو سات سال میں کبھی اسے وہم نہ ہوا تھا کہ......

لیکن خیر......!!

سلطانہ کو یہ بات سمجھ نہ آئی تھی کہ سیف نے اتنے سال یہ بات اس سے چھپائی کیوں تھی اور وہ اتنے عرصے بعد وہاں رہنے کیوں جاتا تھا۔ ہفتے پندرہ دن بعد کیوں؟ اور وہ بھی صرف ایک رات کے لیے۔ دن میں شاید وہاں جاتا ہو، جبکہ سلطانہ کے پاس پورا مہینہ رہتا تھا۔

آخر سیف کو ایسی کیا بات مانع تھی کہ اس نے یہ بات سب سے چھپا کر رکھی تھی اور وہ بھی سات سال تک......؟؟

☆......☆......☆

صبح کے نو بج رہے تھے۔ سیف شاہین کو لینے کے لیے گیا ہوا تھا۔

سلطانہ تقریباً تمام کام ختم کر چکی تھی۔ چھٹی کا دن تھا، اس لیے بچیاں بھی گھر پر تھیں۔ انہیں بھی اس بات کا پتا تھا کہ ان کا باپ دوسری شادی کر کے آرہا ہے۔

''مینا نے تو باپ سے باز پرس کے انداز میں پوچھا بھی تھا کہ آپ نے دوسری شادی کیوں کی۔''

سیف گنگ بیٹھا ہوا تھا۔ کیا جواب دے بیٹی کو......؟

اس کی مشکل سلطانہ نے آسان کر دی۔

''مینا......'' سلطانہ نے مینا کو گھورتے ہوئے اسے تنبیہ کی تھی۔

''اپنا کام کرو، یہ بڑوں کی باتیں ہیں۔'' مینا منہ بسورتے ہوئے وہاں سے چلی گئی تھی۔

دروازہ کھلنے کی آواز آئی تھی۔ وہ لوگ آگئے تھے۔

سلطانہ کو سمجھ نہ آیا کہ وہ کس طرح ان کا استقبال کرے۔ ابھی وہ کچن میں تھی۔ اس نے برتنوں کو بلاوجہ ایک جگہ سے دوسری جگہ رکھنا شروع کر دیا تھا۔ قدموں کی چاپ سنائی دی تھی۔ وہ لوگ شاید برآمدے میں آچکے تھے۔

''آخر میں کیوں چھپ رہی ہوں؟'' سلطانہ نے خود سے سوال کیا تھا۔ چنانچہ وہ کچن سے باہر نکل آئی۔

وہ لوگ برآمدے میں ایک چارپائی پر بیٹھے ہوئے تھے۔

ایک قدم......دوسرا قدم......تیسرا قدم اس نے لڑکھڑا کر رکھا تھا۔

سلطانہ کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

وہ وہیں پر ساکت ہوگئی۔

''یہ کیا......؟''

سلطانہ کو اپنا دل بند ہوتا محسوس ہوا۔

''کیا یہ بھی ہوسکتا ہے؟''

ان کے ساتھ آنے والی لڑکی زیادہ سے زیادہ چھ سال کی ہونی چاہیے تھی، جبکہ آنے والی لڑکی لگ بھگ مینا کی عمر کی تھی۔

تو کیا؟

سلطانہ کو اپنا دماغ بھی ماؤف ہوتا محسوس ہوا تھا۔

سیف نے کچھ حیرت سے سلطانہ کو دیکھا تھا جو کچن سے نکلنے کے بعد ٹھٹک گئی تھی۔

سیف نے سلطانہ کی نظروں کا تعاقب کیا تھا۔

وہ متحیر نظروں سے نینا کو دیکھ رہی تھی۔

دس گیارہ سالہ نینا......

''اوہ'' سیف کو ایک لمحے میں ساری بات سمجھ میں آگئی تھی۔

شاہین آنے کے بعد سر جھکائے بیٹھی تھی، اسی لیے اسے کسی بات کا اندازہ نہیں تھا۔

سیف اُٹھ کر سلطانہ کے پاس گیا۔ جو ایک شاک کی کیفیت میں کھڑی تھی۔

''سلطانہ! وہ شاہین ہے اور وہ شاہین کی بیٹی نینا اور شاہین کی گود میں موجود بچہ ہمارا بیٹا ہے سار بان......'' سیف نے جلد از جلد تعارف مکمل کیا، تاکہ سلطانہ مزید کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو۔

''شاہین کی بیٹی اور ہمارا بیٹا'' سلطانہ کو الفاظ کو معنیٰ پہنانے میں تھوڑا وقت لگا تھا اور پھر سلطانہ نے ایک گہری سانس خارج کی تھی۔

''شکر ہے یہ ایک غلط فہمی تھی ورنہ......'' سلطانہ ورنہ کے آگے سوچ نہیں سکی تھی، کیونکہ وہ شاہین کے پاس آ گئی تھی۔ سلطانہ کو سمجھ نہ آیا کہ وہ شاہین سے کس طرح سے ملے۔

''السلام وعلیکم۔'' بالآخر سلطانہ نے سلام کیا تھا۔

''وعلیکم السلام۔'' اگلی مشکل شاہین نے حل کردی تھی۔ اس نے سلام کا جواب دیتے ہوئے مصافحہ کے لیے ہاتھ بھی آگے بڑھایا تھا اور سلطانہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

شاہین کے گورے ہاتھ میں سلطانہ کا سانولا ہاتھ مزید سانولا محسوس ہوا تھا۔ سلطانہ نے اس کا ہاتھ دبا کر چھوڑ دیا اور پاس پڑے تخت پر بیٹھ گئی۔

شاہین خوبصورت ہوگی، اس بات کا سلطانہ کو یقین تھا اور اس کا یقین درست ثابت ہوا تھا۔

''کیسی ہیں آپ؟'' سلطانہ نے بدقت تمام پوچھا تھا۔ نظریں بے اختیار شاہین کی گود میں موجود بچے پر پڑی تھیں، جو سو رہا تھا۔

''جی ٹھیک ہوں۔'' شاہین نے دھیمی آواز میں جواب دیا تھا۔ وہ ہچکچاتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

''یہ سیف کا بیٹا ہے۔ کیا اس پر میرا بھی کوئی حق ہوگا؟'' شاہین کے جواب دینے تک سلطانہ اتنا سوچ چکی تھی۔

''اور آپ کیسی ہیں؟'' شاہین نے پوچھا تھا۔ اس کا لہجہ ہنوز دھیما تھا۔

''اللہ کا شکر ہے۔'' یہ کہنے تک سلطانہ نے اس بچے کے گرد لپٹی ہوئی کلائیوں کا جائزہ بھی لے لیا تھا۔ دائیں کلائی خالی تھی، جبکہ بائیں کلائی میں دو تین کانچ کی چوڑیاں تھیں۔

''اسے سیف نے حق مہر میں کیا دیا ہوگا؟'' سلطانہ کی اگلی سوچ یہی تھی۔

سیف چند لمحے کھڑا دونوں کو باری باری دیکھتا رہا اور پھر سلطانہ کے ساتھ آ کر بیٹھ گیا۔

چند لمحے بعد پھر خاموشی چھا گئی۔

سلطانہ کچھ سوچ رہی تھی اور چند لمحوں میں ہی سلطانہ نے اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنا لیا تھا۔

سلطانہ نے اپنی کلائیوں میں موجود چار چوڑیوں میں سے دو چوڑیاں اُتاریں، ایک نظر انہیں دیکھا اور پھر انہیں شاہین کی طرف بڑھا دیا۔

''یہ لو......'' شاہین نے حیرت سے سلطانہ کو دیکھا تھا۔ اس قدر......؟ شاہین کو اتنی امید نہیں تھی۔

حیران تو سیف بھی تھا، بلکہ وہ تو شاہین سے بھی زیادہ حیران تھا۔

''نہیں، اس کی ضرورت نہیں......'' شاہین نے کچھ لڑکھڑاتے ہوئے کہا تھا۔

''لے لو، دل سے دے رہی ہوں، بلکہ میری طرف سے منہ دکھائی۔'' سلطانہ نے اصرار کیا تھا۔

شاہین نے سیف کی طرف دیکھا تھا، لیکن سیف نے زبان سے کوئی الفاظ ادا کیے اور نہ ہی کوئی اشارہ کیا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ شاہین کو اپنا فیصلہ خود کرنا ہے۔

(زندگی کی اونچی نیچی کٹھنائیوں پر سفر کرتے اِس خوبصورت ناولٹ کی دوسری قسط ماہِ نومبر میں ملاحظہ فرمائیں)

افسانہ

اِک ترے جانے کے بعد...

''ارے نبیلہ بہن! آخر یہ حادثہ ہوا کب؟ کچھ پتا بھی تو چلے۔ ہم تو جب سے آئے ہیں تم واہی تباہی بکے جا رہی ہو؟'' ''ارے برکت آپا تم اسے حادثہ کہہ رہی ہو۔ یہ تو حادثے کی توہین ہے۔ ارے اتنا بڑا سانحہ رونما ہوا ہے۔'' نبیلہ چمک کر بولی۔ ''اچھا اچھا تمہاری......

عیدِ قرباں کی مناسبت سے ایک خیال، افسانے کی صورت

پچھلی رات گرمی بہت تھی۔ لہٰذا نعیمہ بیگم صحن میں ہی چارپائی ڈال کر سو گئی تھیں۔ صبح جو آنکھ کھلی تو برابر والے گھر سے نبیلہ کے رونے دھونے کی آواز آ رہی تھی۔ فوراً اُٹھ کر بیٹھیں۔ جیسے تیسے منہ ہاتھ دھویا، صحن میں بندھے دونوں بکروں کے آگے ٹب بھر کے پانی رکھا کہ چارہ تو رات ہی سے اس کے آگے رکھا تھا۔ عید قربان بس تین دنوں کے فاصلے پر ہی تو تھی۔ جب ہی تو ہر گھر سے جانوروں کی آوازیں آ رہی تھیں مگر نعیمہ بیگم کی آنکھ تو برابر والی نبیلہ کے گھر سے آنے والی آہ وزاری کی آواز سے کھلی تھی۔ نجانے کیا سانحہ گزرا تھا۔ نعیمہ بیگم نے چپل پیر میں اُڑسی، فرمان کو آواز لگائی۔

''دروازہ بند کرو اور بکروں کا دھیان رکھو۔'' اُفتم پُشتم نبیلہ کے گھر کی طرف بھاگیں کہ معلوم کر سکیں کہ یہ آہ وزاری اور رونا دھونا کس وجہ سے ہے؟

☆......☆......☆

نبیلہ کے گھر میں داخل ہوئیں تو دیکھا کہ نبیلہ صحن میں پڑی کُرسی پر بیٹھی زار و قطار رو رہی ہے اور اس کے اردگرد پڑوسی اور گھر والے کھڑے تسلیاں دلاسے اور تشفی دے رہے ہیں۔

''ہائے اللہ جی! کہاں سے لاؤں اتنا حوصلہ۔ میرا تو یہ خبر سنتے ہی سر درد کے مارے پھٹا جا رہا ہے، دل ہے کہ بند ہونے کے قریب ہے۔ یا اللہ میں کہاں جاؤں؟ کس کو مدد کے لیے پکاروں؟'' نبیلہ تو دھائیوں پر دھائیاں دیے جا رہی تھی۔ کوئی تسلی، کوئی دلاسا، کوئی حوصلہ اس کے صدمے کو کم کرنے کا سبب نہیں بن رہا تھا۔ خالہ شبراتن نے نبیلہ کی بیٹی کو اشارہ کیا۔

''جاؤ بیٹا پانی لاؤ۔ میں تمہاری ماں کو پانی پلاؤں۔''

ندا آگے بڑھی اور باورچی خانے سے پانی لے کر آئی۔

''ارے گرم پانی لے آئیں؟ دیکھ نہیں رہی ہو ندا! ماں رو رو کر ہلکان ہوئی جا رہی ہے اور تم گرم پانی اُٹھا کر لے آئیں۔'' خالہ شبراتن نے گھورتی نگاہوں کے ساتھ ندا کو دیکھا تو ندا بے دلی سے دوبارہ اُٹھی اور فریج سے ٹھنڈا پانی نکال کر لائی۔

''ارے بھاگ کے جا، ندا! گلوکوز کا ڈبہ اٹھا کے

لا۔ ماں کی حالت غیر ہو رہی ہے رو رو کر اور بیٹی پر نکمے پن کے دورے پڑ رہے ہیں۔"

"ارے کہاں نکمے پن کی ہے میں نے خالہ۔ دو دفعہ تو پانی لا کر دیا ہے اور اب گلوکوز لانے جا رہی ہوں۔" چھوٹی خالہ نے جو یہ سنا تو پھرتی سے اٹھیں اور اندر کی طرف بڑھیں۔ (اب تک یہ نبیلہ کے سرہانے بیٹھیں اس کا سر دبا رہی تھیں) جا کر گلوکوز کا ڈبہ اٹھا کر لے آئیں اور دو بڑے چمچ گلوکوز ٹھنڈے پانی میں ڈال کر نبیلہ کو پلایا۔ اس نے دہائی دی۔

"سب بے کار ہے۔ سب فضول ہے کوئی کام نہیں آنے والا، اب میرا کیا ہوگا؟ میرے خدا کتنی دعائیں کی تھیں کہ اے رب! اس عید قرباں پر......"

"امی! اب آپ بس کر دیں بہت رونا دھونا ہو گیا۔ اب صبر کریں۔" ندا نے ماں کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اب اللہ کوئی اور وسیلہ بنائے گا۔"

"ارے، تم تو معصوم بچی ہو، تم کیا جانو! اللہ ایسی مصیبت کسی پر نہ ڈالے۔ عید قرباں بھی قریب ہے۔ اب کہاں کی عید اور کیسی عید؟ کیسے خوشی مناؤں؟ اللہ میں تو جیتے جی مر گئی اب کیا ہوگا میرا؟"

گھر میں جمع ہوئی تمام پڑوسنیں آپس میں چہ میگوئیاں کر رہی تھیں۔ استغفار کر رہی تھیں کہ اللہ ہر کسی کو ایسے حادثے سے بچائے۔ بے چاری نبیلہ کی صورت تو دیکھو کیسی پیلی ہو رہی ہے۔ اتنی نیک، ملنسار عورت اور اتنا بڑا غم رو رو کر ہلکان ہو گئی ہے۔"

اچانک سامنے والی آپا برکت نے نبیلہ سے پوچھا۔

"ارے نبیلہ بہن! آخر یہ حادثہ ہوا کب؟ کچھ پتا بھی تو چلے۔ ہم تو جب سے آئے ہیں تم واہی تباہی بکے جا رہی ہو؟"

"ارے برکت آپا تم اسے حادثہ کہہ رہی ہو۔ یہ تو حادثے کی توہین ہے۔ ارے اتنا بڑا سانحہ رونما ہوا ہے۔" نبیلہ چمک کر بولی۔

''اچھا اچھا تمہاری تسلی کے لیے سانحہ ہی بول دیتی ہوں مگر یہ سانحہ ہوا کب؟''

''میری تسلی!! ارے میری تسلی کی خوب کہی تم نے۔ ارے بہن! تم تو سامنے والے گھر میں رہتے ہوئے بھی ہفتوں، مہینوں خبر نہیں لیتی تھیں کہ کوئی جیتا بھی ہے کہ مر گیا۔''

''آئے ہائے نبیلہ کون مر گیا؟ ارے بتاؤ تو سہی۔''

''ارے مریں میرے دشمن، جلے میری جوتی۔'' وہ غیر ہوتی ہوئی حالت کے ساتھ بولی تو ارد گرد کھڑی کئی خواتین پہلو بدل کر رہ گئیں۔

''ارے ہوا کیا آخر کچھ پتا بھی تو چلے۔ کیا قربانی کا جانور مر گیا ہے؟ یا چوری ہو گیا ہے۔ صبح سے تمہارے گھر سے رونے پیٹنے کی آوازیں آ رہی ہیں۔ اور پھر تمہارے میاں جی بھی تو تمہیں تسلیاں دلاسے دے رہے ہیں اور ہمت بندھا رہے ہیں کہ میں ہوں ناں تمہارے ساتھ۔ ارے نبیلہ تمہارے میاں کہاں چلے گئے؟ نظر نہیں آ رہے ہیں۔'' سیدھے ہاتھ کی طرف رہنے والی پڑوسن نے استفسار کیا۔

''ارے نہیں بہن اُنہیں میرے درد کی کیا پروا اس سانحے سے ہونے والے تمام نقصان کا خمیازہ تو میں نے ہی بھگتنا ہے۔ سارے کا سارا نقصان کا خمیازہ تو میں نے ہی اُٹھانا ہے۔ سارے کا سارا نقصان تو میرے ہی حصے میں آنا ہے۔'' وہ بار بار ایک ہی بات دہرائے جا رہی تھی۔ واویلا تھا کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

''ارے تمہارے بہنوئی کو کس بات کی پروا ہو گی؟'' نبیلہ نے ٹشو پیپر سے آنکھیں رگڑتے ہوئے روہانسی ہوتے کہا۔ ''ارے تمہارے سُسرالی؟ نہیں نہیں! اتنا غم تو میکے والوں کے گزرنے پر ہوتا ہے یقیناً تمہارے میکے میں کسی کا انتقال ہوا ہو گا؟'' انہوں نے اندازہ لگایا۔

''کیا کہہ رہی ہو تم۔'' نبیلہ نے خونخوار نظروں سے اُسے گھورا۔ پڑوسن ہکلاتے ہوئے بولی۔

''مم...... میرا مطلب ہے تمہارے میکے والوں کی طرف ہی کا کوئی نقصان ہوا ہو گا ناں۔ مگر تم پھر گھر میں کیوں آہ و زاری کر رہی ہو، وہاں چلی جاؤ۔''

''لو بھلا اب کیا میرا میکہ ہی رہ گیا ہے، کسی کو گزرنے کے لیے، بھلا کوئی میرے میکے سے کیوں گزرے گا؟ میں کہاں جاؤں؟ میرے اللہ تکلیف بھی مجھے ہو رہی ہے اور میکے جانے کا مشورہ بھی مجھے دیا جا رہا ہے۔ اپنی طرح سمجھا ہوا ہے کیا مجھے۔ جو میں آئے دن میکے جا کر بیٹھ جاؤں۔ اپنا گھر بار چھوڑ کر۔'' اب دو تین خواتین نبیلہ کو خونخوار نگاہوں سے گھور رہی تھیں۔ لیکن نبیلہ کو کسی کی پروا نہیں تھی۔

''ہائے میرے اللہ یہ کس امتحان، کس آزمائش میں ڈال دیا تُو نے مجھے۔'' وہ پھر گھٹنوں میں سر دے کر رونے لگی اور ارد گرد موجود خواتین چہ میگوئیوں میں مصروف ہو گئیں۔

''ارے ندا ذرا دو چار پیالی چائے کی تو بنوالا ملازم سے کہہ کر۔ دیکھ تو تیری ماں کیسی نڈھال ہو رہی ہے۔ غم کے مارے کلیجہ منہ کو آ رہا ہے۔'' اس کو دیکھ کر کسی نے کہا دراصل نبیلہ کی آڑ لے کر اپنے لیے چائے بنوانے کے لیے کہا جا رہا تھا۔

''امی نے صبح ہی چائے پی لی تھی۔'' ندا نے ٹکا سا جواب دیا۔

''تو کیا ہوا، دوبارہ پی لے گی۔ کیا پابندی ہے دوبارہ پینے پر؟'' اب کے اعتراض آیا۔

''چائے کی پتی ختم ہو گئی ہے۔''

''اے تو کیا ہوا ملازم کو بھیج کر منگوا لو۔ یہ دو قدم ہی کے فاصلے پر تو دکان ہے۔'' نبیلہ یہ جو تمام گفتگو سُن رہی تھی، چائے کا نام سُن کر گھبرا گئی اور سوگ کے پروگرام میں بریک لگا کر ٹشو پیپر سے آنکھیں صاف کرنے لگی اور مُنہ دھونے اور پانی پینے کا بہانہ

کر کے اٹھنے ہی والی تھی کہ اُس کے میاں اندر داخل ہوئے۔ اتنی بہت سی عورتوں کو دیکھ کر ٹھٹک گئے اور سوالیہ نظروں سے بیٹی کی طرف دیکھا تو ندا بولی۔

''ابو! یہ لوگ اماں کو پرسہ دینے کے لیے آئی ہیں۔''

''اچھا، اچھا۔'' وہ غیر حاضر دماغی سے بولے۔

''ارے بھائی! تم کہاں تھے؟ تمہاری بیوی نے تو رو رو کر سارا جہان سر پر اٹھایا ہوا ہے۔'' ایک خاتون بولیں۔

''ارے ہاں اسی کی پریشانی اور رونے کا حل نکالنے کے لیے گیا تھا۔ لو بھئی نبیلہ تمہاری پریشانی اور مسئلے کا حل نکل آیا۔ اب اُٹھو اور رونا دھونا بند کردو۔'' وہ پہلے اپنی پڑوسن سے اور بعد میں نبیلہ سے مخاطب ہوئے۔

''مسئلہ......کون سا مسئلہ؟'' چند عورتوں کی ملی جلی آوازیں صحن میں گونجیں۔

''ارے میاں تمہارے خاندان میں یا نبیلہ کے خاندان میں سے کسی کا انتقال نہیں ہوا ہے کیا؟'' خالہ شبراتن ہکلاتے ہوئے بولیں۔

''نہیں، نہیں، خالہ! ہمارے خاندان میں کسی کا انتقال نہیں ہوا۔'' نبیلہ کے میاں نے جواب دیا۔

''ارے تو پھر تمہاری بیوی یہاں بیٹھی کیوں واویلا کررہی ہے؟ رو رو کر سارا محلّہ اکٹھا کرلیا ہے۔'' دوسری بھی تنک کر بولی۔

''ایسے آہ و زاری کررہی تھی، جیسے کوئی مرگیا ہو۔'' اسی وقت نبیلہ منہ دھو کر آئی اور بولی۔

''ہاں تو کیا کہہ رہے تھے آپ؟ میرا مسئلہ حل ہوگیا۔؟'' نبیلہ اپنے میاں سے مخاطب ہوئی۔

''ہاں ہاں تمہارا مسئلہ حل ہوگیا۔ اب تم عید پر بناؤ سنگھار بھی کرسکو گی اور عید کی خوشیاں بھی منا سکو گی۔ کسی غم کے بغیر خوش ہوجاؤ۔ قربانی کے بکروں کا کوئی کام بھی تم کو نہیں کرنا پڑے گا۔'' نبیلہ خوشی سے لبریز لہجے میں بولی۔

''شکر ہے خدا کا! کیا رازو واپس آنے کو تیار ہوگیا ہے؟''

''نہیں بھئی! رازو تو واپس آنے پر تیار نہیں ہوا۔ لیکن جب میں نے اُس کی بڑی منتیں کیں اور تمہارا بتایا کہ صدمے اور غم کے مارے تمہارا بُرا حال ہے تو اُس بے چارے کو رحم آ گیا اور اُس نے اپنے چھوٹے بھائی کو میرے ساتھ بھیج دیا۔''

''ہائے! سچ کہہ رہے ہیں ناں آپ؟'' نبیلہ نے مسرت سے لبریز لہجے میں کہا۔

''ہاں ہاں! میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں دلاور، دلاور کہاں ہو بھئی؟ اندر آجاؤ تمہاری باجی تمہیں بلا رہی ہیں۔'' نبیلہ کے میاں نے دروازے کی طرف پلٹتے ہوئے آواز لگائی، تب ہی ندا سے کچھ چھوٹا بچہ اندر داخل ہوا اور نبیلہ کے پاس آکر اُسے سلام کیا۔

''آئے ہائے نبیلہ! تو یہ تھا تمہارا سانحہ؟ ملازم کے چلے جانے کا؟ حد ہوتی ہے۔ بھلا بتاؤ ملازم کے عید پر چلے جانے کو سانحہ کہا جارہا تھا۔ اتنا صدمہ! دو چار دن خود ہاتھ پاؤں ہلا کر کام نہیں کرسکتی تھیں۔ خواہ مخواہ اتنے مگرمچھ کے آنسو بہا بہا کر سارا محلّہ اکٹھا کرلیا۔ ہمارا بھی وقت ضائع کیا اور اپنا بھی۔'' چاروں طرف سے مختلف آوازیں آرہی تھیں۔

اب تمام خواتین خشمگیں نگاہوں سے نبیلہ کو گھورتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو جارہی تھیں۔ دوسری طرف نبیلہ تھی جو اپنا سارا رونا دھونا بھول کر ملازم لڑکے کو گھر کے مختلف کاموں کے متعلق بتارہی تھی کہ کیا کرنا ہے؟ کیسے کرنا ہے؟ آخر اس کے بھائی نے بھی تو سارا گھر سنبھالا ہوا تھا، اور نبیلہ کا کام صرف حکم چلانا ہوتا اور سج دھج کر گھومنا پھرنا اور اب اچانک عیدِ قرباں سے قریب، ملازم، رازو کے چلے جانے سے اِس کے ہاتھ پیروں سے جان ہی نکل گئی تھی۔ بالکل حواس ہی چھوڑ بیٹھی تھی مگر اب 'دلاور' کے آجانے سے اِس کا یہ مسئلہ پھر سے حل ہوگیا تھا۔

☆☆......☆☆

افسانہ

منیبہ چوہدری

ٹیڑھی تحریر

گزرتے دنوں کے ساتھ مجھے یہ یقین ہوگیا کہ عاشی نے میرے ٹیلی فون کو کوئی اہمیت نہیں دی اور نہ ہی اس نے میری آواز پہچانی ہوگی، ورنہ وہ نرسنگ سپرنٹنڈنٹ کو میری شکایت ضرور کرتی، یا یہ بھی ہوسکتا تھا وہ مجھے کہیں راستے میں روک میرے......

محبت کی ایک سیدھی کہانی، جسے وقت نے ٹیڑھی میڑھی کر دیا

خالہ دو دن سے شوگر ٹیسٹ کرنے کا کہہ رہی تھیں، مگر میں بازار سے شوگر چیک کرنے والا آلہ لانا بھول گیا تھا۔ تیسرے دن انہوں نے پھر کہا تو مجھے یاد آیا کہ آلہ تو گھر میں ہی موجود ہوگا۔ امی جان کو بھی شوگر کا مرض تھا۔ ان کا انتقال دس سال قبل ہوگیا تھا۔ ان کی شوگر ٹیسٹ کرنے والی الیکٹرانک مشین ماموں جان نے انگلینڈ سے بھیجی تھی۔ امی کا انتقال ہوا تو میں نے ان کے کپڑے، شالیں اور سویٹر وغیرہ ایک بکس میں رکھے اور وہ مشین بھی اسی بکس میں رکھ کر اسے اسٹور میں رکھ دیا تھا۔ امی کی وفات کے دو برس بعد ہی مجھے عرب امارات میں شیخ زید اسپتال ابوظہبی میں ملازمت مل گئی تو میں وہاں چلا گیا۔ اس عرصہ میں میری شادی بھی ہوگئی، میں نے بیگم کو بھی یہاں ہی بلوالیا۔ اب میں دو بچوں کا باپ تھا اور سالانہ چھٹی پر پاکستان آیا ہوا تھا۔ خالہ ہمیں دوسرے شہر سے ملنے کے لیے آئی تھیں۔ میں اسٹور میں گیا اور امی جان کی نشانیوں والا بکس اٹھالایا۔ میں نے اسے کھولا تو امی جان کے استعمال کی چیزیں دیکھ کر آبدیدہ ہوگیا۔ میں نے شوگر ٹیسٹ والی مشین نکالی تو اس کے پیکنگ پر اس کا نمبر دیکھ کر بازار سے اسٹکس (Sticks) لینے کا ارادہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی میرے دل و دماغ میں کئی یادیں دہکنے لگیں۔

جب یہ آلہ ماموں جان نے انگلینڈ سے بھیجا تو اس وقت میں ضلع کے ہیڈ کوارٹر اسپتال میں نرسنگ کا کورس کر رہا تھا۔ ان دنوں میں فائنل ایئر میں تھا۔ ڈیوٹی ٹائم کے دوران ہمیں الیکٹرانک آلات کے استعمال کی اجازت نہ تھی۔ مگر میں شو مارنے اور اپنے ساتھیوں پر تھوڑا سا رعب جمانے کے لیے وہ آلہ ساتھ لے جاتا تھا۔ کیوں کہ پوری کلاس میں ایسا آلہ صرف میرے پاس تھا۔

مجھے بیتے دن شدت سے یاد آنے لگے۔ ان ہی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے میں گھر سے اسٹکس لانے کے لیے نکل پڑا...... سب سے پہلے مجھے اپنی کلاس فیلو عاشی یاد آئی اور پھر بہت سی پرانی باتیں اور شرارتیں۔

عاشی وہ لڑکی تھی جس کے غرور اور تمکنت نے مجھے، زندگی کی پہلی شکست کا مزہ چکھنے پر مجبور کیا تھا...... وہ

میری پہلی محبت تھی اور شاید آخری بھی۔ خاموش اور مسلسل، جس کی خبر اسے کبھی نہ ہوسکی۔ وہ پہلے دن ہی یعنی انٹرویو والے دن ہی میرے دِل میں چھم کر کے اُتر گئی تھی۔ اسے دیکھ کر بہت سے دوسرے لڑکوں کی سانسیں بھی میری طرح بے ترتیب، ہوگئی تھیں۔ وہ تھی بھی ایسی ہی...... ہر نقش تیکھا۔ تیز دِل میں کھب جانے والا۔ مجھے اس کی مغرور سی چال آج بھی یاد تھی۔ اپنے لافانی حسن کے نشے میں چور بے خودی ہوکر جب وہ چلتی تو یوں معلوم ہوتا کہ جیسے وہ میرے دل کی سیڑھیاں اُتر رہی ہو۔ اسے دیکھنے سے پہلے میں نے کبھی کسی لڑکی میں زیادہ دِل چسپی نہیں لی تھی۔ میں اپنی ذات میں مگن رہنے والا لڑکا تھا۔ لیکن عاشی کے اندر کوئی ایسی بات ضرور تھی جس نے میری دنیا ہی بدل ڈالی تھی۔ میں مردانہ حسن و جمال میں کسی سے کم نہ تھا اور بھی لڑکیاں کلاس میں تھیں، ایک سے بڑھ کر ایک اور مجھے چاہنے والی بھی۔ مگر میں سارا وقت عاشی کے متعلق ہی سوچتا رہتا اور اگر کبھی وہ ایک نگاہ غلط انداز مجھ پر ڈالتی تو مجھے جیسے کوئی خزانہ مل جاتا۔ تمام رات اس ایک لمحے کی اچٹتی سی نظر کے مختلف پہلو اور مطلب نکالتا رہتا۔

کلاس میں...... میں عین اس کی نشست کے پیچھے بیٹھا کرتا۔ وہ نوٹس لکھتی اور اس کی گوری گوری انگلیوں کو دیکھتا رہتا۔ وہ بال پین تھامے ٹیڑھی میڑھی سی تحریر میں لیکچر کا ایک ایک لفظ نوٹ کرتی۔ اس کی تحریر واحد چیز تھی جو مجھے پسند نہ تھی۔ یہ اس کی چاہت کا اثر تھا کہ میں کلاس ٹیسٹ میں فیل ہوگیا تھا کیوں کہ اس نے مکمل طور پر میرے دماغ پر قبضہ کرلیا تھا اور وہ میری پہلی شکست تھی۔ اس سے قبل کبھی کسی لڑکی نے مجھے یوں تسخیر نہ کیا تھا۔ میری خود پسندی کے بُت میں دراڑ نہیں ڈالی تھی اور سب سے اہم اور بڑی بات یہ تھی کہ وہ میری اس کیفیت سے بالکل

بے خبر تھی۔ وہ کیا...... میں نے اپنی دِل کی اس کیفیت میں کسی کو بھی شریک نہ کر رکھا تھا۔ میں جب بھی کوئی نیا لباس پہن کر خود کو آئینے میں دیکھتا۔ یہی سوچتا کہ میں اس کو کیسا لگوں گا۔ میرے خیال کی ہر بستی میں وہ میرے قریب ہوتی۔ میرے ساتھ قدم سے قدم ملا کر وہی مغرور چال چلتی ہوئی۔ لیکن اس کی سوچوں کے کسی صفحے پر شاید کہیں بھی میرا نام نہ تھا۔

ایسے ہی اوٹ پٹانگ سوچوں سے مجبور ہو کر ایک دِن میں نے بڑی کشمکش کے بعد لڑکیوں کے ہوسٹل فون کیا، وہ لائن پر آئی تو ریسیور میری بھیگی ہوئی ہتھیلی میں پھسلنے لگا اور دِل اس بری طرح دھڑکنے لگا کہ مجھے ڈر ہوا کہ کہیں وہ دھک دھک کی یہ آواز نہ سن لے۔

''عاشی!'' مجھے اپنی آواز بدلتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''جی عاشی۔ فرمایئے۔'' اس کی آواز بالکل صاف تھی۔ ''جی آپ کون؟''

میں نے تھوک نگلا۔ ''میں۔ اصل میں...... آئی لو یو۔'' اور اس کے ساتھ ہی میں نے ریسیور رکھ دیا اور اس کا جواب بھی نہ سنا کہ اس نے کیا کہا ہوگا۔ مجھے اپنی اس بات پر غصہ بھی آیا اور میں پچھتانے لگا کہ میں نے فون کر کے غلطی کی ہے۔ اگر اس نے پہچان لیا تو، اور نہ بھی پہچانے تو کیا فرق پڑے گا۔ خود میں اپنی ہی نظروں میں گر گیا ہوں کیوں کہ میری اس حرکت نے اسے بہت دنوں تک پریشان رکھا۔

میں ہر وقت اس خوف میں مبتلا رہنے لگا کہ اگر اس نے نرسنگ سپرنٹنڈنٹ کو شکایت کر دی تو کیا ہوگا؟ بات میرے گھر تک بھی پہنچ سکتی ہے۔ دوست یار میرا مذاق اڑائیں گے اور میں کلاس میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گا۔ اس بات کا امکان تو کم تھا کہ اس نے میری آواز پہچان لی ہو۔ لیکن جب بھی وہ اپنی کلاس فیلوز میں کھڑی ہنس رہی ہوتی تو مجھے یہی لگتا کہ وہ میرے بارے میں ہی بات کر رہی ہے۔

جب بھی وہ تیز تیز چلتی خوشبوؤں کے جھونکے اُڑاتی میرے قریب سے سراٹھا کر گزر جاتی تو میں سوچنے لگتا کہ میری آواز اس نے کب کب سنی تھی، شاید صرف دو دفعہ، جب میں نے کلاس میں اسائنمنٹ پڑھ کر سنائی تھی تب یا پھر بس وہ فون!

گزرتے دنوں کے ساتھ مجھے یہ یقین ہو گیا کہ عاشی نے میرے ٹیلی فون کو کوئی اہمیت نہیں دی اور نہ ہی اس نے میری آواز پہچانی ہوگی، ورنہ وہ نرسنگ سپرنٹنڈنٹ کو میری شکایت ضرور کرتی، یا یہ بھی ہوسکتا تھا وہ مجھے کہیں راستے میں روک میرے عشق کا بھوت جوتوں سے اُتار دیتی۔ ایسا کرنے سے ایک فائدہ ضرور ہوا تھا، وہ یہ کہ میرے دِل سے اس کا خبط محو ہوتا جا رہا تھا۔

وہ اب بھی ویسی ہی خوب صورت تھی، اور مجھے اچھی بھی لگتی تھی، لیکن میرے دِل میں اب وہ پہلی سی بے قراری نہیں رہی تھی۔ نہ جانے کیوں میں خود ہی اسے بھلانے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ ہمارے سالانہ اور فائنل امتحان ہونے والے تھے اور ہماری توجہ ان کی تیاری کی طرف تھی۔ امتحان ختم ہونے کے بعد عملی طور پر کام کرنے کے لیے سب کی ڈیوٹی مختلف وارڈز میں لگائی گئی جو کہ نتیجہ آنے تک جاری رہنا تھی۔

ایک روز میری اور عاشی کی ڈیوٹی ایک ہی وارڈ میں تھی۔ وارڈ کے مریضوں کے بستروں کی ایک لائن میرے حوالے تھی اور دوسری لائن عاشی کے حوالے تھی۔ ہم نے سب مریضوں کا بلڈ پریشر، نبض کی رفتار، ٹمپریچر چیک کرنا تھا اور کوئی شوگر کا مریض تھا تو اس کا خون کا نمونہ لے کر لیبارٹری میں بھیجنا تھا۔ اس روز میں گھر سے شوگر چیک کرنے والی الیکٹرانک مشین ساتھ لے آیا تھا، تاکہ میں شوگر ٹیسٹ کا نتیجہ فوری طور پر مریض کی فائل میں لکھ دوں۔ میں اس لیے خوش بھی تھا کہ آج دو بجے تک

میں اور عاشی ایک ہی وارڈ میں رہیں گے مگر ڈر بھی رہا تھا کہ کہیں وہ مجھے ڈانٹ نہ پلادے اور فون کرنے والا سارا غصہ آج ہی اُتار دے۔

میں ایک مریض کا بلڈ پریشر چیک کر رہا تھا کہ وہ پہلی بار اچانک ہی میرے قریب آ گئی۔ اس نے مجھ سے شوگر ٹیسٹ کرنے والا آلہ مانگا تھا۔

''یہ دیجیے ذرا! مجھے کچھ دیر کے لیے ضرورت ہے۔''

اس کے لہجے میں درخواست کی بجائے تحکم کا سا انداز تھا۔ جیسے میری چیز مجھ ہی سے مانگ کر مجھ پر کوئی احسان کر رہی ہو۔ میں نے خاموشی سے وہ آلہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اس کے جانے کے بعد مجھے اپنے آپ پر بہت غصہ آیا کہ میں نے اسے کیوں نہ کہہ دیا کہ مجھے خود اس کی ضرورت ہے اور اس کا غرور تو دیکھیے کہ شکریہ تک ادا نہیں کیا۔

چھٹی کا ٹائم بھی ہونے لگا تھا، وہ آلہ واپس کرنے آئی تو اس کا واپس کرنے کا انداز بھی زیادہ ہی بدتمیزی کا تھا۔ میں ایک اور مریض کا بلڈ پریشر چیک کر رہا تھا کہ وہ مجھے بتائے بغیر اور شکریہ ادا کیے بغیر میرے مریض کے سرہانے رکھ کر وارڈ سے نکل گئی۔

میں نے بھی چھٹی کی اور وہ آلہ لے کر گھر روانہ ہو گیا۔ میں آلہ امی کے کمرے میں رکھنے گیا تو ان کی طبیعت کافی خراب تھی۔ بڑے بھائی ان کو اسپتال لے جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ میں نے آلہ کمرے میں ہی رکھا اور بھائی کے ساتھ ہی امی کو ان کے محکمے کے اسپتال میں لے گیا۔

بھائی جان ایک سرکاری ادارے میں ملازم تھے۔ جن کا اپنا اسپتال تھا۔ امی کا بلڈ پریشر اور شوگر دونوں ہی بڑھ گئے تھے۔ اسی دوران ان پر دل کا دورہ پڑا تو وہ زندگی سے ناتا توڑ گئیں۔

میری زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ اور میری ممتا مجھ سے چھن گئی۔ میں نے اسپتال سے ایک ماہ کی چھٹی لے لی۔ اسی دوران نتیجہ آیا تو سوائے ایک ساتھی کے ہم سب پاس ہو گئے۔ مجھے اسی اسپتال میں ملازمت بھی مل گئی۔ اتفاق تھا کہ عاشی بھی وہاں ہی تھی، اب ہمارا سامنا کم ہی ہوتا تھا کہ اس کی ڈیوٹی زنانہ وارڈ میں تھی اور میری مردانہ وارڈ میں۔ ہمارے پاس وقت ہی کم ہوتا تھا۔ اگر وہ کبھی دکھائی بھی دیتی تو بہت جلدی میں ہوتی۔ میں بھی اپنے کام میں مصروف رہنے لگا اور اس کے بارے میں سوچنے کا وقت ہی کم ملتا۔ شاید وہ اب مجھے پہچانتی ہی نہ تھی۔

ایک بار اتفاق سے ہم آمنے سامنے آ گئے تو اس نے ایک نظر بھر کر میری طرف دیکھا اور میرے دل کی دنیا کو تہہ و بالا کر ڈالا۔ قریب تھا کہ میں دوبارہ اس کے طلسم میں گرفتار ہو جاتا۔ میری نیندیں، میری سوچیں، اس کی آنکھوں، اس کی چال کے سحر میں کھو جاتیں اور اسے معلوم بھی نہ ہو پاتا کہ اس کی سرسری نگاہ میرے دل پر کیا قیامت ڈھا گئی ہے۔ لیکن زندگی کی گھما گھمی نے مجھے اپنے جال میں چھپا لیا۔

مجھے یو اے ای میں ملازمت مل گئی اور میں عاشی سے دور چلا آیا۔ پھر میری شادی ہوئی، بچے ہوئے تو عاشی کی یاد وقت کے ڈھیر میں دفن ہو گئی، مگر آج برسوں بعد شوگر ٹیسٹ کے آلہ کو دیکھ کر بہت سی بھولی بسری یادوں نے میرے سانسوں کو مہکا دیا تھا۔

میں نے شوگر کی اسٹک میڈیکل اسٹور سے خریدی اور پھر ایک جنرل اسٹور سے دو پینسل سیل خرید کر گھر کی طرف روانہ ہوا۔ گھر آ کر میں نے خالہ جان کی شوگر ٹیسٹ کرنے کے لیے مشین کے ربڑ کیس کی زپ کھولی تو اس میں سے ایک بوسیدہ سا کاغذ تہہ کیا ہوا پڑا تھا۔ میں نے اس کی تہیں کھولیں تو بال پین سے لکھی ہوئی ایک ٹیڑھی میڑھی سی تحریر میں لکھا تھا۔

''I Love You''

☆☆......☆☆

مکمل ناول

فرزانہ آغا

کہانی تم بھی ہو!

ملک کی آدھی آبادی صبح اُٹھ کر محض لہسن پیاز چھیلنے لگتی ہے۔ دولے شاہ کے چوہوں کے سر پر لوہے کا کنٹوپ ہوتا ہے اور ہماری عورتوں کے دماغوں پر 'ہانڈی' کی بندش...... وہ عورتیں جن کی اکثریت زندگی میں سونے کی چھ چوڑیاں بنانے کو......

دورِ حاضر کی سچی تصویر، سبزہ زاروں کے شہر سے توشۂ خاص

گاڑی صاف و شفاف، سرمئی، اونچی نیچی خوبصورت سڑک پر رواں دواں تھی۔ فیض آباد انٹرچینج کے بعد اب اُس کا رُخ مری روڈ کی طرف تھا۔ زاہدہ اور صبا دونوں ہی گاڑی کے شیشوں سے باہر، بدلتے مناظر پر نظریں جمائے ہوئے تھیں۔ ان کی آنکھوں میں وہی جوش، اشتیاق اور سرخوشی کی کیفیت تھی۔ جو عرصے بعد وطن لوٹنے والوں کی آنکھوں میں جگمگاتی ہے۔ زاہدہ، مطمئن چہرے والی قناعت پسندی درمیانی عمر کی عورت تھی جس کے اندر مختلف تہذیبوں کو ساتھ لے کر چلنے کا عمیق ٹھہراتھا۔ صبا اپنی ماں سے قدرے مختلف پتلی، لمبی پُراعتماد لڑکی تھی۔ مغربی پرورش جس کے کھڑے شانوں میں ایک پراعتماد استحکام بن کر پڑی تھی اور مشرق اپنی قدامت کی گہرائی سمیت جو گرز میں مقید قدموں میں پڑا تھا۔

تیزی سے گزرتے مناظر میں دائیں ہاتھ ایک خوبصورت لینڈ اسکیپ پر تیر کے نشان کے ساتھ ''چھتر پارک'' کے بورڈ پر زاہدہ چونکی اور ڈرائیور سے بولی۔

''ذرا دو منٹ کو گاڑی اِدھر پارک کے پاس لگانا۔''

''اوہ! یہ کتنا بدل گیا ہے...... صبا جب تم چھوٹی تھیں تو امی بابا کے ساتھ ہم اکثر یہاں آیا کرتے تھے۔'' صبا بھی غور سے پارک کی طرف دیکھنے لگی۔ پر اُس کی آنکھوں کے سپاٹ پن نے بتایا کہ روندی ہوئی گھاس اور مصنوعی آبشاروں والے اس پارک سے کچھ زیادہ متاثر نہیں ہوئی۔

''چلیں گاڑی نکالیں آگے، صبا یہ پہلے بہت خوبصورت تھا۔'' زاہدہ ایکسائٹمنٹ سے بولی۔

''پتا ہے صبا یہاں پانیوں سے پرے، ایک بہت بڑی بھوری چٹان تھی۔ ہم پکنک پر آتے تھے تو ادھر ہی بیٹھتے تھے۔ اب باغ تو سمجھو ختم ہی ہو گیا ہے۔ یہاں بہت بڑا، پرانا لوکاٹ کا باغ تھا۔ خاموش پُرسکون، ہم لوکاٹ کے موسم میں اِدھر آیا

کرتے تھے اور چھوٹی چھوٹی ٹوکریوں میں بکتی باغ کی تازہ لوکاٹ لیا کرتے تھے۔ یہاں ایک لڑکی ہوا کرتی تھی۔ پتا نہیں کیا نام تھا۔ ہاں...... شانو!'' زاہدہ ہنستی ہوئی بولی۔

''سادہ سے قمیض شلوار میں ایک لمبا بانس لیے پورے باغ میں گھومتی، طوطے اڑاتی پھرتی اور بانس گھماتے ہوئے ہررررر...... کی اتنی اونچی آواز نکالتی کہ پرندے پھڑ پھڑا کے درختوں سے اڑ جاتے۔ اب باغ کی جگہ پر تو بہت ہی تھوڑے درخت رہ گئے ہیں۔ پتا نہیں ہماری قوم میں یہ کیا خرابی ہے کہ جہاں قدرتی حسن افراط میں ہوگا اُس جگہ کو ہی Demolish کر کے مصنوعی پارک بنادیں گے۔ بھئی جھولے تو کسی بھی ہموار میدان میں، کہیں بھی لگ سکتے ہیں اس کے لیے۔'' پھر رُک کر ذرا بڑبڑاتے ہوئے بولی۔''باہر رہ کر ان باتوں کا کچھ زیادہ ہی احساس ہونے لگا ہے۔'' ''یہ پارہ کہو'' شروع ہوگیا ہے نہ؟'' وہ ڈرائیور سے مخاطب تھی۔

''جی!'' ڈرائیور دھیرے سے بولا۔

''دیکھو صبا یہاں کتنی زیادہ آبادی ہوگئی ہے۔ بس اِدھر سے آگے مڑ کر بس پچیس منٹ کا راستہ ہوگا۔'' زاہدہ چھوٹی چھوٹی دوکانوں والے بازار کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ اب بازار کافی بڑا تھا۔ سات آٹھ سال کا عرصہ کم تو نہیں ہوتا۔ اُس نے سوچا۔ گاڑی آگے نکل کر ایک نیم پختہ سڑک پر مڑ گئی۔ خوبصورت لینڈ اسکیپ پر بدلتے منظر میں اور خوبصورت ہوجاتے۔ چھوٹی چھوٹی سیاہ چٹانیں بڑے میدانوں میں ابھری کھڑی تھیں۔ جہاں جنگلی پھولوں کے بے خوف بسیرے تھے اور نیلے بے پروا آسمان پر کونجوں کی ڈار تھی جن کی پرواز کا پُر یقین سبھاؤ بتاتا تھا کہ انہوں نے منزل کا تعین کر کے اڑان بھری تھی۔

گاڑی مزید پتلی، پیچ وخم کھاتی سڑک سے گزر کر ایک مختصر آبادی میں داخل ہوئی جہاں سڑک کے دونوں طرف سات یا آٹھ گھر سر اٹھائے کھڑے تھے۔ دائیں ہاتھ سرخ اینٹوں اور سیاہ آہنی گیٹ والے گھر کے پاس گاڑی رُک گئی۔ نچلی Fence والے برآمدے میں وہیل چیئر کا مُنہ گیٹ کی طرف کیے افتخار احمد حسبِ توقع برآمدے میں ہی بیٹھے تھے۔ زاہدہ اور صبا نے اکٹھے انہیں ہاتھ ہلایا۔ گاڑی رُکتی دیکھ کر گٹھے ہوئے جسم والا ملازم سپاٹ چہرہ لیے باہر آیا اور سامان اٹھانے لگا۔ بوکسز اور بیگز گنتے ہی زاہدہ مڑی اور دس قدموں کو چار قدموں کی تیزی سے پروتی، افتخار احمد کے سینے سے لگ گئی۔ اُن کا ہلکا ہلکا لرزتا ہوا ہاتھ آہستہ آہستہ اُس کی پشت تھپتھپا رہا تھا۔ صبا بھی لمبے لمبے ڈگ بھرتی افتخار احمد تک پہنچی اور انہیں پیار کرتے ہوئے اپنے بازو ان کے گرد حمائل کردیے۔

''میری جان!'' خوشی کے آنسوؤں میں گندھی افتخار احمد کی بوجھل آواز گونجی۔

''یہ آپ نے مجھے کہا ہے کہ ماما کو''۔

''تم دونوں کو'' افتخار احمد نے ہنستے ہوئے کہا۔

''آؤ بھئی اندر چلیں۔'' انہوں نے وہیل چیئر موڑی۔

''آپ چلیں میں ایک منٹ میں آئی۔'' زاہدہ نے کچھ پیسے نکال کر ڈرائیور کو دیے۔ اُس کے انکار پر اصرار کر کے پکڑاتی ہوئی پوچھنے لگی۔''انکل سرخیل کب تک آئیں گے۔''

''بیگم صاحبہ کہہ رہی تھیں کہ ہفتے دس دن تک آجائیں گے۔''

''اچھا! آنٹی کو میرا اسلام کہنا، میں فون پر بات کروں گی اُن سے۔''

''ٹھیک ہے جی! اللہ حافظ۔''

''اللہ حافظ۔'' اندر آتی زاہدہ سے افتخار احمد کا ملازم بولا۔
''ابھی سب سامان لاؤنج میں رکھ دیا ہے۔'' آپ بتاؤ گے تو پھر جو، جس کمرے میں رکھنا ہے رکھ دیں گے۔''
''ہاں! ٹھیک ہے۔'' زاہدہ نے چادر کندھوں پر لپیٹتے ہوئے کہا، سردی کافی زیادہ تھی۔
''یہ ولید ہے بھئی میرا کیئر ٹیکر اور ولید یہ میری بیٹی زاہدہ اور یہ نواسی صبا......اس کی بیٹی۔'' وہ زاہدہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔ ولید نے سر ہلایا اور افتخار احمد کی وہیل چیئر چلاتا ہوا ٹی وی لاؤنج میں ان کی جگہ پر لے آیا۔ صبا ہینڈ بیگ زاہدہ کے پاس رکھتی سامنے سلائیڈنگ ڈور کے پاس گئی اور پردہ پرے کر کے دروازہ کھولا۔
''Amazing!'' سامنے دریائے کورنگ کو اک شانِ بے نیازی سے رواں دیکھ کر صبا کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ نیچے گول چوڑی سرخ سیڑھیوں کے بعد ہموار لمبا سرسبز لان تھا۔ لان جو اپنی چوڑائی میں چھ فٹ تک دریا کے اوپر تھا۔ اس طرف مضبوط ریلنگ لگی تھی جو آگے سے آگے جاتی، قدرے اونچے ٹیرس لان پر لگی سرخ چھتری پر تمام ہوتی تھی۔ اس کے دائیں ہاتھ دو Hut کی شکل کے سرونٹ رومز تھے جن کے اوپر سرخ بوگن ویلیا اک جھاڑ کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ سامنے دریائے کورنگ اور ایک خواب کی مانند بہتا تھا۔ چھوٹی بڑی کالی چٹانوں سے ٹکراتا، رُکتا بہتا پانی چمکتے سورج کی کرنوں سے دمک رہا تھا۔ حدِ نظر تک دریا تھا جو آگے اونچے مٹیالے ٹیلوں کے منظر کی اوٹ میں گم ہو جاتا تھا اور اوپر کھلا آسمان تھا جو بے نیازی میں ''بے نیاز'' جیسا ہی تھا۔
زاہدہ افتخار احمد کا ہاتھ پکڑے ان کے پاس بیٹھی تھی۔ ولید نے چائے کی ٹرے میز پر لا کر رکھی تو وہ اُس سے بولی۔
''جاؤ صبا کو کہہ دو جا کر چائے کا، وہ باہر ہے۔''
ولید مڑا تو زاہدہ باہر دیکھتی ہوئی بولی۔ ''کتنی خوش ہے صبا، مجھے پتا تھا یہ یہاں آ کر بہت خوش ہو گی پر......آتے آتے میں اتنا وقت گزر گیا۔ میں جب بھی پاکستان آتی تو میرا جی چاہتا کہ صبا بھی ساتھ چلے پر، پڑھائی، جاب، پھر اس کی شادی......'' زاہدہ نے ایک لمبی سانس لی اور بولی۔ آتے آتے میں کتنا وقت گزر گیا۔ پر شکر ہے بابا سب اچھا ہو گیا۔ سمیر بہت ہی خیال رکھنے والا لڑکا ہے۔ میں صبا کی طرف سے بہت خوش ہوں۔''
''ہاں! شادی پر جب سمیر سے ملا تھا تو مجھے بھی بہت ہی اچھا لگا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھنے والا۔'' صبا جھٹکے سے بال پیچھے کرتی اندر آئی تو افتخار احمد نے بازو پھیلائے اور بولے۔ ''آؤ صبا رانی بتاؤ تمہاری سائیکالوجی کیا کہتی ہیں۔'' صبا افتخار احمد کے گلے لگتی ہوئی بولی۔
''فی الحال تو یہ کہتی ہیں کہ آپ کے ولید کو ہمارا آنا کچھ زیادہ اچھا نہیں لگا۔'' وہ شفقت سے ہنسے اور بولے۔
''نہیں......نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔'' زاہدہ بولیں۔
''ظاہر ہے بھئی ایک بندے کا کام کر کے وہ جلدی فارغ ہو جاتا ہوگا۔ اب سوچتا ہوگا کہ مجھے تین لوگوں کا کام کرنا پڑے گا۔ اسے کیا پتا کہ میں اپنے بابا کے بھی سارے کام خود کروں گی۔'' زاہدہ محبت سے افتخار احمد کی طرف دیکھتی ہوئی بولیں۔ چائے ختم ہوئی تو وہ صبا سے کہنے لگیں۔
''صبا جانی! میں اب ولید سے سامان کمروں میں رکھواتی ہوں۔ تم ثمینہ آنٹی کو فون کر کے بتا دو کہ

ہم لوگ پہنچ گئے ہیں۔'' پھر وہ افتخار احمد سے مخاطب ہوئیں اور بولیں۔ ''ثمینہ سے بات ہوئی تھی آنے سے پہلے، وہ اِدھر اسلام آباد میں ہے، فرنٹیئر ہاؤس میں اِن دنوں۔ اُس کی چھوٹی کی منگنی ہے دس پندرہ دن بعد، تو وہ کہہ رہی تھی کہ تم پہنچو تو بتانا، میں آ کر مل بھی جاؤں گی اور کارڈ بھی دے جاؤں گی۔''

''ہاں! اچھا ہے آ کر مل جائے۔ یہ سب تم لوگوں کے آنے کی برکتیں ہیں ورنہ اِدھر تو نہ بندہ ہے نہ پرندہ...... بریگیڈیئر سرخیل آ جاتا تھا تو رونق رہتی تھی۔ اب اسے بھی امریکہ گئے مہینوں ہو گئے۔''

''بابا! پرندے تو یہاں بہت ہیں آپ خوامخواہ شکوہ کر رہے ہیں۔ منگنی پر چلیں گے تو بہت سے بندوں سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔''

''طبیعت ٹھیک رہی تو ضرور چلوں گا۔ عرصہ ہوا پرانے لوگوں سے، رشتہ داروں سے ملے ہوئے۔''

''آپ کی طبیعت بالکل ٹھیک رہے گی۔ سنا ہے موٹروے بننے سے راستہ کافی آرام دہ ہو گیا ہے۔''

''ہاں! سنا تو ہے ویسے پہلے بھی راستے میں ایسی کیا خرابی تھی؟ میں بھی بہت پہلے گیا تھا۔ سیف الرحمن کا انتقال ہوا تو تمہارے پاس گیا ہوا تھا۔ واپس آ کر بارہا سوچا پر اکیلے ہمت ہی نہ پڑی۔ بس فون پر رابطے ہیں سب سے۔''

''چلیں اب ہم سب اکٹھے چلیں گے۔ صبا بھی خوش ہو جائے گی۔ اِسے تو نئی نئی جگہیں دیکھنے کا بہت شوق ہے اور پاکستانی رسم و رواج دیکھنے کا بھی۔''

''ہاں مم! پر آپ ابھی دو تین دن ریسٹ کریں یہ نہ ہو کہ آپ کا مائیگرین شوٹ کر جائے۔'' صبا زاہدہ سے مخاطب تھی۔ زاہدہ قالین پر ٹانگیں لمبی کرتے ہوئے بولی۔

''بابا کو دیکھ لیا ہے نہ۔ اب آرام ہی آرام ہے۔ تم میری فکر نہ کرو۔''

☆......☆......☆

اندھیروں میں ڈوبی سڑک گہرے بھید بھاؤ بتاتی پشاور شہر میں داخل ہوئی تھی۔ ہر طرف اُڑتی خاک رات میں بھی نمایاں تھی۔ ولید نے پیٹرول پمپ کی طرف بائیں ہاتھ گاڑی موڑی جہاں گھپ اندھیرے میں ڈوبے کچھ مکانوں کی قطاروں پر معنی خیز سکون کا راج تھا۔ انتہائی کم روشنی کے باعث پیٹرول پمپ بظاہر بند ہی لگ رہا تھا پر گاڑی رُکنے پر دیوار کی عقب سے ایک آدمی برآمد ہوا۔ ولید گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکلا تو زاہدہ بولی۔

''بابا! اب یہاں سب کتنا سنسنان ہے۔ ابھی تو صرف سات بجے ہیں پر یہاں تو اتنا سناٹا ہے۔ پہلے جب آتے تھے تو...... ایسی ویرانی تو نہیں ہوتی تھی۔''

''ہاں! جب بھی کسی سے بات ہو تو یہی کہتے ہیں سب کہ ادھر حالات اچھے نہیں، شاید سردی عروج پر ہے اس لیے، ویسے یہ ولید آیا بھی شہر کے باہر والے راستے سے ہے۔ ہم ادھر سے آگے جا کر جو راؤنڈ اباؤٹ ہے وہاں سے واپس مڑ جائیں گے یونیورسٹی کی طرف، اِس سڑک پر سیدھا جا کر سامنے ہی تو افغانستان کی ٹیرٹری شروع ہو جاتی ہے۔ یہ ایک موڑ بھولا ہے۔ میں نے اِسے کہا بھی تھا کہ......''

''سامنے افغانستان کا ایریا شروع ہو جائے گا؟'' صبا آگے ہوتی ہوئی بولی۔

''ہاں! جہاں Prohibted Area لکھا ہے نہ وہاں سے 'علاقہ غیر' شروع ہو جاتا ہے۔ علاقہ غیر! ہم نے تو اسے سچ مچ غیروں کے حوالے کر دیا۔'' افتخار احمد دھیرے سے بولے۔ ولید پے منٹ کر کے بیٹھا تو افتخار احمد اُسے راؤنڈ اباؤٹ سے راستہ سمجھانے لگے۔ ولید سپاٹ چہرہ لیے سنتا رہا۔

صبا نے پرتجسس ہو کر 'علاقہ غیر' کے بورڈ کے پیچھے نظر ڈالی۔ سامنے تاریکی ہی تاریکی تھی۔ جس کے پیچھے بے سمت راستے تھے۔ غربت، جہالت، معذوری، احساسِ محرومی اور دور ...... بہت دور بے پیرہن پہاڑوں میں دفن خزانوں پر غیروں کی بدنظری اور اپنوں کی خود فریبی اور دغا بازی کا راج تھا۔ سچ اور جھوٹ آپس میں یوں مدغم ہو چکے تھے کہ کسی ایک کی بھی پہچان ممکن نہ رہی تھی۔ ایک دھند تھی جو چار سو چھائی تھی۔ ڈاکومنٹیریز اُس کی نگاہوں کے سامنے گھومنے لگیں۔

گاڑی یوٹرن لے کر ڈبل روڈ پر مڑ چکی تھی جہاں کافی آگے جا کر سڑک کے دونوں طرف Branded Out Lets تھیں۔ اور بہت سے جدید ریسٹورنٹس، صبا نے انہیں ذرا حیرت میں دیکھتے ہوئے سوچا لگتا ہی نہیں کہ یہ ایک شہر ہے۔ آگے سے آگے جاتی گاڑی کے پیچھے، روشنیاں فاصلے پر جاتی رہیں۔

''بس گاڑی ذرا آہستہ کرلو یہ لیفٹ پر، بائیں ہاتھ جدھر گاڑیوں کی لائن ہے ان کے پیچھے کرلو گاڑی۔'' افتخار احمد نے ولید کو سمجھایا تو زاہدہ نے شیشے سے باہر دیکھا۔ گیٹ کافی دور تھا۔

''یہ راستہ تو بہت چوڑا ہوتا تھا، یہ بہت تنگ نہیں ہو گیا؟'' زاہدہ غور سے سامنے دیکھتے ہوئے بولیں۔

''خود دیواریں آگے کھڑی کروائی ہوں گی۔ اس وقت میں تو کوئی خاص و عام محفوظ نہیں اور ان لوگوں کی تو دشمن داریاں ہی بہت ہیں۔'' زاہدہ نے موڑ کھاتے راستے کے ساتھ ساتھ تازہ لپی دیواروں کی طرف دیکھا۔ گاڑی اب بیریئر پر رک چکی تھی۔ سامنے کم از کم دس مسلح گارڈز تھے جنہوں نے گاڑی کو انتہائی تنگ موڑ سے گزروایا۔ اِس موڑ سے آگے ایک بہت بڑا کھلا میدان تھا۔ جس کے دائیں ہاتھ پر دس بارہ کچی مٹی کی لپائی والے صاف ستھرے کچے مکان تھے۔ اور دوسری طرف کئی سو گاڑیاں میدانی پارکنگ میں کھڑی تھیں اور کئی مسلح گارڈز تھے۔

جن کے سینوں پر کارتوس کی بھری پٹیاں لگی تھیں۔ وہ مستعدی سے گاڑیوں کی چیکنگ بھی کررہے تھے اور پارکنگ بھی کروا رہے تھے۔ صبا متحیر سی گھپ اندھیروں میں گاڑیوں کی جلتی بجھتی بتیوں میں سب کچھ ہوتا دیکھ رہی تھی۔ اونچے ڈانس میوزک کی آواز باہر تک آرہی تھی۔ گاڑی سے اترنے لگے تو زاہدہ صبا سے بولی۔

''دوپٹے کو پھیلا کر سر پر اوڑھو۔'' صبا نے گاڑی کے ساتھ کھڑے ہوتے ہوئے دوپٹے کو سر پر ٹکانے کی مخلصانہ کوشش کی پر بھاری کام کا پونے تین گز کا دوپٹا سر پر ٹکانا کافی مشکل تھا پر اُس نے کوشش جاری رکھی۔ صبا کو پاکستان آئے اڑھائی تین ہفتے ہو چکے تھے اور وہ حاضر رائج لیڈیز پاکستانی ڈریسز کے نان پریکٹیکل ہونے پر اور اس کے اظہار پر زاہدہ سے کافی مباحثے کر چکی تھی۔ زمین تک آتی قمیضیں، بے تحاشا کھلے یا بے تحاشا تنگ پاجامے، بڑے بڑے دوپٹے، اور یہ تو کامدار وزنی سوٹ تھا۔ زاہدہ نے اسے ہلکا سا لڑکھڑاتے دیکھا تو اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''آرام سے صبا! آرام سے چلو۔'' راستہ جو بہت بڑے مارکسیز کی طرف جا رہا تھا وہ کچا پکا تھا اور میچنگ سینڈلز کی نفیس ہیل کے لیے انتہائی غیر مناسب، صبا اُس بیش قیمت لباس کو سنبھالتی زاہدہ کی اوٹ میں چلتی اُن اندھے اندھیر راستوں پر، کافی بوکھلائی ہوئی تھی اور دل ہی دل میں اُس وقت پر پچھتا رہی تھی جب زاہدہ کے کہنے پر لمبے ملتانی جھمکے بھی پاکستانی فنکشن کو اٹینڈ کرنے کی خوشی میں کانوں میں چڑھا لیے تھے۔

مارکسیز کے آرائشی چھوٹے دروازے سے گزر

کر اندر کے منظر نے دوپٹے، ہیل اور جھمکوں کی کوفت ہٹادی۔ باہر کی اندھی اندھیری دنیا سے مختلف سیلابِ رنگ و بو کی ایک دنیا تھی جو کان پھاڑتی موسیقی کے اندر آباد تھی۔ سامنے انتہائی خوبصورت اسٹیج تھا۔ جس کے پیچھے لگا شیشہ واٹر فال کا منظر پیش کررہا تھا۔ پانی فوارے کی شکل میں اوپر جاتا اور سبک خرامی کے بہاؤ سے نیچے آتا جہاں طلسماتی رنگ دینے کے لیے بے تحاشا امپورٹڈ پھول تھے جو اتنے تروتازہ تھے کہ نقلی ہونے کا گمان ہوتا تھا۔ پھولوں کے رنگ کے پلین کارپٹ پر چھوٹا سا بیش قیمت صوفہ تھا جس کے دائیں بائیں دو شاہانہ کرسیاں تھیں۔ اسٹیج کے آگے بھی انہی بہشتی رنگوں کے پھول تھے۔ پھول تھے اور پھول...... جو راہداری میں بچھے کارپٹ کے اردگرد سے آگے طویل وعریض پنڈال کی کرسیوں تک آتے تھے اپنی بہتات میں۔

زاہدہ اور صبا کو اندر آتا دیکھ کر زنان خانے کے ہنگامے میں نجانے کہاں سے ثمینہ برآمد ہوئیں اور باری باری دونوں کو گلے لگا کر، گالوں کے دائیں بائیں باری باری پیار کیا۔ یقیناً وہ ان کی آمد پر خوشی اور شکر گزاری کے جذبات پر مبنی کچھ کلمات کہتی ہوں گی جو بے انتہا اونچے میوزک میں محض ہونٹوں کی جنبش بن کر رہ گئے تھے۔ ثمینہ زاہدہ کے شانوں پر ہاتھ رکھے اسٹیج کے سامنے رکھے صوفوں تک آئیں اور بٹھا کر گئیں۔

اسٹیج کے سامنے ڈانس فلور بھی شیشے کا تھا جس کے سامنے مطمئن ہوکر بیٹھنے کے بعد صبا کی آنکھیں اُن لڑکیوں پر مرکوز تھیں جو اپنے پہناووں میں قدیم شہزادیاں لگ رہی تھیں۔ سرخ وسفید دمکتے میک اپ زدہ چہرے، آنکھوں کے گرد چوڑے کاجل، نفیس شیفون سے جھانکتے بلوریں بازو، چار چار انچ کی ڈائمونٹیز لگی ہیلوں میں برق رفتاری سے اٹھتے مشتاق قدم، میوزک کی تھرک پر تمتماتے چہرے اور ڈائمنڈز سے مرصع جیولری کی لپک جھپک......

''Wao, Mummy All These Are Your Reletives?'' صبا نے پُراشتیاق لہجے میں پوچھا۔

''ہوں!'' زاہدہ کی اثباتی ہوں میں کچھ ابہام سا تھا۔ اِدھر انگلش انڈین، اسپینش، پشتو اور پنجابی ایک کے بعد ایک ہٹ گانوں کی کلیکشن پر صبا پُرجوش ہی نہیں کافی حیران بھی تھی اور پاکستانی لڑکیوں کو ایک Wel Informed جنریشن کے طور پر دل ہی دل میں سراہ رہی تھی۔ بدلتے گانوں کے ساتھ لڑکیوں کا ایک نیا گروپ آجاتا ان لڑکیوں کی ڈریسنگ بتاتی تھی کہ ویسٹرن ویئر کے بارے میں ان کی معلومات کم نہیں۔ صبا کو کوفت تو تب ہوتی جب ویڈیو بنانے والے لڑکے بار بار اس کے اور ڈانس فلور کے درمیان حائل ہوجاتے۔ ایک بار تو وہ بول ہی پڑی۔

''آپ سائیڈ پر ہوکر مووی بنائیں۔'' انہیں آواز کہاں جانی تھی پر اس کے اضطرار پر بارکسیز کی ریشمی دیوار سے لگے کچھ سرخ وسفید افغانی بچے صبا کی بات کو سمجھتے ہوئے آگے ہوئے اور پشتو میں مووی بنانے والوں سے کچھ کہا۔ تینوں چاروں لڑکوں نے پلٹ کر صبا کی طرف دیکھا اور تھوڑا سائیڈ پر ہوگئے۔ باقی کیمروں والے ڈانس فلور کے آس پاس ہی رہے۔

اِسی سرور وآہنگ میں بادام اور پستوں والا دودھ قطار در قطار سینیوں میں آنے لگا۔ دودھ کی بہتات تھی۔ ان کو لانے والی چھوٹی چھوٹی افغانی لڑکیاں تھیں۔ چادروں کو سروں کے گرد اچھی طرح لپیٹے...... وہ چادریں جو جابجا پیوند زدہ تھیں۔ دودھ سے مدارات کے دوران ٹینٹوں کی ریشمی چادروں

کے باہر کچھ ہل چل ہوئی۔ صبا نے گلاس پکڑتے ہوئے باہر کی ہلچل پر توجہ مرکوز کی تو چادروں کے جوڑوں کے درمیان اُسے بہت سے بچوں کی امید افزا آنکھیں جھپکتی دکھائی دیں جو دودھ کے گلاس پر مرکوز تھیں اور اب ان کے ننھے منے میلے کچیلے پھولے پھولے ہاتھ درزوں کے بیچ سے وہ پلاسٹک کے گلاس اٹھالینا چاہتے تھے جو کچھ خالی تھے اور کچھ ادھ بھرے۔ جنہیں ملازم لڑکیاں مہمانوں کے فیضیاب ہونے کے بعد قناتوں کے کنارے ڈھیر کررہی تھیں۔ باہر سے غالباً کسی گارڈ کی نظر اُن پر پڑی تھی کہ جس کے نتیجے میں ایک بھگدڑ سی مچی، میلے کچیلے پیاسے ہاتھ ایک ایک کر کے پیچھے ہوئے اور اندھیروں میں گم ہوگئے۔ گھونٹ بھرتی صبا کے میٹھے دودھ میں تلخی سی گھل گئی۔ اُس نے ایک بے چینی میں اپنے اطراف میں نظر دوڑائی۔ سب مگن تھے حتیٰ کہ زاہدہ بھی، جہاں ڈانس مستی تھی کہ جس کے شوروغوغے میں اضافہ ہوگیا تھا۔ زاہدہ کے ساتھ بیٹھی موٹی مہمان بڑھ بڑھ کر تال دینے لگیں۔ پھولی افغانی روٹی جیسے ہاتھوں کی موٹی انگلیوں میں بڑی بڑی جڑاؤ انگوٹھیاں تھیں جن کی جگر مگر ایک دوسرے کو مات کررہی تھی۔

اُس نے ڈانس فلور پر آتی خواتین کی نئی ٹولی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ صبا نے خوشدلی سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ڈانس فلور کی طرف دیکھا کہ ڈیزائنرز کا کمالِ فن، اُن کی پوشاکوں میں دملکتا تھا۔ زریں پوشاکوں کے اوپر جڑاؤ، جھومر، ٹیکے اور ماتھا پٹیاں تھیں اور موٹی موٹی بانہوں میں سنہری چوڑیاں اپنی سرفرازی پر درخشاں تھیں۔ ہیئر اسپرے میں جکڑے ہیر اسٹائل داد طلب تھے کہ انہیں بیش قیمت نفیس ترین پھولوں کی جڑت نصیب ہوئی تھی۔ صبا نے سونے سے لدی عورتوں کو سرتاپا دیکھا اور سوچا شاید یہاں سونے کے پھول بنتے نہ ہوں گے ورنہ...... اِس کی سوچ ادھوری رہ گئی کہ نوٹوں کی گڈیوں کے انبار اٹھائے ملازم لڑکی کے ساتھ ثمینہ آگے بڑھیں اور ان کے اشارے پر وہ لڑکی نیلے اور نارنجی مائل بھورے نوٹ ان عورتوں پر نچھاور کرنے لگی۔ انداز کا پختہ پن اور روانی بتاتی تھی کہ یہ کام اس کے لیے نیا نہیں۔ مایا کے بہاؤ کی روانی نے ڈانس فلور پر ناچتی خواتین کے پیروں کی تھرک میں مزید بجلیاں بھردیں۔ وہ پیر جو جڑاؤ سینڈلز میں مقید تھے اور جن کے ہینڈمیڈ اَپر (Hand Made Upper) اتنے نفیس تھے کہ سنڈریلا اپنے سینڈل بھول جاتی تو سنڈریلا کے خوابوں جیسے تھرکتے سینڈلز کے گرد نوٹ بے جان لاشوں کی طرح پڑے تھے۔ اپنی بہتات میں...... کسی بے قرار تھرک کی زد میں آکر بکھرے کسی نوٹ میں ارتعاش پیدا ہوتا اور پھر وہ وہیں ساکت ہوجاتا۔ ایسے جیسے لاشوں کے درمیان ایک اور دھما کہ ہوجائے تو اس کے زور سے بکھرے انسانی اعضا میں حرکت آجائے کچھ لمحوں کے لیے اور پھر وہ ساکت ہوجائے فنا کے منظر میں فنا کی صورت......

دو اڑھائی گھنٹے گزر چکے تھے اور صبا اب اُکتا چکی تھی کان پھاڑتی موسیقی سے، ڈانس فلور پر بار بار بدلتی، ناچتی تھرکتی ٹولیوں سے اور واٹر فال کے منظر کی یکسانیت سے، زاہدہ نے اُس کی بے چینی بھری بوریت کو محسوس کیا تو بالکل اس کے پاس ہوتی بولی۔

''ہم بس ایک ڈیڑھ گھنٹہ اور رکیں گے پھر، پھر ہمیں تو واپس جانا ہی ہے۔''

''مم! آپ اپنے Relatives سے ملنے آئی تھیں، پر یہ لوگ تو بس ناچے چلے جارہے ہیں؟''

''ہاں! ان کے ایسے ہی Customs ہیں۔ میں ابھی کچھ دیر میں مل لوں گی سب سے، اوکے؟''

''اوکے!'' صبا پیچھے صوفے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور آنکھیں ناچتی ٹولیوں پر مرکوز کرتے ہوئے سوچنے لگی کہ ان باراتی عورتوں میں سے ایک عورت نے بھی جتنا زیور پہن رکھا ہے وہ کسی بھی بڑے شہر کی پوش لوکیلیٹی میں کم از کم ایک بنگلے کی مالیت کا تو ہوگا تو یہ لوگ......؟

بدلتی Song Beat میں ایک تازہ دم آتی ٹولی نے اس کے خیالات کا سلسلہ منقطع کیا۔ تازہ دم ٹولی ایک انتہائی فحش گانے پر ناچنے لگی۔ ''گرتی وی گلی رگلی...... '' اگلے بولوں میں گرتی کے گیلے اور لاچے کے ڈھیلے ہونے کا بار بار تذکرہ تھا۔ وڈیو والے سابقہ تنبیہہ کو پس پشت ڈالتے ہوئے آگے بڑھے اور فوٹو گرافرز کلوز اپ لینے لگے۔ اُبلتے جذبات پر نوٹوں کی گڈیوں میں بھی اُبال آ گیا۔ صبا زاہدہ کے کان کے پاس پوچھنے لگی۔

''مم! واٹس لاچہ؟''

''واٹ؟'' اتنا شور تھا کہ زاہدہ کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

''امی! لاچہ......لاچہ۔'' صبا چیخ کر بولی۔

''اوہ میرے خدا......'' زاہدہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولی۔

''Lacha Is An Old Traditional Dress Of Punjab''

(لاچہ پنجاب کا ایک قدیم روایتی لباس ہے)۔

''آئی سی۔'' صبا سر ہلاتے ہوئے بولی۔ مزید کچھ دیر اسی ہڑبونگ میں گزر گئی۔ تھوڑی دیر بعد نجانے کیا ہوا کے سب پیچھے دیکھنے لگے۔ وڈیو والے اور فوٹو گرافرز پیچھے لپکنے لگے اور پھر بہت سی لڑکیاں بھی۔ ''دلہن آ رہی ہے۔'' کسی کی آواز آئی تو صبا بھی پیچھے دیکھنے لگی۔

''انتہائی نفیس سلک اور شیفون کے پلین لباس میں، ہاتھوں میں بُو کے کا نفیس بوجھ اٹھائے فریحہ نمودار ہوئی۔ مہارت سے کیے گئے میک اپ اور سر پر ٹکے دوپٹے پر کسی نایاب کام کی ایسی جڑت تھی کہ آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی تھیں۔ دلہن اسٹیج تک پہنچی تو ساس نندوں کے ساتھ کھڑی خادماؤں نے اُس پر اتنے نوٹ نچھاور کیے کہ اسٹیج کا قالین چھپ گیا۔ سرخ مخملیں ڈبیہ سے ہیروں جڑی انگوٹھی نکال کر پری نما دُلہن کو پہنا دی گئی۔ انگوٹھی عام ہو کہ خاص بھلا نتھ کے بوجھ کو کم کر پاتی ہے؟ ایسی سوچ کی نہ کسی کو ضرورت تھی نہ خواہش...... وہاں تو درباری تھے اور سکہ رائج الوقت کے سب سے بڑے نوٹوں کی نچھاور۔ جن کو چشم ابرو کے اشارے پر خادمائیں سرخ کپڑے کے تھیلوں میں بھر رہی تھیں۔ گارڈز سے آنکھیں بچا کر پھر قناتوں سے چپکی، سبز، نیلی، بھوری پُر اشتیاق حسرت بھری آنکھیں تھیں جو درزوں سے چپکی تھیں۔ ان پھٹی پھٹی آنکھوں کی بھوک سے خوف آتا تھا پر ان کی طرف دیکھتا کون تھا؟

میوزک کی آنچ مدہم ہوتے ہوتے راکھ ہوئی اور کھانے کی پکار پڑنے لگی۔ سارے پنڈال کی عورتیں پیچھے لگی لمبی لمبی میزوں کی طرف لپکنے لگیں۔ کچھ دھکم پیل کم ہوئی تو زاہدہ اور صبا بھی کھانے کی میزوں تک پہنچیں جن کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک انواع و اقسام کے کھانے تھے۔ اتنے کھانے تھے کہ شمار سے باہر تھے۔ ساتھ کولڈ ڈرنکس اور فریش جوسز کی ورائٹی علیحدہ تھی۔ صبا کے لیے ثابت دُبنے خاصی دلچسپی لیے تھے جن کے کھلے بطنوں سے بھاپ اڑاتے چاول ڈالے جا رہے تھے اور گوشت کے بڑے بڑے پارچے اتارنے میں بیرے مدد کر رہے تھے۔ گز گز لمبی سیخوں پر لگے بٹیرے، فش، بار بی کیو ورائٹی کرسیاں سنبھال لینے والی

خواتین تک مستعدی سے پہنچائی جارہی تھی۔ صبا اور زاہدہ اپنی پلیٹیں اور کولڈ ڈرنک لے کر ایک طرف بیٹھ گئیں۔ دونوں ایک ہی بات سوچ رہی تھیں کہ یہ منگنی کا کھانا ہے کہ جسے دیکھ کر شاہی درباروں کے خوان بھی شرما جائیں۔

''انجلینا جولی ٹھیک ہی کہتی ہے مم! پاکستانی ضیافتوں کے بارے میں Its So Shameful کہ یہاں اتنی غربت......'' زاہدہ نے ایک رشتہ دار خاتون کو آتے دیکھ کر کھنکھار کر صبا کو ٹوکا...... درزوں سے چپکی لاتعداد، رنگ برنگی آنکھیں خیر کی منتظر تھیں ہنوز!

کھانوں کے پہاڑ اپنے اندر اتار کر اب سب چائے، کوفی، قہوے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ زاہدہ بھی قہوے کا کپ تھامے مختلف رشتہ داروں سے مل رہی تھی اور صبا کو بھی ملوا رہی تھی۔ ثمینہ پاس آئیں اور پوچھا۔

''کھانا ٹھیک سے کھایا ہے نا؟''

''جی! شکریہ۔'' صبا آہستہ سے بولی۔ ثمینہ اُسے پیار کرتی ہوئی بولیں۔

''سوٹ بہت اچھا لگ رہا ہے تم پر۔'' صبا نے پھر اُس کا شکریہ ادا کیا تو وہ بولیں۔

''شکریے کی کیا بات ہے۔ میں نے فریحہ کی تمام کزنز کے جوڑے بنوائے تھے تو تمہیں کیسے بھولتی؟ شکر ہے کہ ناپ ٹھیک ہے۔ زاہدہ نے بتایا تھا کہ فریحہ کے قد بت کی ہے۔'' صبا ہنسنے لگی۔ زاہدہ نے گھڑی پر نظر ڈالی اور کہا۔

''اب اجازت دو ثمینہ۔'' ثمینہ پیار سے بولیں۔

''جانا کیوں ہے؟ سب کے کمرے تیار ہیں۔ تم رات تو رُکو نہ...... اتنی دور سے آئی ہو اور صرف اتنی سی دیر کے لیے؟'' زاہدہ شکریہ ادا کرتی ہوئی بولی۔

''بابا کہاں رُکیں گے۔ جلدی گھبرا جاتے ہیں۔ اب نکلیں گے تو دو سوا دو گھنٹوں میں گھر پہنچ جائیں گے۔''

''میں تو چاہتی تھی کہ تم سب بھی رُکو۔ ابھی تو گانا ہنگامہ باقی ہے۔'' ابھی سب وہیں کھڑے تھے تو مرکزی دروازے سے چچا اور پھوپا قسم کے لوگ اندر آنے لگے اور زاہدہ کو پہچان کر باری باری سروں پر ہاتھ رکھنے لگے اور پھر پرانی باتیں، پرانی یادیں...... آدھا پونا گھنٹہ اور گزر گیا۔ سب دوبارہ جلد ملنے کے وعدے پر خدا حافظ کرنے لگے کہ زاہدہ جلدی میں لگتی تھیں۔ اندھیری پارکنگ میں گرتے پڑتے صبا اور زاہدہ اپنی گاڑی تک پہنچیں۔ وہاں افتخار احمد ثمینہ کے میاں و بلال اور افتخار احمد نے دونوں کو سب سے ملوایا۔ قریب ہی کم از کم پندرہ گاڑیوں کی مسلح گارڈ کھڑی تھی جن کے آگے ہُوٹر والی گاڑی تھی جس پر جگمگ جلتی بجھتی روشنیاں تھیں۔ افتخار احمد گاڑیوں کے قافلے کی طرف متوجہ ہوئے اور بلال سے پوچھنے لگے۔

''یہ کس کی گاڑیاں ہیں؟''

''اپنی عاصمی آئی ہوئی ہے نہ۔'' بلال کے تفاخر لہجے میں بہت محبت تھی کہنے لگے۔ ''نکلنے والی ہے وہ بھی بس...... لیں وہ آ ہی گئی۔'' بلال نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔ عاصمہ بلال تک پہنچی تو بلال زاہدہ کا تعارف کرواتے ہوئے بولا۔

''عاصمی انہیں پہچانا ہے؟ چاچی فردوس کی بیٹی ہیں اور یہ ان کی بیٹی صبا، یہ لوگ ڈنمارک سے آئی ہوئی ہیں۔'' اونچی لمبی چوڑی چکلی عاصمہ کے سرخ و سفید میک اپ زدہ چہرے پر ایک مصنوعی مسکراہٹ آئی اور بولی۔

''آپ خیریت سے ہیں؟''

''جی شکر ہے مالک کا۔'' زاہدہ انکساری سے

بولیں۔ بلال زاہدہ سے بولا۔

''عاصمی تو منسٹر ہے نہ آپ کو پتا ہی ہوگا۔ میاں بھی منسٹر ہیں پر...... اپوزیشن جماعت کے۔'' اِس بات پر ایک مشترکہ قہقہہ پڑا۔ عاصمہ کی فخریہ مسکراہٹ میں ایک اتراہٹ بھی شامل ہوگئی۔ عاصمہ جو ایک آؤٹ کلاس فرنچ ایکٹریس زیادہ اور سیاستدان کم لگ رہی تھی۔ دیگر خواتین کی نسبت قدرے کم کام والے بیج کلر کے کپڑے اور کندھوں پر شاہ فوطوس کی چادر پھیلائے تھی۔ برانڈڈ ہینڈ بیگ ایک سے دوسرے ہاتھ میں تھامتے ہوئے اُس نے ہوا سے ہلکے شیفون کے دوپٹے کو دوبارہ سر پر جمایا تو گوری سڈول کلائیوں میں سانپ کی شکل کے ہیروں جڑے برسلیٹ جگمگائے جن کی ذرق برق کے آگے تاج برطانیہ بھی ماند ہوتا۔ وہ مصنوعی مسکراہٹ سمیت سب سے رخصت لیتی روانہ ہوئی۔ چار کا حفاظتی دستہ مستعدی سے اُس کے گرد ہوا۔ مصنوعی باتوں کی گرد تو اس کے پلٹتے ہی پل بھر میں بیٹھ گئی۔ پیچھے...... تا دیر قیمتی کولون کی خوشبو ٹھہری تھی۔ بلال اُن سب کے گاڑی میں بیٹھنے تک شکریہ ادا کرتا رہا۔ ہُوٹر بجاتی گاڑی عاصمہ کی گاڑی کو حفاظتی جلو میں لیے تنگ راستوں سے نکل کر کشادہ سڑک کی طرف مڑ گئی۔ افتخار احمد کی گاڑی اُن سب گاڑیوں کے پیچھے پیچھے نکلتی مین روڈ تک آئی تو افتخار احمد نے ولید سے کہا۔

''میرے خیال میں جی ٹی روڈ سے واپس نکلتے ہیں۔''

''ہاں...... ہاں، رات بہت زیادہ ہوگئی ہے۔ موٹر وے تو اور بھی سنسان ہوگی۔'' زاہدہ نے افتخار احمد کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

''مم! ہمیں وہاں سے جلدی نکلنا چاہیے تھا۔''

''ہاں! میں تو جلد ہی نکلنا چاہ رہی تھی پر جب چاچا سلیمان وغیرہ آئے تو کچھ دیر رُکنا پڑا۔''

''آپ لوگ فنکشن کے دوران کیوں نہیں ملے؟'' صبا حیرت سے بولی۔

''اُدھر زنانہ، مردانہ سختی سے علیحدہ ہوتا ہے۔''

''آل رائیٹ! زنانہ مردانہ سختی سے علیحدہ ہیں پر بیہودہ گانے تو سب اکٹھے ہی سن رہے تھے۔ وہ فوٹو گرافرز، ویڈیو والے، کیٹرنگ والے اینڈ ڈرائیورز وہ سب بھی تو میل تھے۔ یہ کیسے ڈبل اسٹینڈرز ہیں مم کہ اپنے رشتہ داروں سے پردہ...... وہ بھی کھانے سے پہلے تک؟''

''وہ سب تو ورکرز تھے صبا!'' زاہدہ نے کھوکھلے سے لہجے میں کہا۔

''کم آن مم! آپ ہمیشہ پاکستانیوں کو ہی فیور کریں گی۔ آئی نو ان کے ڈبل اسٹینڈرز پر بھی۔'' صبا نے آنکھیں ترچھی کرتے ہوئے منہ بھی ترچھا کیا۔

''نہیں صبا، میں فیور نہیں کر رہی ہوں بس بتا رہی ہوں کہ یہاں ایسا ہی ہے۔''

''پھر یہاں ویسا ہی ہوگا۔'' صبا نے شانے اچکا کر کہا۔

''کیسا؟''

''جیسا ہو رہا ہے۔'' افتخار احمد نے پلٹ کر انہیں دیکھا۔ صبا نے گاڑی کی سیٹ سے ٹیک لگا کر ہیڈ فونز کانوں میں لگائے اور آنکھیں موند لیں۔ ولید نے شیشہ تھوڑا سا ترچھا کیا اور پیچھے، صبا پر ایک گہری نظر ڈالی۔

گاڑی شہر سے باہر نکلی تو خاموشی اور تاریکی میں ڈوبی سڑکیں سنسان تھیں۔ اطراف کی نیچی جھاڑیاں بھید بھرے سناٹوں میں ڈوبی تھیں۔ زاہدہ نے دل ہی دل میں سوچا کہ انہیں یا تو رات وہیں رُک جانا چاہیے تھا یا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اُٹھ آنا چاہیے تھا۔

زاہدہ نے کانوں سے ٹاپس اتارے اور دونوں ہاتھوں سے کڑے اُتار کر پرس میں رکھ لیے۔ دل عجیب سا ہو رہا تھا۔ سفر کو گھنٹہ ہو چلا تھا اور سڑک پر گاڑیاں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ اِس ایک گھنٹے میں صرف دو پرائیویٹ کاریں اور ایک ویگن گزری تھی اُسے اچھی طرح یاد تھا کہ پہلے رات گئے بھی سڑکوں پر ایسی وحشت نہیں ہوا کرتی تھی۔ چھوٹے چھوٹے کھوکھے جو اپنے اندر مکمل دوکان کا سامان رکھتے تھے رات بھر کھلے رہتے تھے، اُس نے ماندے دل سے سوچا اس بار بہت کچھ بدلا بدلا ہے ملکی حالات اور لوگوں کے رویے سمیت۔ زاہدہ کو خاموشی سے وحشت سی ہونے لگی۔ بابا شاید سو گئے ہیں اور صبا کو دیکھو...... یہ واپسی کے سفر میں خاموش کیوں ہو جاتی ہے؟ اندھیرے میں تیزی سے گزرتے مناظر نے جواب دینے کی زحمت نہ کی۔ سوتی رات میں جاگتی سڑک پر فاصلے عبور ہونے لگے۔ گاڑی اسلام آباد کی حدود میں داخل ہوئی تو زاہدہ نے سکھ کا سانس لیا۔

☆......☆......☆

فجر کی نماز کے بعد زاہدہ باہر لان میں چلی آئی اور ریلنگ کے ساتھ ساتھ چلتے کھلی شفاف فضا میں گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ کورنگ کے سبک پانیوں کے اوپر سرمئی دھند اتری تھی اور پانیوں سے پرے جنگل میں پرندوں کی ان گنت بولیوں کی گونج تھی۔ جہاں سے ابھرتی سفید کونجوں کی ڈار اپنی ترتیب کو منظم رکھے ذرا نیچی پرواز میں گزری۔ زاہدہ نے دھیرے دھیرے چلتے کچھ اور گہرے سانس لیے اور ہاتھ میں تھاما چائے کا کپ اور تسبیح آخری، اونچے ٹیرس گارڈن کی چھتری کے نیچے میز پر رکھ کر وہیں کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ یہاں آ کر روح کی جڑیں کتنی سیراب، کتنی شانت ہو جاتی ہیں۔ ایک ٹھنڈی سانس سوچ کے ساتھ ننھی ہوئی سینے سے بمشکل باہر ہوئی۔

اُسے پاکستان آئے چھ ماہ ہو چکے تھے اور ذہن تھا کہ دن بدن اُلجھے اُلجھاووں میں پھنستا چلا جا رہا تھا۔ اُس کا جی چاہتا وہ واپس پاکستان آ جائے کہ افتخار احمد مستقل ساتھ جانے کو رضا مند نہ ہوتے تھے۔ پر زاہدہ کیسے واپس آ سکتی تھی۔ راشد کے ساتھ وہ انتہائی ویل سیٹلڈ زندگی گزار رہی تھی۔ اُس نے دکھی ہوتے ہوئے سوچا وہاں سب کچھ ہے جاب، گھر، تعلیم، سکون اور سب سے بڑھ کر انسانیت! اچھی و بری باتیں تو ہر قوم میں ہوتی ہیں پر؟؟ یہاں؟؟ اب راشد اور صبا کیوں واپس آنے لگے۔"

زاہدہ نے ہولے سے چائے کا کپ اٹھایا اور اردگرد گھر کو ایسے غور سے دیکھنے لگی جیسے پہلی مرتبہ دیکھ رہی ہو۔ اُس نے سوچا کتنے پیار سے بنایا تھا امی اور بابا نے یہ گھر، جب ہم یہاں آئے تھے تو ہر طرف ویرانہ تھا۔ اتنا کہ سیلاب کے موسم میں رات کو پانی کے شور سے نیند اچاٹ ہو جایا کرتی تھی۔ پر کتنا امن اور سکون تھا۔ رات میں بھی واک کرتے میں اور امی کتنی کتنی دور نکل جایا کرتے تھے پر اب...... اب تو اس علاقے میں بھی ہر چار قدم پر گارڈ بیٹھا ہے اور تب بھی ہر وقت دھڑکا لگا ہے جان کے ساتھ...... کاش! بابا ہی ادھر اکیلے رہنے کی ضد نہ پکڑے رکھیں۔ دس بارہ برس تو گزر ہی گئے ہوں گے جب انکل سرخیل بابا کو دوسری شادی کے لیے کہتے تھے۔ پر تو یہ! گل برادری نے ایسے تھوتھو کی جیسے بابا نے ہر فیصلہ چھچھورا اور غلط کیا تھا۔ برادری کو تو مخالفت کا بہانہ چاہیے تھا۔ بابا اُن سب سے اتنے مختلف جو ہیں۔ کیا تھا اگر دو تنہا عمر دار لوگ نکاح کر کے نسبتاً آسان زندگی گزار لیں تو؟ اُف سمجھ نہیں آتی یہ ہم ایشینز والدین کو اور والدین اپنے بچوں کو ایسے تختی

سے کیوں Own کرتے ہیں کہ انفرادی تشخص تو فردِ واحد میں دکھائی ہی نہیں دیتا۔ ریت رواج کی سوشل پکچرز اتنی برائیٹ ہیں کہ قدیم اور بوجھل ہونے کے باوجود کسی کو اپنی بیڑیاں اضافی لگتی ہی نہیں۔ ہم روایتی بیڑیوں، ہتھکڑیوں اور آنکھوں پر چڑھے کھوپوں کے نسل در نسل اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ احساسِ زیاں تک نہیں۔ ملک کی آدھی آبادی صبح اُٹھ کر محض لہسن پیاز چھیلنے لگتی ہے۔ دولے شاہ کے چوہوں کے سر پر لوہے کا کنٹوپ ہوتا ہے اور ہماری عورتوں کے دماغوں پر 'ہانڈی' کی بندش...... وہ عورتیں جن کی اکثریت زندگی میں سونے کی چھ چوڑیاں بنانے کو اپنی معراج سمجھتی ہے۔ اِس احساس کے بغیر کے ہمارے پاس تو لباسِ جہالت کے سوا دوسرا کوئی جوڑا بھی نہیں۔ گھر گرہستی عورت کے خمیر میں گندھی ہے پر غلامی؟ کل تک ''تصویر'' کی مخالفت کرنے والے ملا آج مغرب کے ایجاد کردہ ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ پر بیٹھ بیٹھ کر فتوے داغتے ہیں۔ انہوں نے کبھی بحیثیت انسان عورت کے انفرادی تشخص کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی؟ انہیں کون بتائے اور کون سمجھائے کہ 'تسخیر کائنات' کے لیے جب دعوتِ فکر دی گئی ہے تو اس میں مرد اور عورت کی تشخیص نہیں ہے۔ پوری دنیا میں عورتیں ہر شعبہ زندگی میں کارہائے نمایاں سرانجام دے رہی ہیں۔ چائنا کی چاند پر جانے والی چار کی ٹیم میں ایک عورت ہے۔ اور اِدھر زمینی معاملات ہی نہیں سنبھالے جا رہے۔ اُدھر ملکی میڈیا، جس کے اسی سے نوے فیصد ڈرامے سسرال والوں پر فوکسڈ ہوتے ہیں۔ ہونہہ! پڑوسی ملک سے مستعار شدہ بدعتیں لے کر موجودہ اور آنے والی نسلوں کی عقل محدود سے محدود تر کرتے ہوئے مزید کنوئیں کا مینڈک بنا رہی ہیں، اور افسوس کے سب ان دو رشتوں پر فوکسڈ خوشی خوشی مینڈک بن رہے ہیں یہ جانے بغیر کہ جنگیں محض محاذوں پر ہی نہیں لڑی جاتیں۔ اپنی اقدار، وضع داریوں اور مثبت روایات کی بقاء کے لیے بھی نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ عورتیں ہی کیا، قومی بے حسی کا یہ عالم ہے کہ قبرستانوں کے مردے بھی شرما جائیں۔

زاہدہ طرح طرح کی سوچوں میں غرق بیٹھی تھی کہ مسجد کے لاؤڈ اسپیکر میں کچھ کھڑکھڑاہٹ ہوئی اور پھر قدرے مدہوش آواز نے اعلان کیا کہ قریبی گاؤں کے مولانا حمید الدین قضائے الٰہی سے وفات پاگئے ہیں۔ ان کی نماز جنازہ بعد عصر اسکول نمبر فلاں کے میدان نمبر فلاں میں رکھی گئی ہے۔ تمام اہلِ علاقہ......'' غالباً لائٹ چلی گئی تھی کہ اعلان ادھورا رہ گیا۔

زاہدہ نے فاتحہ پڑھ کر منہ پر ہاتھ پھیرے ہی تھے کہ لاؤڈ اسپیکر میں پھر کھڑکھڑاہٹ ہوئی اور پھر انڈین گانوں کی دھنوں پر نعتیں شروع ہوگئیں۔ ایک کے بعد ایک......لاؤڈ اسپیکر پر نوآموز نعت خواہوں کے ہاتھوں ایک محشر بپا تھا۔ زاہدہ نے سر جھٹکا اور سوچا یہ مذہبی دہشت گردی کی بھی کوئی ایک قسم تو نہیں دنیا میں۔ پھر ہولے سے بھی کوئی بات منہ سے نکل جائے تو یہ طعنہ سنو کہ چار دن گوروں کے دیس میں گزار کران کی مثالیں نہ دیا کرو۔''

گھر کے پیچھے چرچ ہے اور جو کبھی بھولے سے بھی اتنی آواز باہر آئی ہو کہ پتا چلے کہ اندر سیکڑوں لوگوں نے اپنی مذہبی رسومات ادا کی ہیں۔ ہماری ساری اعلیٰ اقدار و تہذیب و آداب کو مغربی اقوام اپنائے بیٹھے ہیں اور اِدھر احساسِ زیاں تک نہیں۔ کیسا مادر پدر آزاد معاشرہ ہوگیا ہے کہ جیسے سب جانور ہوں انسانی شکل میں...... نہیں! تنظیم تو جانوروں میں بھی ہوتی ہے۔ زاہدہ تو جیسے آج ایسی ہی تمام تر سوچوں کے ہاتھوں مکمل مفلوج ہوئی بیٹھی

تھی۔ نہ بابا کی طرف سے تسلی تھی۔ نہ اب اس گھر کی طرف سے اور نہ اس ملک کی طرف سے، جس کی مٹی کی خوشبو کے آگے دنیا کی ہر نعمت ہیچ لگتی ہے۔

''میڈم جی! آپ ذرا اندر بیٹھیں گی، ادھر صفائی کرتا ہوں آج۔ مٹی باہر گرے گا۔'' سوچوں کے اندھے کنوئیں میں گھری زاہدہ چونکی اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے ولید کی طرف دیکھنے لگی۔

''کیا؟'' زاہدہ نے ولید کی طرف دیکھا اور پھر اس کے کمرے کی طرف۔

''میں ابھی صفائی کرتا ہوں۔ ڈسٹ آئے گا باہر۔'' زاہدہ نے کرسی پیچھے کرتے ہوئے سوچا بھلا اتنے چھوٹے سے کمرے سے کتنی سی مٹی باہر آجائے گی۔ پر وہ خاموش رہی پھر ذرا آگے آتی ہوئی بولی ''یہ دروازوں تک آتی بوگن ویلا تو کٹواؤ، مطلب یہ جھاڑیاں۔''

''صاحب کو پھول بہت اچھے لگتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے، اچھے تو لگتے ہیں پر دونوں سرونٹ رومز کی چھتوں پر جنگل بن گیا ہے۔ یہ سب کانٹے دار جھاڑیاں ہیں۔ مالی آئے تو اسے چھنٹواؤ اگر خود نہیں صاف کرتے تو۔''

''جی!'' ولید آہستہ سے بولا۔ زاہدہ تیز تیز قدموں سے اندر آئی اور چپکے قدموں افتخار احمد کے کمرے کی کھڑکیاں بند کرنے لگی۔ جو طبیعت ناساز ہونے پر نیند کی دوائیاں لے کر سو رہے تھے۔ نوآموز نعت خواہوں کے ہاتھوں لاؤڈ اسپیکر پر محشر بپا تھا پھر سے! زاہدہ لاؤنج میں آئی تو ولید اندر آیا اور بولا۔

''یہ آپ موبائل اور تسبیح باہر بھول آئی تھیں۔''

''اوہ! اچھا ٹھیک ہے۔ میز پر رکھ دو۔ شکریہ!'' کچن میں کھڑی ملازمہ زاہدہ سے آکر کھانے کے بارے میں پوچھنے لگی۔

افتخار احمد قدرے دیر سے اٹھے تو طبیعت بہت بہتر تھی۔ وہ ناشتے اور ہلکی پھلکی ورزش کے بعد تکیے سے ٹیک لگائے ٹیلی ویژن دیکھ رہے تھے۔ صبا کمرے میں داخل ہوئی تو ایک نظر افتخار احمد کی طرف دیکھا اور پھر ٹیلی ویژن کی طرف اور پیار سے بولی۔

''بابا پلیز! یہ ہولناک خبریں دیکھنا بند کر دیں۔ یہاں کا Limitless میڈیا تو ہر وقت ہولناک خبریں دے رہا ہوتا ہے۔'' صبا نے ریموٹ اٹھا کر چینل بدلا۔ افتخار احمد بولے۔

''جو ہو رہا ہے ہمارے ملک میں وہی دکھا رہے ہیں نا؟''

''ٹھیک ہے بابا، پر جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب کا سب تو نہیں دکھانا چاہیے۔ ہر ادارے کی کچھ ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ اسپتالوں میں روزانہ آپریشن ہوتے ہیں۔ آپریشن تھیٹر کے دروازے کھلے نہیں رکھے جاتے۔'' افتخار احمد ہنسنے لگے۔ صبا صوفے پر بیٹھتی بولی۔

''رئیلی بابا! یہاں ٹیلی ویژن بہت اسٹرونگ Impact رکھتا ہے۔ But Most Of Them Are Paid۔ پھر سب اینکرز عقلِ کل بنے بیٹھے ہیں۔ نہ کسی فرد کی کوئی Respect ہے اور نہ کسی ادارے کی۔'' افتخار احمد ہولے سے بولے۔

''کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو۔'' پھر ٹی وی اسکرین پر نظریں جماتے بولے۔ ''دیکھو پاکستانی جھنڈے، جھنڈیوں کی کیسی بے حرمتی ہو رہی ہے گلی کوچوں میں۔ کوئی ایک بھی نہیں کہ جو کہے کہ چودہ اگست کے بعد ان جھنڈے جھنڈیوں کو احترام سے لپیٹ کر رکھ دیں۔ کیسے بے حس ہو گئے ہیں سب، ابھی...... ابھی تو ایک صدی بھی نہیں گزری۔ آزادی ہے کہ سب، سب کچھ بھلا ہی بیٹھے۔ ہم نے...... میں نے۔ ہم سب نے بہت قربانیاں دی تھیں۔ اُدھر، سرحد پار

جیل کاٹی تھی پر اپنے سبز ہلالی پرچم کو زمین پر نہیں گرنے دیا تھا۔ ہائے! یہ جذبہ بڑی ظالم چیز ہے۔'' افتخار احمد کی بجھتی نیلی آنکھوں میں نمی کی پرچھائیاں تیرنے لگیں بولے۔

''سب کہتے ہیں پاکستان نے ہمیں کیا دیا؟ میں پوچھتا ہوں تم نے پاکستان کو کیا دیا؟''

''بابا آپ نے جیل کاٹی تھی؟ یُو مین پریژن؟'' صبا نے حیرت ہونٹوں میں دباتے ہوئے دھیمی مسکراہٹ سے پوچھا۔

''ہاں! اُدھر سن چھیالیس سے ہی بات بے بات تناؤ اور کشیدگی بہت بڑھ گئی تھی۔ ملک کے حالات بہت کشیدہ ہوتے جارہے تھے اور سننے میں یہی آتا تھا کہ دیگر علاقوں میں چھوٹے موٹے فساد ہورہے ہیں۔ ہم بچے بھی سُنے سنائے جھگڑوں کے پس منظر میں اُلجھ جایا کرتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے بارہ اگست کی دوپہر نندو نے مجھے چھوٹے سے کانے پر لگا منا سا پاکستان کا جھنڈا لا کر دیا۔ میں اُسے اپنی سائیکل پر لگا کر سائیکل لہرا لہرا کر چلا رہا تھا کہ دو ہندو لڑکے ہاکیاں تھامے سائیکلوں پر آئے اور ہاکی مار کر میرا جھنڈا نیچے گرانے لگے۔ میں تڑپ کر سائیکل سے اترا اور جھنڈے کو سیدھا کیا۔ وہ دونوں لڑکے جو مجھ سے دو تین سال ہی بڑے ہوں گے، پلٹ کر آئے اور پھر جھنڈے کے درپے ہوئے۔ پتا نہیں بس کہ پھر کیا ہوا۔ نندو، میں، وہ سب آپس میں گتھم گتھا ہوگئے۔ کچھ بڑے لڑکے بھی شامل ہوگئے۔ ڈنڈوں ہاکیوں کا برملا استعمال ہوا۔ شہر بھر کے حالات کشیدہ تھے۔ نجانے کب عقب سے دو گورکھے آئے اور مجھے اور دو دوسرے مسلم لڑکوں کو گاڑی میں ڈال کر لے گئے۔ پہلے حوالات اور پھر بچوں کی جیل میں منتقل کر دیا۔ اُسی شام شہر میں جا بجا آگ لگنے کی خبریں آنے لگیں۔ محلے بھر میں شور مچا تو گھر والوں کو بھی خبر ہوگئی کہ دوپہر میں کھیل کے میدان میں ہونے والے جھگڑے میں، میں بھی شامل تھا۔ باپ مرحوم، رشتے دار دور اُفتادہ شہروں میں، شام ڈھلے بھائی جواد کھڑے تھے ملاقات کو چاچا ہرنام سنگھ کے ساتھ۔ سُرخ متورم آنکھیں اور اذیت سے بگڑے چہرے کے نقوش...... میں زار و قطار روئے چلا جارہا تھا۔ اِس افتاد سے ہراساں اور بھائی جواد سے نظریں چراتا۔ قدرے شرمندہ کہ...... بھائی جواد تو بٹوارے کے قائل نہ تھے۔'' افتخار احمد کی بھرائی آواز میں دُکھ ہی دکھ تھا۔

''آپ کے بھائی نہیں چاہتے تھے کہ پاکستان بنے؟'' صبا نے افتخار احمد کے پیچھے تکیہ ٹھیک کرتے ہوئے پوچھا۔

''چاہنے نہ چاہنے کا تو پتا نہیں کہ اُس وقت، ہمارے زمانے میں بڑوں سے بڑے فاصلے رکھے جاتے تھے، وہ جوانمرد بس ایک ہی بات کہتا تھا کہ میں قائد کے ساتھ ہوں پر...... پُرکھوں کی قبروں کو چھوڑ کر جانے کو من نہیں مانتا۔ جب سے حالات تیزی سے بگڑنے پر آئے تھے وہ روز قبرستان جانے لگے تھے اور جو کبھی میں بھولے بھٹکے ساتھ ہوتا تو منچلے بچے کی سوچ بھی ساتھ ساتھ مچلتی۔ میں سوچتا چلو بابا کی، چاچا کی قبر چھوڑنے کا افسوس تو ہوگا پر یہ تو اللہ جانے کس کس کی قبر پر سوکھے چاول اور پھول بکھیرنے چلے آتے ہیں۔ اور...... اور باقی سب بھی تو چھوڑ کر جارہے ہیں اپنے پیاروں کی قبریں۔ کوئی اکا دُکا ہی تھے بھائی جواد جیسے، پر تھے! اپنی ذات میں گم، گہری سوچوں میں غرق، قبرستان سے گھر آتے تو پورے گھر میں مارے مارے پھرتے۔ کبھی چھت پر، کبھی پر چھتی میں اور آدھی رات کو اٹھتے تو پچھلے باغ کے دروازے کی کنڈی آہستگی سے کھلنے کی آواز آتی۔ اُدھر اندھیرے باغ میں بیٹھے رہتے۔ کبھی مالی

کے کمرے میں رکھا ریڈیو آن کرتے تو دھیمے سروں کا یہ گیت سناٹوں کو چمٹ کر رونے لگتا۔

''وہاں کون ہے تیرا۔ مصحفی جائے گا کہاں......''

اس گیت میں کچھ ایسا درد، ایسا فسوں تھا جو جکڑ لیتا تھا۔ میں خوامخواہ تکیے میں منہ دے کر رونے لگتا کیونکہ مجھے لگتا تھا کہ بھائی جواد رو رہے ہیں اور ہمارا پورا باغ بھی......اپنے سرسبز اندھیروں سمیت رو رہا ہے۔ بلک بلک کر، ہمارا پچھلا باغ بڑا عجیب سا تھا۔ باہر سے آنے والوں کو تو اس کا پتا ہی نہ چلتا تھا۔ ٹھہرو میں تمہیں تفصیل سے بتاتا ہوں۔''

افتخار احمد کے چہرے پر بچوں کا سا اشتیاق جگمگایا تو صبا کے چہرے پر ایک محبت بھری مسکراہٹ اُتری وہ ان کے ساتھ تکیے پر ٹیک لگا کر بیٹھی تو افتخار احمد کی دھندلی، تھکی آنکھوں میں ایک روشنی سی جگمگائی۔ وہ دھیرے سے بولے۔

''ہمارے علاقے میں اکثریت تو ہندوؤں کی تھی پر مسلمان اور سکھ بھی بہت تھے۔ چھوٹی سڑک پر ایک تنور تھا۔ ایک لالہ بنسی لال کی دودھ جلیبی کی دوکان تھی۔ اسی سڑک پر اندر گلی مڑتی تھی جس گلی کے باہر اونچا بیضوی مضبوط لکڑی کا پھاٹک تھا۔ عشاء کے بعد بڑا پھاٹک بند ہو جاتا اور چھوٹا پھاٹک کھلا رہتا۔ دس بارہ گھر تھے گلی میں اور پہلا گھر ہمارا تھا۔ دو پختہ سیڑھیاں، ڈیوڑھی پھر لمبا صحن جس کے داہنے ہاتھ باغ تھا جس میں بہت سی سبزیاں لگی رہتی تھیں۔ سامنے چھتا برآمدہ تھا جس کے چاروں گرد انگور کی پرائی بیلیں تھیں۔ چھتا برآمدہ سمجھتی ہو؟ کوورڈ ورانڈہ! وہیں ہماری دادی کی نماز کی چوکی تھی۔ جب سے ہوش سنبھالا چوکی وہیں دیکھی۔ چوکی بھی اور چوکی پر براجمان بھاری بھر کم دادی بھی جنہیں ہم ''بے جی'' کہتے تھے۔ اسی چھتے برآمدے میں چھوٹا باورچی خانہ تھا۔ مٹی کا چولہا، گرد چار چوکیاں تھیں انہی میں سے ایک چوکی پر بے بے بیٹھی کام کرتی اور کرواتی تھیں۔ صبح کے وقت اُدھر کونے میں پیڑھی پر دھوپ پڑتی تو وہ رُخ موڑ کر دوپٹے کو سر پر ڈھیر کیے نہ ختم ہونے والے کاموں میں جتی رہتیں۔ سمجھو، بے بے کا پایۂ تخت وہ چوکی تھی۔ مغرب پر جب چھوٹے تنور میں روٹیاں لگ رہی ہوتیں تو وہ گاہے بہ گاہے روٹیاں لگانے والی پر نظر ڈالتے ہانڈیوں کے نیچے سلگتے اپلوں پر نظریں جمائے اللہ جانے کیا سوچتی رہتیں۔ بابا کی وفات کے بعد اُن پر ایک ایسی چپ اتری تھی کہ اُن کو بولتے ہم نے کم ہی سُنا تھا۔ اب سوچتا ہوں بے بے کا بھاری بھر کم لفظ اُن کی عمر کے ساتھ میل نہ کھاتا تھا پر بے بے ہو، اماں ہو، اُم ہو، مورے ہو کہ مم! یہ سب ایک عمر کی ہوتی ہیں۔ تو اُس چھتے برآمدے میں......'' افتخار احمد نے ایک گہری لمبی سانس لی اور آنکھوں میں تھرکتی نمی کو حلق میں اتارتے ہوئے بولے۔

''تو اُس چھتے برآمدے میں پیچھے چوڑی دیوار میں دو کمروں کے دروازے تھے اور ایک لکڑی کا چھوٹا سا بھاری پھاٹک تھا۔ اس پھاٹک کو جو کوئی کھولتا تو پیچھے ہرا بھرا پھلوں سے لدا باغ دیکھ کر حیران رہ جاتا۔ میں نے اپنے گھر کے علاوہ کبھی کہیں بند دیواروں کے پیچھے باغ نہیں دیکھا۔ اب سوچتا ہوں کہ ہوسکتا ہے گھر بننے سے پہلے زمین اکٹھی ہو اور کیونکہ یہ گھر بھی ہماری ضرورت سے کافی بڑا تھا تو بابا نے وقتی طور پر درخت لگوا دیے ہوں کہ جب ضرورت پڑی تو بیچ کی دیوار گرا کر گھر بڑا کر لیں گے یا یہ کہ ایک اور گھر بنا لیں گے۔ پر بیٹا یہ پتا نہیں ہوتا کہ ارادے کا قسمت سے تعلق کتنا ہوگا۔'' افتخار احمد کی آواز بھرائی تھی۔

''میں اور نندو دوپہر بھر اسی باغ میں کھیلا کرتے

اور کبھی تھک جاتے تو مالی بابا کے پاس بیٹھ کر کہانیاں سننے لگتے۔ پتا نہیں مالی بابا کا کیا مذہب تھا۔ بس یہ یاد ہے کہ میں اور نندو نیند کے کچے تھے۔ کہانیاں سنتے اُن کی چار پائی پر سو جاتے اور اٹھتے، تو اپنے بستروں پر ہوتے۔ نندو کا گھر تو ذرا فاصلے پر تھا لیکن دن کے کوئی چار چکر میری طرف ضرور ہی لگا تا تھا۔''

''نندو دوست تھا آپ کا؟ فنی نیم!'' صبا ہنستے ہوئے بولی۔

''ہاں! میرا جگری دوست، چاچا ہرنام سنگھ کا بیٹا۔'' افتخار احمد بولے تو ان کے لہجے میں ایسے پیار اُمنڈتا تھا جیسے نندو اور اُس کی جانثاری اب تک ساتھ ہوں۔ ''ہائے! چاچا ہرنام سنگھ...... اُن کے واہگرو ان کو اونچے درجے دیں۔ پوری عمر راکھ ہو جانے کے باوجود میرے ذہن پر ان کی دستک جیسے جمی رکھی ہے۔ بابا کے، بے جی کے انتقال کے بعد علی الصبح ہمارے دروازے پر چھڑی سے ایک مخصوص دستک ہوتی اور پھر ایک پُر شفقت گھمبیر آواز ابھرتی۔ ''بھرجائی! سب خیر ہے نہ واہگرو کی کرپا سے؟'' اور بے بے چولہے چوکے کے آگے بیٹھی بیٹھی جواباً کہتیں۔ ''سب خیر ہے بھا ہرنام، اللہ کے فضل سے۔'' افتخار احمد ایک طویل سانس کھینچ کر بولے۔

''وہ سکھ چین کے دن جو ہم نے بچپن میں گزارے۔ اُس بھائی چارے اُس ماحول کا تو اس وقت کے لوگ سوچ بھی نہیں سکتے۔''

''اِس کا مطلب آپ اپنے پرانے گھر کو بہت یاد کرتے ہیں۔'' صبا پیار سے بولی۔

''پہلے نہیں، اب! شاید عمر زیادہ ہو جانے کی وجہ سے یا شاید؟'' مقامی، قومی، بین الاقوامی سطح پر مسلسل پیچھے سے پیچھے جاتے ہوئے، بہت سے سوال اٹھتے ہیں جن کے جواب نہیں ملتے۔ بس اپنے اندر اٹھتے انہی سوالوں کی فصلیں کاٹتے کاٹتے تھک سا گیا ہوں۔'' افتخار احمد نے ایک گہری تھکاوٹ سے کہا۔ ایسی تھکاوٹ جو سوچ کے بوسیدہ تھرتھراتے جالوں کے پار اترتی ہے۔

''بابا! لیکن آپ نے یہ نہیں بتایا کہ پھر آپ کے بھائی کیسے مانے پاکستان آنے پر؟'' افتخار احمد کی بجھتی نیلگوں آنکھیں سامنے دیوار کے ایک نقطے پر جیسے جم کر رہ گئیں۔

''وہ نہیں آئے......وہ نہیں آ سکے 13 اگست کی شام کانتی لال کے بڑے بھائی نے انہیں اپنے ہی گھر کی دہلیز پر پے در پے خنجر کے وار کر کے شہید کر دیا تھا اور...... بے بے کو بھی وہیں چوکی پر بیٹھے بیٹھے۔''

''اوہ نو! بابا آئی ایم سوری......سو سوری۔'' صبا انتہائی دُکھ سے بولی۔ ولید دوائیوں کا لفافہ لے کر آیا اور افتخار احمد کو بقایا پیسے لوٹانے لگا۔ زاہدہ کمرے میں داخل ہوتیں تو بولیں۔

''واہ جی واہ! آج تو بڑی باتیں ہو رہی ہیں نانا اور نواسی میں۔''

''ہاں! بابا بہت ڈپریس ہیں کنٹری کے حالات سے۔'' صبا ٹیکسٹ پڑھتی ہوئی بولی۔ زاہدہ کہنے لگیں۔

''اسی لیے تو کہتی ہوں بابا ہمارے ساتھ چلیں۔ یہاں اب پہلے والی بات نہیں۔ آپ کا اکیلے رُکنا ہرگز مناسب نہیں۔'' افتخار احمد نے ایک لمبی سانس بھری اور کہا۔

''اگر یہاں سے چلے جانا مسئلوں کا حل ہوتا تو کب کا جا چکا ہوتا۔''

''بابا پلیز! آپ کے یہاں رہنے سے بھی تو مسئلے مسائل حل نہیں ہو جائیں گے نہ۔'' افتخار احمد مسکراتے ہوئے بولے۔

''لگتا ہے بھائی جواد کی روح آ گئی ہے میرے اندر، وطن کی مٹی اور تمہاری ماں کی قبر کی مٹی راستہ روکتی ہے میرا اور......'' افتخار احمد چونک کر ٹی وی کی طرف متوجہ ہوئے جہاں ایک پروگرام کی ریپیٹ ٹیلی کاسٹ میں جنوبی وزیرستان میں آئی ایس آئی کے ایک مشہور کرنل کو شوٹ کرنے کی ویڈیو ری پلے کر کر کے دکھائی جا رہی تھی۔ پیچھے لا الہ الا اللہ کی آواز تھی اور کچھ سفاک! آگے سینے تک بڑھی سفید داڑھی میں ان گنت گولیاں سینے پر کھاتا، پتھروں پر لڑھکتا بوڑھا تھا اور...... اور بھی بہت کچھ تھا منظر نامے میں۔ پاک فوجی یونیفارم میں بغیر سر کے دھڑ تھا۔ دوسری طرف دور کھمبے پر اونچا لٹکا فقط سر تھا جس میں کوئے ٹھونگیں مار رہے تھے۔ کھمبے پر لٹکی دوسری ادھڑی گردن کے بیچ سیون اپ کی دو بوتلیں تھیں۔ بے خوفی، بے حسی کی خاک میں ملی کچھ سبز فوجی ٹوپیاں تھیں اور...... اور انسانی کھوپڑیوں کا Live فٹ بال تھا۔ ایف سی اور پولیس کے جوانوں کی آنکھوں میں ایسڈ ڈالنے کا منفرد شغل تھا۔

''استغفر اللہ! صبا بند و کرو ٹی وی۔'' زاہدہ کی ہیجانی آواز نے کمرے میں چھائے سکوتِ مرگ کو توڑا۔ زاہدہ نے جگ میں سے پانی گلاس میں انڈیلا اور افتخار احمد کو پلایا جن کا چہرہ اس سفاکیت پر تمتما رہا تھا۔ وہ کچھ بولنا چاہتے تھے پر شدتِ دُکھ سے آواز نہ نکلتی تھی۔

''بابا اٹھیں! چلیں باہر کھلی فضا میں بیٹھیں۔'' زاہدہ خود شاک کی کیفیت میں تھیں، انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنے تھوڑے سے وقفے میں انہوں نے کیا کیا دیکھ لیا۔

''یہ...... یہ کر رہے ہیں، ہماری پاک افواج اور فورسز کے ساتھ؟ خون کی ندیاں عبور کر کے پہنچا تھا۔ یہاں...... اکیلا! محاورتاً۔'' سننا بہت عام سا لگتا ہے پر جنہوں نے اپنوں کو گنوایا ہو، اپنے گھر بار چھوڑے ہوں اُن سے......'' شدتِ جذبات سے افتخار احمد کی آواز ٹوٹنے لگی۔

''بابا پلیز! خود کو سنبھالیں۔'' افتخار احمد کو تسلی دینے والی اور حوصلہ بڑھانے والی زاہدہ اور خود صبا اس بربریت اور سفاکی کے ان مناظر سے بہت ہی مغموم تھیں۔ افتخار احمد مایوسی سے بولے۔

''جب بھی ہشت گردوں کے پاس سے اسلحہ پکڑا جاتا ہے تو اس پر میڈ ان انڈیا اور یو ایس کی مہریں لگی ہوتی ہیں پر یہ آئی ایم ایف کے بوجھ تلے دبے ہمارے عیاش حکمران کسی ایک کا نام لیتے بھی کپکپاتے ہیں اور اُن کی عیاشیوں کے طفیل مقروض قوم کی اکثریت اپنے بنیادی اخراجات پورے کرنے کو دیہاڑی دار مزدور کی طرح جتی رہتی ہے اور باقی چور اور ڈاکو بننے پر مجبور کر دی گئی ہے۔ افسوس! بارہا منتخب ہونے والا وزیراعظم اپنی کاروباری وسعتوں کی غرض مندی میں اس حد تک خوشامدی ہو جاتا ہے کہ 'تاج محل' والوں سے یہ تک کہنے میں عار محسوس نہیں کرتا کہ 'ہم تو ایک ہی ہیں۔ ہمارے کھانے، ہمارے گانے، ہمارا کلچر ہماری زبان سب ایک ہے۔ یہ تو بس درمیان میں ایک سرحدی لکیر کھنچی ہے۔'' یہ کہہ کر گویا جناح رحمتہ کی Two Nation Theory کو (دوقومی نظریہ) ایک جملے سے ہی رد کر دیتا ہے۔ جنہوں نے وقت سے کچھ نہیں سیکھا وہ اپنے دُشمنوں سے کیا سیکھیں گے۔ فقید المثال ہے اُن کے حکمرانوں کا سادہ طرزِ زندگی، ہمارا صدر تو سوچ بھی نہ کہ وہ کھلی فضا میں برگد کے درخت کے نیچے ایک عام سی کرسی میز پر بیٹھ کر امورِ مملکت نمٹائے۔''

''صاحب جی! بریگیڈیئر سرخیل صاحب آئے ہیں۔'' ولید نے دروازے پر ہلکی سی دستک دیتے

ہوئے بتایا۔

''اوہ گڈ! ولید تم انکل کو باہر ہی بٹھاؤ ہم لوگ بھی بس باہر ہی آ رہے ہیں۔ بابا! باہر موسم بہت اچھا ہو رہا ہے۔ میں کھانا باہر لگواتی ہوں۔''

باہر گہری گھٹائیں چھائی تھیں اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے بتاتے تھے کہ کہیں قرب وجوار میں ہی بارش ہوئی ہے۔ دریا کے پانی بادلوں کے رنگ میں رنگے تھے اور رنگ بدلتے مناظر بڑے اچھوتے اور دلآویز تھے۔ زاہدہ قریبی چھتریوں کے نیچے ملازمہ سے کھانا لگواتے ہوئے گاہے بگاہے افتخار احمد پر نظر ڈالتی رہتی۔ بریگیڈیئر سرخیل کے آنے سے ماحول بدلا تو تھا پر افتخار احمد کے چہرے پر تناؤ کے واضح اثرات تھے جو اگلے گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں بہتر ہوئے۔

کھانے کے بعد سب موسم اور قہوے سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ ملازمہ نے آ کر بتایا کہ ''رادو نے'' آئی ہے۔ زاہدہ بولی۔ ''اُسے بٹھاؤ، کھانا چائے پوچھو میں قہوہ ختم کر کے آتی ہوں۔''

''بیٹے کی شادی کا بلاوا دینے آئی ہوگی۔ کہہ کر گئی تھی کہ پہلی سے پہلے چکر لگائے گی۔ اُس نے شادی طے کر دی ہے نہ بیٹے کی۔'' افتخار احمد بولے۔

''وہ تو چھوٹا ہی ہوگا ابھی، شادی کے قابل کہاں ہوگا؟'' زاہدہ حیرت سے بولی۔

''بس، تمہیں پتا ہی ہیں ان کے ریت رواج، کہتی ہے کہ اسکول جاتی ہوں تو واپس آ کر گھر کا کام نہیں ہوتا۔ بہو ہوگی تو پیچھے گھر سنبھال لیا کرے گی۔''

''اپنی آسانی کے لیے ایک بچے کی شادی کر دے گی؟ عجیب حالات ہیں یہاں تو بھئی۔'' زاہدہ زیرِ لب بولی اور قہوہ ختم کرتے ہوئے بریگیڈیئر سرخیل سے کہنے لگی۔ ''انکل ذرا اچھے اچھے Jokes سنائیں بابا کو۔ آج مورال بہت ڈاؤن رہا ہے ان کا۔''

''ڈونٹ وری زاہدہ، ابھی تھوڑی دیر میں ینگ مین سیٹ ہو جائے گا۔'' اونچے لمبے ہنس مکھ بریگیڈیئر سرخیل نے پُریقین لہجے میں کہا۔ کرسی سے اٹھتی زاہدہ کو افتخار احمد نے اشارے سے پاس بلایا اور بولے۔

''میری سائیڈ ٹیبل کے اندر ایک نیلا لفافہ ہے۔ اُس پر رادو نے کا نام لکھا ہے وہ اسے میری طرف سے دے دینا۔''

''ٹھیک ہے بابا۔'' زاہدہ اندر چلی گئی اور پھر دس پندرہ منٹ میں ہی باہر آ گئی تو افتخار احمد نے پوچھا۔

''رادو نے چلی گئی؟ اتنی جلدی؟''

''جی! آج اُسے جلدی تھی۔ کھانا بھی نہیں کھایا، صرف قہوہ پی کر اُٹھ گئی۔ کہہ رہی تھی کہ اُسے بہت کام ہے۔ اِس جمعے کو تو شادی ہے۔ بہت بار تاکید کر کے گئی ہے کہ سب نے آنا ہے شادی پر۔'' صبا باہر آئی اور زاہدہ کے پاس بیٹھتے ہوئے کیتلی سے قہوہ انڈیلنے لگی۔ زاہدہ صبا سے بولیں۔

''جمعے کو رادو نے کے بیٹے کی شادی ہے۔ میں ہفتے کو ولیمے پر جانا چاہتی ہوں۔ ولید بابا کے پاس رُک جائے گا۔ تم لے چلو گی ڈرائیو کر کے، زیادہ دور نہیں ہے اس کا گھر۔''

''کون رادو نے مم!''

''امی کی پرانی ملازمہ کی بیٹی ہے۔ بابا کے پاس اب تک مستقل آتی رہتی ہے۔ عرصے بعد مجھے دیکھا تو بہت جذباتی ہو رہی تھی۔ کہتی تھی ضرور آنا۔''

''ٹھیک ہے، چلے چلیں گے۔ پر مم! یہاں صرف شادیوں کے انوی ٹیشن کیوں ہوتے ہیں۔ فار اے چینج، لوگ ویسے بھی کوئی گیٹ ٹوگیدر کر لیا کریں۔''

''ہوتے ہیں گیٹ ٹو گیدر بھی۔'' زاہدہ قدرے جھلا کر بولیں تو بریگیڈیئر سرخیل ہنستے ہوئے بولے۔

''پر وہ صرف اپر کلاس ہی افورڈ کر سکتی ہے۔ باقی کوئی جھیل پر نہانے چلا جاتا ہے۔ کوئی سمندر پر یا باہر کھانا کھالیا۔ پکنک، ون ڈش پارٹی اب ان کے رواج بھی بہت ہی کم ہوگئے ہیں۔''

''That is True''۔ افتخار احمد مسکراتے ہوئے بولے۔ زاہدہ اچانک چونک کر بولیں۔

''ہفتے کو تو رومیشا نے نہیں آنا تھا؟''

''جی آنا ہے پر وہ تو لیٹ نائٹ آئے گی۔''

''اچھا چلو ٹھیک ہے۔ ولید ایئر پورٹ چلا جائے گا۔ رادو نے تو بارہ بجے دن کا کہہ کر گئی ہے۔ ہم ڈیڑھ دو گھنٹے رُک کر آجائیں گے۔ وہ خوش ہوجائے گی۔''

''ٹھیک ہے اماں! ضرور چلیں گے۔'' صبا پیار سے بولی۔ اچانک تیز ہوا کا جھونکا آیا اور ساتھ ہی موٹی موٹی بارش کی بوندیں گرنے لگیں۔

''میرا خیال ہے اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔''

سب اکٹھے کرسیوں سے اٹھے۔ بریگیڈیئر سرخیل افتخار احمد کی وہیل چیئر چلانے لگے۔ اور زاہدہ اور صبا جلدی جلدی میز کے برتن سمیٹ کر رکھنے لگیں۔

تیز ہواؤں کی زد میں آ کر دریا کے پانی پتھروں سے ٹکراتے جھاگ اُڑاتے۔ اگلی منزلوں کی جانب گامزن تھے۔

☆......☆......☆

صبا کو اس شہر کی سرمئی سڑکوں پر گاڑی چلانا اچھا لگتا تھا جو بارش کے ہلکے سے چھینٹے سے بھی سیاہ ہوجاتیں تو اردگرد کا سبزہ مزید پُر بہار ہوجاتا۔ ان سرمئی سڑکوں سے گزرتے، آگے ہی آگے جاتے اور پارلیمنٹ کو پیچھے چھوڑتے بائیں طرف دربار کی حدود شروع ہوجاتیں۔ ان کے ''دربار'' کی جنہوں نے اس شہر کے ہونے اور آنے والی صدیوں میں ''اسلام کا قلعہ'' بننے کی پیش گوئی کی تھی۔ اُس وقت ...... کہ جب یہاں صرف اور صرف گھنے جنگل تھے اور ''چُور پور'' کو ''نُور پور'' ہونے میں کچھ وقت درکار تھا۔ تو اُس دربار کی لامحدود، روحانی حدود سے آگے بائیں ہاتھ کھلے چوڑے میدان تھے۔ جن کے پیچھے ایوانِ اقتدار تک کی نارسائیاں تھیں۔ ایوان اور میدان کے درمیان فاصلہ زیادہ نہ تھا۔ لیکن قیامت کی دوری تھی۔ یوں کہ ایکڑوں اراضی پر مشتمل ایوانوں کے پچھلی طرف میلوں میل پکی پگڈنڈیاں تھیں جن پر شاہوں کے صحت مند پالتو جانور پستے اور چلغوزوں کے مربے کھاتے۔ خود کو مزید تندرست وتوانا رکھنے کی کوشش میں تیز سے تیز قدم اٹھاتے تھے۔ جہاں نایاب درختوں کے وسیع سلسلے تھے اور پھولوں کے بھی، جن کے پچھلی سمتوں میں اتنا کچھ نایاب تھا۔ اس عمارت کے اندر نایابیوں کے کیسے کیسے شاہکار ہوں گے؟ اُدھر...... میدانوں میں گھاس چرتی گائیوں کے درمیان، جانوروں سے ذرا ہی اوپر کی سطح پر پھرتے، نکمے، بے روزگار، نوجوانوں، جوانوں کے اندر یہ سوالات کلبلاتے تو ہوں گے؟

ان مناظر کے عادی ہوجانے کے باوجود، کہیں اندر، دور رات کی سیاہی میں لت پت ایسے سوالات ابھرتے تو ہوں گے کسی ایک سینے کے پنجر میں؟

شاہ و گدا کے بیچ حائل ان کھلے میدانوں اور چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں سے ایک کچا راستہ اونچے ٹیلے کی سمت بڑھتا تھا۔ جس پر کچھ گائے بکریاں اور چھوٹے بڑے لڑکے اکٹھے چڑھ رہے تھے۔ زاہدہ اُسی سمت غور سے دیکھتی، صبا سے بولی۔

''صبا! ادھر ہی کہیں گاڑی روک لو میں رادو نے

کوفون کرتی ہوں۔'' زاہدہ نے موبائل کان سے لگایا اور بولی۔

''السلام وعلیکم! ہاں رادو نے ہم یہاں پہنچ تو گئے ہیں پر سامنے اوپر اب بہت سے گھر بن گئے ہیں، مجھے کچھ اندازہ نہیں ہورہا تمہارے گھر کا۔''

''میں خان کو بھیجتا ہوں۔'' رادو نے کی آواز میں مسرت بھری تھی۔ وہی خوشی اور مسرت جو کسی بھی ماں کے لہجے میں آج ہونی چاہیے تھی۔ صبا نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے میدان سے ذرا آگے جا کر گوبروں کے ذخیرے سے ذرا پرے ٹیلے کے پاس گاڑی لگادی اور گاڑی سے اُتر کر ارد گرد نظر ڈالی۔ دھوپ اور بادلوں کی آنکھ مچولی میں سرکنڈوں کے بیچ بیٹھے فارغ لڑکوں اور آدمیوں کی ٹولیاں منہ اٹھا کر صبا اور زاہدہ کو حیرت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ اس چراہ گاہ میں بھلا ان عورتوں کا کیا کام؟

تھوڑی ہی دیر میں دو پٹھان بچے صاف ستھرے، نئے قمیض شلواروں میں ملبوس تیز تیز چلتے پاس آن کھڑے ہوئے۔ اوپر ٹیلے پر کھڑی رادو نے ہاتھ ہلا کر ان کے ساتھ آنے کے اشارے کر رہی تھی۔

''اُدھر اوپر جانا ہے۔'' بڑا لڑکا سلام کے بعد بولا۔

''چلو۔'' زاہدہ ان کے سر پر باری باری ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ زاہدہ اور صبا دونوں لڑکوں کے پیچھے چلتی اونچے ٹیلے سے بائیں ہاتھ موڑ مڑتی ایک تنگ سی گلی میں داخل ہوگئیں۔ گلی چھوٹے چھوٹے کچے مکانوں پر مشتمل تھی۔ جہاں کھلی نالیاں غلاظتوں سے اَٹی پڑی تھیں جن میں برف سے اُجلی بطخیں چونچ بھر بھر کے رغبت سے کچھ کھا رہی تھیں۔ اسی گلی کے آخر میں تھوڑی سی کچی جگہ پر تین چار چار پائیاں اور درجن بھر لال کرسیاں تھیں جن پر نئے قمیض شلواروں میں ملبوس کچھ آدمی بیٹھے تھے۔ بائیں ہاتھ ہی چھوٹے سے مکان کے اوپر رنگ برنگی جھنڈیاں کھلی ہوا میں لہرا رہی تھیں۔ جس کا خستہ حال دروازہ ویسے کے اعزاز میں چوپٹ کھلا تھا۔ اندر مختصر کچے صحن میں دو چار پائیاں رنگ برنگے ریشمی لباسوں میں ملبوس عورتوں سے بھری تھیں۔ رادو نے کے ساتھ ساتھ زاہدہ اور صبا کو دروازے پر آتا دیکھ کر دو تین بھاری بھرکم عورتیں چار پائی سے اٹھیں اور بولیں۔

''راذا، راذا ڈیرہ خوشمالاشم داتلونہ'' (آؤ، آؤ بڑی خوشی ہوئی تمہارے آنے سے) اور ساتھ ہی پُر جوش استقبال کے طور پر زاہدہ اور صبا کو باری باری گلے لگاتے ہوئے رُخساروں پر دائیں بائیں بوسے دیے۔ سب خوش تھے۔ رادو نے بھی۔

آتشی گلابی ستی کرن لگے دوپٹے کو سر پر جماتے ہوئے رادو نے کے کھنچے ہوئے کمزور چہرے پر مسکراہٹ تھی پر منہ سے تقریباً باہر لٹکتا اکلوتا ٹیڑھا دانت مسکراہٹ کو پُر تفاخر بنانے میں تقریباً ناکام تھا۔ عورتوں نے زاہدہ اور صبا کو دو مختصر کمروں کے گھر میں، نسبتاً چھوٹے کمرے کی طرف دھکیل دیا۔ کمرے میں صرف ڈبل بیڈ تھا جس پر سیج بنی تھی بلکہ تنی تھی ایسے کہ جھلمل کرنوں اور بستیوں میں کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ لمحہ بھر کو پائنتی پر بیٹھی زاہدہ نے ماحول بھانپتے ہی کہا۔

''جہاں سب بیٹھے ہیں وہیں ہم بھی بیٹھیں گے۔'' صبا بھی یہ سنتے ہی سرخ ریشمی چادر پڑے بستر سے یکا یک اٹھی اور بولی۔

''جی! جہاں سب ہیں ہم بھی وہیں بیٹھیں گے۔ اِس کمرے میں بیٹھنا اچھا نہیں لگ رہا۔'' ایک موٹی عورت بولی۔

''نہ، نہ دل تاکے نا التا خوتول پادر یانو ناست

دی۔'' (نہیں، نہیں یہیں بیٹھو وہاں تو سب نیچے دریوں پر بیٹھے ہیں) اتنے میں رادو نے دو نیم اندھے دیسی کانچ کے گلاسوں میں جعلی پیپسی لیے سیج کی لڑیاں پرے کرتے ہوئے وہیں بیٹھنے پر اصرار کرنے لگی۔ زاہدہ نے نرمی سے دوبارہ دوسرے کمرے میں بیٹھنے پر اصرار کیا تو چاروں عورتیں بادل نخواستہ بمشکل دروازے کے ایک طرف ہوئیں اور راستہ دیا۔ ساتھ والے کمرے میں ٹھسا ٹھس عورتیں اِن دونوں کو دیکھ کر کمرے میں جگہ بنانے لگیں۔ جہاں تازہ چونا پھری دیوار کے ایک طرف دو ٹرنک تھے اور دوسری طرف دیوار کی چھت تک لگے بستر تھے۔ نیچے فرش پر بچھی دری پر قورمے، پلاؤ کی بڑی بڑی طشتریاں پڑی تھیں۔ کچھ لوگ کھانا کھا رہے تھے اور کچھ کے آگے ابھی لگایا جا رہا تھا۔ اسی شور اور ہنگامے میں ایک چھوٹا بچہ اتری جوتیوں کے بالکل قریب مہارت سے لپٹی چادر میں بے سدھ پڑا سو رہا تھا۔ سب حاضرین زاہدہ اور صبا کو آنکھیں پھاڑے دیکھ رہے تھے۔ رادو نے ایک دبلی پتلی گٹھڑی سی بنی لڑکی کو لوگوں کے بیچ سے اٹھایا اور بولی۔

''دمخکیے شاہ دوتیا سلام اوکا۔'' (ان کو سلام کرو آگے ہوکر) وہ دُلہن تھی۔ درمیانہ سا قد، گوری دمکتی رنگت، جو ناکافی خوراک کے باعث پیلاہٹ لیے تھی۔ سُنہری سبز آنکھوں میں چمک لیے ماتھے پر آرٹیفیشل ٹیکہ تھا۔ گلے میں چاندی کا ایک ہار، سرخ نگوں سے مزین کانچ کی سرخ چوڑیوں سے دونوں کلائیاں بھری تھیں اور چہرے پر رقم گہری معصومیت تھی جو ننگ بھوک افلاس سے قطع نظر، اس وقت بہت خوش تھی۔ اسے سرخ و سبز لباس اور کندھوں پر ڈالی گئی تِلے والی سرخ چادر نے جیسے معصومیت کو ایک گٹھڑی کی شکل میں باندھ رکھا تھا۔ زاہدہ نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے اُسے ایک لفافہ تھمایا۔ اُس نے رادو نے کی طرف دیکھا اور اس کے اثباتی اشارے کے بعد مہندی لگے ہاتھوں سے سخت گولڈن پرس کھولا اور اس میں رکھ دیا۔ اس لمحے اُس نے دھیرے سے آنکھیں اٹھا کر صبا کی طرف دیکھا اور ہولے سے مسکرائی۔ صبا بولی۔

''میں تمہاری تصویر کھینچوں؟'' دلہن بغیر کوئی جواب دیے تازہ چونا پھری دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہوگئی۔ صبا نے آگے ہوکر اُس کا ٹیکہ سیدھا کیا ایک دو تصویریں لیں اور بولی۔

''اب دولہا کے ساتھ بھی تو تصویریں بنوالو۔'' اُس نے شرما کر منہ پرے کیا تو اردگرد تصویر کھینچنے کے انتظار میں رُکی عورتیں آپس میں کچھ مذاق کرکے ہنسنے لگیں۔ صبا کے کچھ نہ سمجھنے پر ایک عورت بدقت اُردو میں بولی۔

''دولہا شرمائے گا اندر آتے ہوئے۔''

''اچھا! وہ اپنی بیوی، اپنے رشتہ داروں کے پاس آتے ہوئے کیوں شرمائے گا؟''

''میم صاحب بس شرمائے گا۔'' صبا کو جواب ہضم تو نہیں ہوا پر وہ دیوار کے ساتھ لگ کر خاموش کھڑی ہوگئی جہاں زاہدہ کے پاس ایک نحیف بڑھیا کھڑی کچھ گریہ و آزاری کر رہی تھی۔ ایک ڈنڈے پر اپنے وجود کو سہارا دیے۔ اس کے چہرے پر جھریوں کا جال تھا۔ زاہدہ کے کچھ کہنے پر اُس بڑھیا نے پلٹ کر صبا کی طرف دیکھا تو صبا کو اُس کی نیلی آنکھوں میں نوعمر بچی کی سی معصومیت دکھائی دی۔ ہراساں معصومیت! بالکل اُس افغان بچی شربت گل سے ملتی جلتی...... جسے برسوں پہلے مغربی میڈیا چھاپ رہا تھا، مجبوری کی تصویر! لاکھوں ڈالر کے عوض؟ کیا بُرا سودا تھا؟

رادو نے ایک بڑے سے تھال میں چاول اور دوسرے ہاتھ میں سالن کا ڈونگا اٹھائے اندر آئی اور

عورتوں کو مزید پرے دیوار کے ساتھ ہونے کا کہتے ہوئے اکڑے ہوئے پلاسٹک کو سیدھا کیا اور کھانا اُس پر رکھا۔ زاہدہ اور صبا کو کھانے کے پاس بٹھالیا اور خود پھر باہر دیگوں پر چلی گئی۔ بوڑھی شربت گل پلیٹیں اٹھا کر دینے لگی تو صبا نے انہیں منع کیا۔

''یہ رادو نے کی ماں ہے۔ امی کے پاس یہ آیا کرتی تھی۔'' صبا نے اُسے سلام کیا تو وہ سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دینے لگی۔ اُس کی نیلی آنکھیں مہربان تھیں اور صبا کی نانی کے ساتھ گزرا پُرسکون آسودہ وقت نمی بن کر تھر تھراتا تھا۔ وہ زاہدہ کے ساتھ پرانی باتیں بھی کرتی جاتی اور چاولوں کو ہتھیلی میں دبا دبا کر پوپلے منہ میں ڈالتی جاتی۔ کھانے کے بعد رادو نے سب میں قہوہ بانٹتی رہی۔ اتنے میں باہر سے کچھ مہمان عورتوں کا ریلا اندر آیا۔ کمرہ کچھ اور تنگ ہو گیا۔ اپنے ڈنڈے کے زور پر اٹھتی بوڑھی شربت گل نے زاہدہ کو باہر بیٹھنے کا کہا۔ زاہدہ اٹھتے ہوئے بولیں۔

''بس اب نکلتے ہیں ہم لوگ بھی، آپ رادو نے کو بلا دو۔'' زاہدہ نے صبا کو ساتھ لیا اور باہر صحن میں نکل آئی جہاں کھلے کچن کو اوپر اور دائیں بائیں چٹائیاں لگا کر موسموں کو شکست دینے کی ادنیٰ سی کوشش تھی۔ کچے چولہوں سے اُمنڈتا سیاہ دھواں آنکھوں کو سرخ کرتا تھا۔ زاہدہ نے ایک تاسف کی نظر پورے گھر پر ڈالی۔ جہاں قرض کے بوجھ میں ڈوبی سیج تھی۔ کھلے صحن میں دیگیں تھیں، دہی کے کونڈے تھے۔ رنگیلے پایوں والی چارپائیاں تھیں جن پر بیٹھے بوجھ دو چار دنوں میں یہاں سے اٹھ جانے تھے پر اس قرض کے بوجھ کو اتارنے میں رادو نے کے کم از کم اگلے پانچ سال تو ضرور گروی ہونے چلے تھے۔ چپڑاسن کی قلیل تنخواہ میں کیا بن سکتا ہے؟ کچن سے نکلتی رادو نے نئے دوپٹے سے ہاتھ صاف کرتی، سوچ میں ڈوبی زاہدہ تک پہنچی اور جوش و خروش سے شکریہ ادا کرنے لگی۔ دروازے میں کھڑا نوعمر دولہا جو مقامی ویگن میں کلینر تھا۔ چادر کو کندھے پر پھیلاتا قریب ہوا تو رادو نے بولی۔

''میڈم کو نیچے گاڑی تک چھوڑ آؤ، تم نیچے چلو میں آتا ہوں۔''

اُسے اچانک خیال آیا تو وہ افتخار احمد کے لیے کچھ کھانا ڈالنے کچن میں واپس آ گئی۔ زاہدہ اور صبا دولہے کے ساتھ ساتھ چلتی ٹیلے سے نیچے اُتر آئیں۔ دولہے کے ساتھ اُس کے دونوں چھوٹے بھائی بھی چل رہے تھے۔ جن کے گھٹے ہوئے سروں پر نئی نکور ٹوپیاں سختی سے جمی تھیں۔ رادو نے ہاتھ میں دو چھوٹے دیگچے اٹھائے ساتھ چلنے لگی اور زاہدہ کے لاکھ منع کرنے کے باوجود اُس نے کھانا گاڑی میں رکھا۔ زاہدہ نے خدا حافظ کرتے ہوئے دونوں بچوں کے سر پر ہاتھ رکھا تو رادو نے بولی۔

''اب یہ کل سے مدرسے جائے گی۔ دو ہفتے سے گھر بیٹھی ہے۔ قاری صیب کا فون آتا ہے بار بار...... سبق یاد نہیں تو ڈرتی ہے۔''

''کیوں؟ سبق کیوں یاد نہیں چھوٹے اسد کو؟'' زاہدہ نے ہینڈ بیگ گاڑی میں رکھتے ہوئے پیار سے پوچھا۔ اسد کے پیلے زرد مدقوق گالوں پر آنسوؤں کی بہتی لڑیاں شاید صرف پوچھے جانے کی منتظر تھیں۔

''نہیں، نہیں روتے نہیں ہیں۔'' زاہدہ نے جھک کر اُسے پیار کرتے ہوئے کہا۔ اُس کی نئی چھوٹی سی چادر چاولوں کے تیل میں ڈوبی تیل کی باس سے مہک رہی تھی۔ زاہدہ نے دیکھا چادر کی سلوٹ میں دو بوٹیاں اور تھوڑے سے چاول سینے سے لگے تھے۔ صحن میں دیگیں ہونے کے باوجود اکثر بھوک سے واسطہ پڑنے والے پیٹ نے اُس بچے کو بے یقین بنا رکھا تھا۔ وہ حقیقت پسند ہو گیا تھا۔ اُسے دیگوں پر نہیں اُن مٹھی بھر چاولوں پر اعتبار باقی تھا۔ جونئی چادر

کی سلوٹ میں مہارت سے رکھے ہوئے تھے۔ زاہدہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور بولی۔

''اسد! تم آنا بھائی کے ساتھ میں تمہیں سارے سبق یاد کروادوں گی۔ پھر تو تم مولوی صاحب سے نہیں ڈرو گے نہ؟'' اسد کی گیلی آنکھوں اور ننھے ہونٹوں پر مسکراہٹ اُتری جب اُس نے اثبات میں سر ہلایا تو ہلکی پھلکی بوندا باندی شروع ہو گئی اور کھلے میدانوں میں تیز ہوائیں ایک وحشت میں ہوتی۔ سامنے ذرا فاصلے پر اونچے ایوانوں کے پیچھے زرد ہوتا سورج بادل کے کسی ٹکڑے سے آنکھ بچاتا تھوڑا شوخ ہوتا دم بھر کو جگمگاتا تو ایوانوں میں روشن ان گنت روشنیوں کے آگے ماند پڑتا خود سے کسی گھٹا کے ٹکڑے میں جا منہ چھپاتا۔ صبا نے گاڑی موڑی اور شیشے چڑھا لیے باہر ہوائیں کچھ طوفانی ہو چلی تھیں۔ جن میں کچھ چھوٹے چھوٹے بچے ہوا کے مخالف رُخ پر دوڑیں لگانے لگے تھے۔ زاہدہ نے مڑتی گاڑی سے پیچھے دیکھا۔ ٹیلے کے پیچھے لوگوں سے بھرا گھر لوڈشیڈنگ کے ہاتھوں شام کے دھندلکوں میں گم ہوتا جارہا تھا۔ شام سے پہلے، جہاں بھیگی جھنڈیاں منہ بسورے، منہ زور ہواؤں میں تیزی سے پھڑ پھڑا رہی تھیں۔ اور پیچھے...... ذرا ہی فاصلے پر معاً اونچا سبز جھنڈا عجیب لاتعلق اور بیزار سا تھا۔

☆......☆......☆

سیدھی سڑک ایک چھوٹے سے موڑ سے بائیں ہاتھ مڑی اور پھر سامنے کا پرسحر منظر دم بخود کرنے کو کافی تھا۔ سرکنڈوں کے وسیع میدانوں کے بیچ گھری جھیل کے سرسبز پانی ہوا کے ساتھ ایک مسرور بہاؤ میں تھے۔ جھیل کنارے بہت سی بندھی کشتیاں لہروں کے بہاؤ پر ہلکورے لے رہی تھیں۔ جھیل کے بیچ میں ایک ٹیلا اپنی تنہائی کے جزیرے میں آباد ایک تیقن سے ایستادہ تھا ایک اونچے ٹنڈ منڈ درخت کی بھوری شاخوں سمیت کہ جن پر دو بڑے سفید پرندے ایک دوسرے سے بے خبر گیان میں مستغرق تھے۔

''اوہ! یہ سب کتنا پُرسکون ہے۔ خوبصورت تو ہے ہی۔'' رومیشا نے ایک لمبا گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ گوری رنگت پر سبز آنکھوں سمیت اپنے اونچے لمبے قد سے وہ پختون نژاد کم اور فارنر زیادہ لگتی تھی۔ دو تین ممالک سے ہوتی ہوئی وہ رات ہی پاکستان آئی تھی اور کیونکہ پہلی مرتبہ آئی تھی تو اپنے ماں باپ کے وطن کو بانہیں پھیلا کر ملنا چاہتی تھی۔ اُسے اسلام آباد اور کراچی میں کچھ کام نمٹانے تھے اور پھر چارسدہ کے دور افتادہ گاؤں جانا تھا۔ وہ گاؤں! جس کے فراق میں اس کے ماں باپ سر شام اُداس ہوا کرتے تھے۔ زندگی میں جدید ترین سہولتیں میسر ہونے کے باوجود۔

''صبا! کشتی میں بیٹھیں؟'' رومیشا نے اشتیاق سے پوچھا۔

''ہاں! کیوں نہیں۔'' کشتی والے ان دونوں کو اپنی طرف آتا دیکھ کر میم صاحب اِدھر...... میم صاحب اِدھر کی تکرار شروع کردی۔ رومیشا اُس کشتی میں بیٹھنا چاہ رہی تھی جس کے پینٹ کی شوخ سرخی اُسے دیگر کشتیوں سے ممتاز کررہی تھی۔ ولید نے بوڑھے ملاح سے معاملہ چکایا تو صبا اور رومیشا تیزی سے قریبی چٹان پر چڑھیں اور کشتی میں قدم رکھے تو جھیل کے سینے میں ارتعاش اٹھے۔ دونوں وزن کو برابر رکھتے ہوئے بیٹھ گئیں تو کشتی والے نے چپو کھونٹے سے کھینچے۔ رومیشا صبا سے بولی۔

''ہم اُس اکیلے درخت کے پاس سے گزریں گے؟''

''گزر جاتے ہیں۔'' صبا یہ کہتے ہوئے ملاح سے مخاطب ہوئی اور بولی۔

''بابا جی! اُس درخت کے پاس سے گزرنا ہے۔اچھا!''

''اچھا، اچھا۔'' بابا سفید سر ہلاتا ہوا بولا۔ خاموش فضا کی سرگوشیوں میں چپو کی آواز روح میں سکون بن کر اُتر رہی تھی۔ سبز پانی گہرائی کی طرف گہرے سبز ہو چلے تھے۔ بیچ جھیل میں پہنچ کر بابا مڑا اور چپو ایک طرف رکھے ہوئے موٹر بوٹ کا انجن آن کردیا۔ بھدی گڑگڑاہٹ سے سکون کے ماتھے پر شکنیں نمودار ہوئیں اور گیان میں ڈوبے سفید پرندوں نے ہڑبڑا کر بے سمت اڑان بھرتے ہوئے درخت کے گرد بے مقصد چکر لگانے شروع کردیے۔

''اُف! بابے نے تو رومینس کا بیڑہ غرق کردیا۔'' صبا ڈولتی، ڈگمگاتی انجن کے شور میں بابے کے سر پر پہنچی اور بولی۔

''بابا جی! موٹر بند کردو۔ چاہے چھوٹا چکر لگواؤ، پر چپو...... چپو چلاؤ۔'' بابے نے حیرت سے باچھیں پھاڑیں اور سمجھ گیا...... سمجھ گیا قسم کے تاثرات دیتے ہوئے موٹر بند کردی۔ صبا واپس آئی تو رویشا ہنستے ہوئے بولی۔

''شکر، سکون ہوگیا۔ صبا! ہم کسی چاندنی رات میں آئیں اِدھر، جیسے جرمنی میں ہم سب لڑکیوں نے بوٹ پر رات گزاری تھی۔''

''رویشا باجی یہ جرمنی نہیں پاکستان ہے اور آپ پہلی بار اِدھر آئی ہیں۔'' رویشا کھلکھلا کر ہنس پڑی اور بولی۔

''نیچر میں کتنا سکون ہوتا ہے۔ میرا تو دل چاہ رہا ہے یہیں کسی کنارے پر خیمہ لگالوں۔''

''دل تو میرا ابھی یہی چاہتا ہے پر یہاں کیمپنگ کے حوالے سے کوئی Awerness نہیں ہے۔ بلکہ مم بتاتی ہیں کہ اُن کے وقت میں لوگوں میں نسبتاً شعور زیادہ تھا اور یہاں مختلف جگہوں پر کیمپنگ سائٹس بنی ہوئی تھیں۔'' وہ دونوں باتیں کرتی ہوئی گاڑی تک پہنچیں تو ولید نے مستعدی سے گاڑی کے دروازے کھولے۔ رویشا بیٹھتے ہوئے بولی۔

''میں کراچی سے آجاؤں تو میرے جانے سے پہلے اِدھر آئیں گے مون لائٹ نائٹ میں۔ اتنا قریب تو ہے گھر کہ......'' صبا ہنسے ہوئے بولی۔

''پھر وہی بات، بات گھر سے قریب ہونے کی نہیں ہے۔ یہاں سکیورٹی کے حوالے سے صورت حال کافی ناقص ہے اور دوسرے کلچر......''

''اوہ گاڈ! یہ گاؤدی ہوگا نہ ساتھ۔'' رویشا قدرے پست لہجے میں بولی پر ولید نے سن لیا اور بولا۔

''ٹھیک ہے میڈم! جب آنا ہو آجائیں اپنا ہے سارا علاقہ۔'' رویشا نے جواباً بھنویں ترچھی کرتے ہوئے صبا کی طرف دیکھا۔ جیسے ولید کے پُراعتماد، فخریہ لہجے پر رشک کررہی ہو۔

☆......☆......☆

کچھ ہی دن گزرے ہوں گے کہ باہر بیل ہوئی ولید نے بتایا کہ دو بچے ہیں اور آپ کو بلاتے ہیں۔ وہ زاہدہ سے مخاطب تھا۔ زاہدہ باہر نکلیں تو دیکھا کہ اپنی اپنی کتابیں سینے سے لگائے عظیم خان اور اسد کھڑے تھے۔ پرانے ملگجے پر صاف ستھرے ٹخنوں سے اونچے قمیض شلوار اور گُتھے ہوئے سروں پر براق ٹوپیاں۔ زاہدہ کو دیکھ کر دونوں کے چہروں پر پیار بھری مسکراہٹ آئی اور چھوٹے اسد کی آنکھیں مسکرانے لگیں۔

''آؤ، آؤ اندر آجاؤ شاباش! بابا دیکھیں تو سہی بڑے خاص مہمان آئے ہیں۔''

''اوہو! چھوٹے چھوٹے مہمان آئے ہیں۔ بڑی خوشی ہوئی جناب آپ دونوں کے آنے سے۔

آؤ بھئی آؤ ادھر بیٹھو، میں ذرا برآمدے میں بیٹھوں گا کچھ دیر۔ زاہدہ! بچوں کی خاطر تواضع کرو۔''

''جی۔'' صبا کو اندر آتا دیکھ کر زاہدہ بولی میں صرف دس منٹ میں کچن کا کام ختم کر کے آتی ہوں۔ بابا کے لیے سوپ رکھا تھا۔ تم ذرا اِدھر ہی رُکنا۔ ولید بازار گیا ہے۔ بابا نے آواز دی تو چلی جانا۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔'' صبا صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ چھوٹا لڑکا اسد جھجکتے ہوئے ذرا پاس آیا اور بولا۔

''اے باجی! اِس ٹی وی پر فلم آتا ہے؟'' صبا نے ایک ٹک ٹھہر کر ذرا حیرت سے دیکھا اور پوچھا۔

''فلمیں دیکھتے ہو؟'' دونوں نے اکٹھے اثبات میں سر ہلایا۔ صبا نرمی سے بولی۔

''ابھی تو پڑھنے آئے ہو نہ، پڑھ لو گے تو پھر فلم دیکھنا۔'' اسد کی آنکھوں میں گہری مایوسی اُتری جس نے اس کے شگفتہ چہرے کو پل بھر میں لٹکا دیا۔ وہ دونوں سامنے اسکرین پر کعبہ شریف کے گرد ہوتے طواف کو سپاٹ ساکت آنکھوں سے گھورے جا رہے تھے۔ ایسے ہی صبا نے پوچھا۔

''یہ کیا ہے؟ معلوم ہے تمہیں؟'' دونوں خاموش رہے۔ صبا دھیمے سے بولی۔

''یہ جس کے گرد لوگ چکر لگا رہے ہیں یہ کیا ہے؟'' دونوں خاموش رہے پھر اکٹھے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''پتا نہیں ہے۔'' صبا کو خاصی حیرت ہوئی کیوں کہ عظیم خان تو اچھا خاصا سمجھدار تھا۔ صبا نے اپنی حیرت پر غلبہ پاتے ہوئے کہا۔

''یہ کعبہ شریف ہے۔ اِسے اللہ کا گھر کہتے ہیں۔'' دونوں ہنوز سپاٹ آنکھوں سے تکے جا رہے تھے۔ صبا نے ایک لمحہ سوچا پھر بولی۔

''عید کا...... بڑی عید کا پتا ہے نا؟''

''جی...... جی بڑی عید پر سب گوشت کھاتے ہیں۔ ام تو مدرسے کی طرف سے گھر گھر جاتی ہے گوشت اکٹھا کرتی ہے۔''

''بڑی عید سے پہلے حج ہوتا ہے۔ حج سب سے بڑی عبادت ہے۔ جیسے نماز عبادت ہے نہ ویسے۔ ابھی یہ لوگ جو اس کے گرد طواف کر رہے ہیں، یہ عمرہ کر رہے ہیں۔ حج کرنا، عمرہ کرنا اس کے گرد طواف کرنا۔ اسے صرف دیکھنا بھی عبادت ہے۔'' صبا آرام آرام سے بولی۔

''جی! ٹھیک ہے یہ ختم ہوگا تو یہاں فلم لگے گا؟'' اسد نے بے صبری سے پوچھا۔

''یہاں فلم نہیں لگے گی۔ فلم دوسرے چینل پر لگتی ہے۔ بچوں کو ویسے بھی فلمیں نہیں دیکھنی چاہیں۔''

''ام رات کو دو فلمیں، گھر لے کر جاتی ہے۔ جب مدرسے سے آتی ہے۔'' عظیم خان شرما شرما کر بولا۔

''فلموں کی باتیں چھوڑو۔ کہا ہے نہ بچوں کو فلمیں نہیں دیکھنی چاہیں۔ لاؤ ذرا اپنی کتابیں دو۔'' عظیم خان اور اسد نے کتابیں اور دو ڈائیریاں صبا کو پکڑائیں۔ اتنے میں زاہدہ اندر آئیں اور بولیں۔

''آؤ بچو! پہلے کھانا کھا لو آ کر، پھر آپ کا سبق دیکھتے ہیں۔'' دونوں سر پر ٹوپیاں برابر بٹھاتے ہوئے تیز تیز قدموں سے زاہدہ کے پیچھے نکل گئے۔ صبا نے ڈائری کھولی۔ وہ غالباً پہلے کسی بڑے بچے کے زیر استعمال رہی تھی کیونکہ اس میں جگہ جگہ مختلف اسباق کے ساتھ ساتھ کچھ عشقیہ اشعار بھی رقم تھے۔ جس چیز نے صبا کو چونکا دیا وہ ڈائری میں چھپی مختلف ایموینشنز کی باتصویر تفاصیل تھیں۔ اگر صفحے کے ایک طرف دینی احکامات تھے تو دوسری طرف جدید اسلحے اور ان کے استعمال کے طریقے تھے۔ وضو اور نماز کا

بیان، تصویر ''ٹی ٹی پستول مع گولیاں۔'' رکوع کی تسبیح، رکوع سے اٹھنا، زیگویک گن اور اس کے استعمال کا طریقہ۔'' دوسجدوں کے درمیان جلسے کی دعا۔'' راکٹ لانچر، کلاشنکوف اور مواد برائے بارودی سرنگ۔'' (باتصویر) ''کہہ دو میرا جینا مرنا، میری نماز رب العالمین کے لیے ہے۔ بائیں جانب ہتھیاروں کی تصویریں تھیں اور رنگین تصویر کے ساتھ درج تھا۔'' ٹینک کا قاتل......راکٹ لانچر (میڈ ان انڈیا)

مجھے کہنے والے دہشت گرد

تیرے راکٹوں سے لڑیں گے مرد

(ہماری مختلف شہروں میں چھاؤنیاں ہیں۔ ان چھاؤنیوں میں محض اسلحے کی تربیت نہیں مذہب کے عقیدے کی بنیاد پر تربیت دی جاتی ہے۔ اس وقت دیگر اسلامی ملکوں کے تربیت یافتہ مجاہد شاگرد مل جائیں گے جو دعوتِ جہاد میں مصروف ہیں۔ رابطہ کے لیے فلاں......فلاں نمبر پر رابطہ کریں)

باطل کے ایوانوں میں تیرا نام چیدہ چیدہ

بنیاد پرست، حریت پسند، دہشت گرد راسخ العقیدہ

دائیں طرف ایک خیالی جنت کی بھدی تصویریں تھیں۔ جن میں دودھ کی بدنما نہریں بنا کر موٹی موٹی چار بے ڈول عورتوں کو بطورِ حور دکھایا گیا تھا۔ صبا نے دوبارہ سارے نصاب پر ایک ناقدانہ نظر ڈالی اور ڈائری پلٹ کر سن اور تاریخ دیکھی۔ پھر گہرے دکھ سے سوچا، کیا یہاں تمام اربابِ اختیار سو رہے ہیں۔ نسلوں کی فصلوں پر کب سے زہر پاشی ہو رہی ہے......؟

وہ ماندے دل سے اٹھی اور باہر آ کر برآمدے کے دروازے کے ساتھ کھڑی ہوگئی۔ دونوں بچے رغبت سے کھانا کھا رہے تھے۔ دونوں بچوں پر پُرترحم نظر ڈالتے اُسے لگا جیسے یہ بچے آلودہ سمندر کنارے بیٹھے وہ پرندے ہیں۔ جن کے پر عفونت زدہ تیل کی تلچھٹ میں لتھڑے ہیں۔ وہ غلیظ تیل جوان کی قوتِ پرواز کو محدود سے محدود تر کرتا چلا جا رہا ہے۔ زاہدہ اٹھ کر صبا کے پاس آئیں اور بولیں۔

''کیا ہوا صبا؟'' تمہارا چہرہ ایسا بجھا بجھا سا کیوں ہو رہا ہے؟''

''کچھ نہیں ماما، ایسے ہی، آپ نے ان لوگوں کو ابھی سے کھانا دے دیا۔ ابھی تو صرف گیارہ بجے ہیں۔'' صبا بات بدلتی ہوئی بولی۔

''خالی پیٹ کا وقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور...... بھوک کا خوف پیدائش کے ساتھ ہی نازل ہوگیا ہو نا تو پیٹ بھر بھی جائے تو نیت نہیں بھرتی۔'' زاہدہ ہولے سے بولیں اور آگے بڑھ گئیں۔ صبا کو لگا جیسے یہاں کی دھرتی ایک ایسی دلدل بن چکی ہے۔ جس نے ٹھان رکھا ہے کہ جلد بدیر وہ ایک ایک ذی متنفس کو نگل کر ہی دم لے گی۔ اس نے سوچا کہ وہ کسی مناسب وقت میں زاہدہ سے کہے گی کہ رادو نے سے بات کریں کہ ان بچوں کو کسی گورنمنٹ اسکول میں داخل کروا دے۔ یقیناً سب مدرسوں کا نقصاب یہ نہ ہوگا لیکن؟ بہرحال بات کرے گی ضرور۔ اس نے ایسا ہی کیا۔

زاہدہ کچھ دیر تو حیرت سے صبا کا منہ تکتی رہیں پھر دکھ سے بولیں۔

''کوشش تو ضرور کروں گی اسے سمجھانے کی۔ دراصل اندر خانے ان کا زور صرف تعلیم پر نہیں اپنی ذمہ داری سے سبکدوشی پر بھی ہوتا ہے۔ خاص طور پر ان جیسے یتیم کہ ماں مزدوری کرے کہ بچوں پر نظر رکھے؟ مدرسوں میں کھانا رہائش مفت ہوتی ہے۔ بچے کبھی کبھار ہی گھر آ پاتے ہیں تو قدرے سخت ماحول سے یہ غیر شعوری طور پر مطمئن ہو جاتے ہیں

کہ بچہ بہر حال وہاں محفوظ ضرور ہے۔ میں سوچتی ہوں اسلام کے نام پر بسنے والے ملک میں اتنے برسوں میں یہ تک نہ ہوا کہ پہلا پیریڈ، قرآن، ترجمے اور تفسیر کا ہو جاتا۔ اگر ایسا ہوتا تو قاری کلچر جنم ہی نہ لیتا۔ حالات اتنے سنگین نہ ہوتے۔ بہر حال! اچھا کیا تم نے بتا کر، میں رادو نے سے بات کروں گی۔ لکیر کے فقیر کچھ سمجھتے بھی تو نہیں۔ دوڑ بھاگ کر کے کسی کے گھر رکھواؤ۔ سرونٹ کوارٹر دلواؤ، اُدھر گاؤں میں کوئی مرگ یا شادی ہوئی تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اُدھر چل پڑیں گے غیر معینہ مدت تک کے لیے۔ ان کے حساب کتاب بھی اپنے ہی ہوتے ہیں۔ کیا کرے انسان سمجھا سکتا ہے اور کوشش کر سکتا ہے۔'' صبا ہنستے ہوئے بولی۔

''اور کچھ بھی نہ کر پائے تو دُعا تو کر ہی سکتا ہے۔''

''بے شک، کیوں نہیں۔'' زاہدہ ہنسنے لگیں اور پوچھا۔''رویشا شام تک آ جائے گی نا؟''

''ہاں شاید پہلے ہی آ جائے۔''

☆......☆......☆

موسم بدل رہا تھا۔ آسمان کی نیلاہٹ میں اضافہ بھی بدلتی رُت کی خبر دے رہا تھا۔ دریا کے پانیوں کے بہاؤ میں آج پر سکون روانی تھی اور جو ہوا پانیوں سے گزر کر آتی وہ روح کو سرشار کرتی تھی۔ رویشا اس جگہ کی قدرتی خوبصورتی کے پیچھے دیوانی ہوئی جا رہی تھی۔ اِسی باعث زاہدہ نے خصوصی طور پر چائے کا اہتمام باہر آخری ٹیرس پر کیا تھا۔ وہاں سے دریا کی قریب ترین قربت تھی۔ بیزار ولید بیزاری کے ساتھ ملازمہ کے ہمراہ چائے کا سامان باہر میز پر رکھوا رہا تھا۔ رویشا اور صبا نیچے دریا کے پتھروں پر پوز بدل بدل کر تصویریں کھینچ رہی تھیں۔ ٹیرس کے اس آخری حصے سے پتلی سی لوہے کی سیڑھی کنارے پر اترتی تھی۔ دریا سے اتنی دوری میں کہ قریبی چٹان سے کوئی با آسانی چھلانگ کر کنارے اور پھر سیڑھی تک آ سکتا تھا۔

افتخار احمد اور زاہدہ اوپر سے اُن دونوں کو دیکھ دیکھ کر محظوظ ہو رہے تھے۔ افتخار احمد بولے۔

''کتنی خوش ہیں دونوں۔ رویشا کا تو بہت جی لگا اِس جگہ پر۔'' زاہدہ ہنس کر بولیں۔

''ہاں! یہ تو صبا سے بار بار کہہ رہی ہے کہ 'فل مون نائٹ' جھیل میں گزاریں گے۔ تم بوٹ رینٹ کروالو۔''

''پھر؟''

''پھر کیا۔ صبا ہنس رہی تھی۔ کہہ رہی تھی، اس کو بتایا بھی ہے کہ اِدھر سکیورٹی ایشوز ہیں، کلچرل ایشوز ہیں۔ سکیورٹی ایشوز تو اس کی سمجھ میں آتے ہیں پر کلچرل ایشوز کے بارے میں ٹوٹل فارغ ہے۔ بات یہ ہے بابا کہ جو لڑکیاں عادی ہوں ایسے ماحول کی کہ نائٹ شفٹ میں آدھی رات کو کلاس ختم کر کے سائیکلنگ کرتی واپس گھر آئیں۔ ایسے کہ ان کے خاوند گھبراتے ہوئے دروازوں پر کھڑے نہیں، بستروں میں بے خوف دھت سوتے ہوں۔ انہیں چند دنوں میں یہاں کا کلچر سمجھایا بھی کیسے جا سکتا ہے۔ اس میں تو یقیناً بہت وقت درکار ہوگا۔'' افتخار احمد مسکراتے ہوئے جواباً بولے۔

''صحیح کہہ رہی ہو۔'' زاہدہ نے دوبارہ ریلنگ پر جا کر صبا کو اشارہ کیا اور کہا کہ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ تھوڑی دیر میں وہ واپس پلٹیں اور جوگرز مہارت سے سیڑھی پر جماتی اوپر آ گئیں۔ رویشا پُر اہتمام چائے دیکھ کر ناراضگی کا اظہار کرنے لگی تو زاہدہ محبت سے بولیں۔

''رویشا! تکلف والی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ کچھ ٹریڈیشنل لوازمات ہیں چائے کے، تم اطمینان

سے بیٹھو اور انجوائے کرو۔'' صبا رویشا کو پلیٹ پکڑاتے ہوئے مختلف چیزوں کے بارے میں بتاتی بھی جارہی تھی اوراس کی پلیٹ میں ڈالتی بھی جارہی تھی۔ کچھ دیر بعد دونوں اپنے کپ اٹھا کر قدرے نچلے ٹیرس کے جھولے پر جا کر بیٹھیں تو زاہدہ افتخار احمد سے بولیں۔

''بابا! میں ولید سے کہتی ہوں کسی کو بلا کر لائے۔ یہ سیڑھی اتروادیں یہاں سے۔ ہم تو ویسے بھی اورزیادہ سے زیادہ مہینہ بھر ہیں یہاں۔''

''ہاں! اتروادو۔ کبھی دھیان ہی نہیں دیا۔ میں تو باہر آؤں بھی تو بیٹا یہاں تک کب آتا ہوں۔ پہلے سیڑھیاں اُدھر جھولے کے پاس لگی تھیں۔ ان کی دیکھ بھال کو آتا تھا۔ ولید نے میری تکلیف دیکھ کر سیڑھیوں کے قریب ہی کیاریاں بنوادیں۔''

''ہاں! بس حالات ہی ایسے ہیں کہ ذرا محتاط رہنا چاہیے۔''

''بیٹا! بہت پہلے جب یہ گھر بنا تھا تو اکثر قریبی گاؤں کے بچے دریا پر آتے تو آٹے چینی کا تقاضا کرتے اِدھر سے ہی چڑھ کر اوپر آجاتے تھے۔ اب وقت بدل گیا اور ویسے بھی اردگرد پکے راستے بن گئے۔ ہاں! سرخیل آئے تو اکثر ادھر سے اتر کر واک کرتا آگے چلا جاتا ہے۔''

''انکل کمانڈو آدمی ہیں بھئی، کوئی نہ کوئی راستہ نکال ہی لیں گے۔'' افتخار احمد ہنسنے لگے اور بولے۔

''ہاں! ٹھیک ہے ولید سے بات کرتے ہیں۔''

''بابا! آسمان کا رنگ کیسا سرخ ہورہا ہے۔ لگتا ہے زوردار بارش آئے گی۔''

''ہاں! اگلے دوتین دن کی فورکاسٹ بارش ہی کی ہے۔ چلو! صبا خوش ہوجائے گی۔ اسے بارش بہت اچھی لگتی ہے۔''

''جی! یہ اوراس کے میاں دونوں دیوانے ہیں بھئی، اُدھر تو دونوں سائیکلنگ کے لیے نکل جاتے ہیں۔ بابا یہ دونوں تو پتا نہیں کہاں گئیں۔ چلیں ہم بھی اندر چلتے ہیں۔ مغرب اندر ہی پڑھیں گے۔''

''چلو! ٹھیک ہے بیٹا! لو ولید آگیا۔ میں ملازمہ کو بھیجتا ہوں یہ سامان اندر رکھوائے تمہارے ساتھ۔''

''ہاں! میں سمیٹ لوں اتنی دیر۔'' زاہدہ کرسی سے اٹھتی بولیں۔

رات کھانے کے بعد رویشا صبا کے کمرے میں ہی آگئی۔ قہوہ پیتے ہوئے بادلوں کی گھن گرج بڑھی اور بارش شروع ہوگئی۔ رویشا کپ میز پر رکھ کر مڑی اور پردے ہٹا کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

''صبا! لگتا ہے یہاں پر بہت بارشیں ہوتی ہیں؟'' صبا ہنستے ہوئے بولی۔

''ہاں! مم تو بتاتی ہیں کہ پہلے اس سے بھی زیادہ ہوا کرتی تھیں۔ ان کے بچپن میں اگر دو ہفتوں میں ایک دن بھی سورج نکل آتا تو سب بہت خوش ہوتے تھے۔ تبھی تو اس علاقے میں اتنی سردی پڑا کرتی تھی۔'' رویشا چوڑی کھڑکی سے ناک چپکائے مسلسل باہر دیکھ رہی تھی۔ صبا ہنس کر بولی۔

''تمہیں یہ جگہ بہت پسند آئی ہے۔ تم اِدھر ہی آجاؤ۔ اچھا ہے، مم بابا کو اکیلے چھوڑنے پر راضی نہیں اور بابا مستقل طور پر ساتھ چلنے پر، تم روز ڈھیروں ڈھیر پکچرز کھینچا کرنا۔ اور ہاں تسلی رکھنا میں اکثر ملنے آتی رہا کروں گی۔'' صبا ہنستے ہوئے بولی۔ رویشا کا دھیان نجانے کہاں تھا۔ کھڑکی سے باہر دیکھتی دیکھتی بولی۔

''لُک صبا! وہ اُدھر سے، پانی کے پار سے لائٹ اٹھتی ہے بار بار وہ کیا ہے؟ یہ جو تمہاری ریلنگ پر پڑتی ہے؟''

''ہیں؟ کیا؟'' صبا اٹھی اور کھڑکی میں ساتھ

ڈسٹری بیوشن کے لیے ملک بھر سے ڈسٹری بیوٹر حضرات رابطہ کریں

الطیبہ انٹرنیشنل

کھڑی ہوگئی۔ گھپ تاریکی تھی۔

''اُدھر، فارسٹ کی طرف۔ ابھی کئی بار دیکھا ہے اُدھر کیا ہے؟''

''کیا معلوم!'' اندھیرں کو گھورتی صبا کچھ دیر تو کھڑی رہی۔ یکا یک زوردار گڑگڑاہٹ سے بادل گرجے اور موسلا دھار بارش سے باہر کے منظر دھند لا گئے۔ زاہدہ نے کمرے کا دروازہ کھولا اور پوچھنے لگیں۔

''رویشا! صبح آپ کو کتنے بجے گاڑی چاہیے ہوگی؟''

''آنٹی! گاڑی ایمبیسی سے آجائے گی۔ شکریہ کل گاڑی نہیں چاہیے۔''

''اچھا! چلو ٹھیک ہے۔ شب بخیر گڈ نائٹ۔''

''گڈ نائٹ۔'' رویشا اور صبا اکٹھی بولیں۔

☆......☆......☆

موسم اگلے روز بھی خراب تھا اور بارش میں شدت آچکی تھی۔ طوفانی ہوائیں اتنی تیز تھیں کہ لگتا تھا گھر کی چھتوں کو ساتھ ہی اُڑا لے جائیں گی۔ صبا اور زاہدہ دونوں افتخار احمد کے دائیں بائیں بیٹھی تھیں۔ ایمرجنسی لائٹس کی روشنی میں چہرے اور ماحول سبھی فکر مندی میں ڈوبے تھے۔ افتخار احمد کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی تھی۔ زاہدہ شوگر لیول اور بلڈ پریشر چیک کرکے بھی مطمئن نہ تھیں۔ آخر انہیں اچانک ایسی کمزوری کیوں ہوگئی ہے۔ صبح تو اچھے بھلے تھے اور اب کیسی غنودگی میں ہیں۔ زاہدہ فکر مندانہ سوچوں میں ڈوبی ٹکٹکی باندھے مسلسل ان کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

''مم! آپ بالکل فکر مند نہ ہوں۔ تھوڑی دیر اور دیکھتے ہیں۔ پھر ہوسپٹل چلے چلیں گے۔'' صبا زاہدہ کو تسلی دیتے ہوئے بولی۔ باہر زور کی بجلی کڑکی اور سفید چمکارے گھپ اندھیروں میں چھپے سارے منظر روشن کرتے ہوئے بادلوں کی مہیب گڑگڑاہٹ میں چھپ گئے۔ افتخار احمد نے نقاہت سے آنکھیں کھولیں۔ زاہدہ اوپر جھکتے ہوئے پیار سے بولیں۔

''طبیعت کیسی ہے بابا؟''

''ہاں! ٹھیک ہوں۔ بس ایسا لگ رہا ہے جیسے دماغ بالکل سُن ہوتا جارہا ہے۔''

''ہم تھوڑی دیر میں ہوسپٹل چلتے ہیں۔'' زاہدہ تسلی دیتے ہوئے بولیں۔

''باہر بہت موسم خراب ہے اور پھر ولید بھی نہیں۔ صبح چلے جائیں گے۔'' افتخار احمد نقاہت سے بولے۔

''ولید کو بھی آج ہی جانا تھا۔ یہ لوگ بھی نہ بس......''

''نہیں زاہدہ، ایسے نہیں کہو۔ وہ تو بہت کم گاؤں جاتا ہے۔ ایک دو دن تک آجائے گا۔'' افتخار احمد قدرے بے چینی سے کروٹ بدلتے ہوئے بولے۔ زاہدہ نے اٹھتے ہوئے ان کا کمبل برابر کیا اور صبا کو باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ لاؤنج میں طوفان کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔ زاہدہ فکر مندی سے بولی۔

''صبا! بابا کی طبیعت مجھے تو ٹھیک نہیں لگ رہی۔ چہرے کا رنگ عجیب پھیکا سا پڑ رہا ہے، ہوسپٹل چلتے ہیں۔ تم چھتریاں وغیرہ اٹھاؤ اور کچھ پیسے لاکر سے نکال کر رکھ لو۔ میں ان کی رپورٹس وغیرہ اٹھاتی ہوں۔ ٹھیک ہے؟ بارش تھوڑی سی بھی ہلکی ہوتی ہے تو گاڑی بالکل برآمدے تک لے آؤ۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔'' زاہدہ نے افتخار احمد کے سرہانے سے ساری رپورٹس اٹھائیں۔ وہ پلاسٹک کا کوئی بڑا بیگ ڈھونڈ رہی تھی کہ جس میں فائل رکھ سکے۔ اتنے میں صبا کمرے میں آئی اور بالکل زاہدہ کے قریب آکر سرگوشی میں بولی۔

''گاڑی کی چابیاں نہیں مل رہیں۔''

''کی بورڈ پر دیکھا ہے؟ ابھی مل جائیں گی فکر نہ کرو۔'' زاہدہ تھوڑی دیر میں لاؤنج میں آئی تو صبا چابیاں ڈھونڈتے چیزوں کی اٹھا پٹخ میں لگی ہوئی تھی۔ زاہدہ بھی جہاں جہاں دیکھ سکتی تھیں دیکھا پر چابیاں کہیں نہیں تھیں۔ صاف ستھرا گھر تھا جہاں ہر چیز ٹھکانے پر تھی۔

''روز تو یہیں کی بورڈ پر لگی ہوتی ہیں۔ کدھر رکھ گیا۔ صبا فون کر کے پوچھو ولید سے؟''

''فون بند آ رہا ہے۔ میں پہلے ہی ملا کر دیکھ چکی ہوں۔ آپ بابا کے کمرے میں دیکھیں، کہیں اُدھر نہ ہوں۔''

''میں دیکھ چکی ہوں، پھر دیکھتی ہوں جا کر۔'' صبا نے ری ڈائل کا بٹن دباتے ہوئے موبائل کان سے لگایا۔ فون بند تھا۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے صوفے پر بیٹھی اور یکدم چونکی۔ اُس نے پاس رکھی چھتری کھولی اور تیز تیز قدموں سے باہر سرونٹ روم کی طرف بڑھی۔ چار سو بارش بھری منہ زور ہواؤں کے تھپیڑے تھے۔ صبا قدم جما جما کر بمشکل سرونٹ روم تک پہنچی۔ جھاڑ جھنکار بنی بیلیں بارش کے بوجھ میں ڈوبی دروازوں کے عین آگے تک گری تھیں۔ چھوٹے سے برآمدے کے اندر صبا نے چھتری ٹیڑھی کر کے رکھی۔ دروازے پر لگی کنڈی مضبوطی سے بندھی جس پر زنگ بھرا تالا لٹکا تھا۔ صبا مایوسی سے تالے کو تکنے لگی۔ ایسے ہی غیر ارادی طور پر صبا نے تالے کو زور کا جھٹکا دیا۔ وہ شاید پورا بند ہی نہ تھا جو بغیر آواز کے کھل گیا۔

صبا نے دروازہ کھولا۔ کمرے میں خالی چارپائی کے اوپر پڑے تکیے کے پاس ایش ٹرے دھری تھی جو سگریٹوں کے خالی ٹکڑوں سے لبالب بھری تھی۔ ساتھ چھوٹا سا کالا ٹرانسسٹر پڑا تھا۔ چارپائی کے ساتھ لگی کھونٹی پر دو تین قمیض شلوار اور دو چادریں لٹکی تھیں۔ صبا نے مایوسی سے چارپائی پر دوبارہ نظر ڈالی۔ چابی نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ البتہ مضبوط گرل والی کھڑکی کے باہر مہیب رات آسمان پر سرخی کی آمیزش کا چوکھٹا لیے کافی ناراض سی تھی۔

کمال ہے بھئی اِس گھر کی سب سے خوبصورت لوکیشن پر بنانے والے نے سرونٹ روم بنا ڈالا۔ اس کی نظر دوسرے دروازے پر پڑی جو ساتھ والے کمرے میں کھلتا تھا۔ صبا نے ہینڈل گھمایا تو ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ دروازہ کھلا۔ اندر کچھ پرانے اے سی اور ہیٹر پڑے تھے۔ دو بستروں کو گول کر کے اوپر تلے پڑے کارٹنوں پر رکھا ہوا تھا۔ ایک پرانی سی کرسی پر بڑی جدید قسم کی ٹارچ پڑی تھی۔ صبا واپس مڑنے کو تھی کہ ایک ہلکی سی بذر سنائی دی۔ صبا رک گئی اور غور سے آواز سننے کی کوشش کرنے لگی۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد آواز پھر سنائی دی۔ وہ آواز الماری کے اندر سے آ رہی تھی۔ صبا کو عجیب سی لیکن، بہت ہی غیر معمولی صورتِ حال کا احساس ہوا۔ وہ آگے بڑھی اور دونوں ہاتھوں سے الماری کے دونوں پٹ اکٹھے کھول دیے۔ دائیں ہاتھ بڑے خانے میں لا تعداد تاروں کا جال بچھا تھا جو نیچے پڑے کنیکٹرز کے ساتھ منسلک تھیں۔ بائیں طرف کے تمام خانوں میں ہینڈ گرنیڈز، ڈیٹونیٹرز، ڈیوائسز کے ساتھ مختلف قسم کے ریوالور بالترتیب پڑے تھے جن کے اوپر لگی سفید ٹیپ پر مختلف کوڈ اور نمبرز درج تھے۔ صبا کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل سی گئیں۔ دھڑ دھڑ دھڑ کتے اور بے قابو ہوتے دل کو قابو میں لاتے اُس نے آہستگی سے پلٹ کر کھلے دروازے کی طرف دیکھا۔ اور پھر آگے بڑھ کر موبائل سے جلدی جلدی پکچرز اتاریں اور الماری بند کر دی۔ بیچ دروازے میں پہنچ کر جھکی اور چادر اتار کر جلدی جلدی فرش سے

گیلے جوتوں کے نشان صاف کیے۔ وہ ولید کے کمرے میں آئی تو تھوک نگل کر خشک ہوتے حلق کو تر کرنے کی کوشش کی۔ اُسے لگا کہ دیواریں گہرے گہرے سانس لے رہی ہیں۔ وہ لپک کر کمرے سے باہر نکلی اور ہاتھ بڑھاتے ہوئے جلدی سے جوگرز کے نشان مٹائے۔ کمرے کا دروازہ مضبوطی سے بند کر کے تالا اسی طرح کنڈی میں دبا دیا۔ چھوٹے سے برآمدے میں پانی کھڑا تھا۔ اُس نے اپنی چھتری اٹھائی اور جما جما کر قدم رکھتی تیزی سے گھر کی سمت بڑھ گئی۔

سلائیڈنگ ڈور بے آواز بند کرتے ہوئے جلدی سے گیلے جوگرز ہاتھ میں اٹھائے اپنے کمرے میں آ گئی۔ ابھی الماری سے دوسرے جوتے نکال ہی رہی تھی کہ زاہدہ کی آوازیں آئیں۔ وہ اسے پکار رہی تھیں۔

''بس مم! دو منٹ باتھ روم میں ہوں۔'' صبا نے منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے اور جلدی جلدی منہ صاف کر کے باہر آ گئی۔ زاہدہ ہینڈ بیگ اٹھائے لاؤنج میں کھڑی تھیں۔

''ہو گئیں تیار؟''

''یہ بابا نے ڈپلیکیٹ چابی دی ہے۔ تم گاڑی بالکل دروازے تک کرو میں اُن کو لے کر آتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے، آپ نے سب رپورٹس رکھ لی ہیں؟'' صبا لہجے کو حتی الامکان نارمل رکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''ہاں! بس طوفان بہت زیادہ ہے۔'' زاہدہ فکر مندی سے بولیں۔

''کوئی بات نہیں ماما آپ فکر نہ کریں۔ بس بابا کو اٹھائیں۔ وہیل چیئر لے آئیں گی دروازے تک یا میں ہیلپ کروں؟''

''نہیں ٹھیک ہے میں لے آتی ہوں وہ وہیل چیئر پر ہی ہیں۔''

گاڑی کا رخ اسپتال کی ایمرجنسی کی طرف تھا۔ بابا کو ایڈمٹ کرواتے ہی اُس نے پہلا فون بریگیڈئیر سرخیل کو کیا اور دوسرا رومیشا کو۔

بریگیڈئیر سرخیل تھوڑی ہی دیر میں اسپتال پہنچ گئے۔ افتخار احمد کی طبیعت تھوڑی بہتر ہوئی تو صبا بریگیڈئیر سرخیل کے ساتھ اسپتال کے کیفے ٹیریا میں آئی اور گھر کے بارے میں ساری تفصیلات بتائیں۔ وہ حیرت سے سنتے رہے پھر کچھ سوچتے ہوئے انہوں نے صبا کو انتہائی رازداری برتنے کی تلقین کرتے ہوئے کہا کہ وہ کچھ انتہائی ضروری اقدامات کرنے جا رہے ہیں۔ اُن سے رابطے میں رہنا اور فکر مند نہیں ہونا۔''

☆......☆......☆

اگلے دو روز بہت حساس نوعیت کے تھے۔ بریگیڈئیر سرخیل نے زاہدہ کو اعتماد میں لے کر بتایا کہ ولید کے واپس آنے تک ایس ایس پی کے کچھ جوان سادہ کپڑوں میں گھر میں رُکیں گے۔ اِس دوران زاہدہ اور صبا کو رومیشا کی ایمبیسی شفٹ کروا دیا گیا ویسے بھی زیادہ وقت تو وہ افتخار احمد کے پاس اسپتال میں تھیں۔

بریگیڈئیر سرخیل کی ذاتی نگرانی میں آپریشن کلین اپ کامیاب ہوا۔ ولید اور اس کے ماسٹر مائنڈ سمیت بہت سے لوگوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ بات کھلنے پر پورے علاقے میں خوف و ہراس کی لہر دوڑ گئی۔ اور دنوں لوگ اس واقعے کے بارے میں چہ میگوئیاں کرتے رہے۔

افتخار احمد ایک ہفتے بعد گھر شفٹ ہوئے تو بارہا ولید کا پوچھا۔ زاہدہ کسی نہ کسی طور انہیں مطمئن کرتی رہیں۔ اُن کی طبیعت بالکل نارمل ہو گئی تو ایک روز زاہدہ نے انتہائی اطمینان سے انہیں گزری صورتِ حال کے بارے میں بتایا۔ وہ بھونچکا زاہدہ کی

صورت تکتے رہے اور حیرت اور صدمے سے سنبھلنے کے بعد مستقل کڑیاں جوڑتے رہے کہ وہ کیسے آیا تھا...... کس کے ذریعے آیا تھا۔ پر نہ کوئی سرا ہاتھ آنا تھا نہ آیا۔ بھلا جس کے کمرے سے سوسے اوپر جعلی شناختی کارڈ برآمد ہوئے ہوں۔ اُس کی اپنی شناخت کوئی ایک فرد کیسے کر پاتا، وہ بھی ایک بوڑھا اور نیم اپاہج!

☆......☆......☆

سارا سامان پیک ہوا پڑا تھا۔ زاہدہ اور صبا تیار ہو کر ہینڈ بیگز پاس رکھے لاؤنج میں چائے پی رہی تھیں۔ افتخار احمد بریگیڈیئر سرخیل کے ساتھ وہیل چیئر پر پورے گھر اور لان کا الوداعی چکر لگا رہے تھے۔ اُن کا چہرہ ایسا تھا جیسے ایک طوفان گزرنے کے بعد بستی اجاڑ کھڑی ہوتی ہے۔ پر کھڑی ہے۔ وہ لاؤنج میں آئے تو بریگیڈیئر سرخیل نے چھوٹے گلاس میں جوس ڈال کر دیا اور بیٹھتے ہوئے کہنے لگے۔

''افتخار احمد خود کو سنبھالو، تمہارے لیے اس وقت تبدیلی آب و ہوا بہت ضروری ہے۔ تم زاہدہ کے ساتھ سکون سے رہنا جب تک تمہارا دل چاہے اور جب تم واپس آؤ گے تو میں تمہیں تمہارے ہی گھر میں بانہیں پھیلائے ملوں گا۔ مجھ سے خوش قسمت بھی کوئی ہوگا کہ جس کے ایسے خوبصورت علاقے میں دو دو گھر ہوں۔ ہیں؟'' افتخار احمد مسکرانے لگے۔ بریگیڈیئر سرخیل نے افتخار احمد کی طرف دیکھا اور نرمی سے بولے۔

''اور سنو! جس طرح ہم اپنے خوابوں، خواہشوں کی تکمیل کے لیے کوشش ہی کر سکتے ہیں اور اکثر خود کو ناتواں پا کر معاملہ اللہ کے سپرد کر دیتے ہیں اِسی طرح تم پاکستان کو بھی اللہ کے سپرد کر دو۔ قصور پاکستان کا نہیں پاکستانیوں کا ہے۔ جہاں اب ہر دوسرا فرد نظامِ خداوندی میں مسلسل خلل انداز ہوتے، ترازو ہاتھ میں لیے دوسروں کے دوزخی ہونے کی سند دینے بیٹھا ہے۔ یہیں سے بنیاد ٹیڑھی ہو جاتی ہے۔ اس لامحدود کائنات میں اللہ کی اِس چھوٹی سی دنیا اور دنیا والوں سے معاملہ حسنِ سلوک کرنا ہوگا۔ جب باطن پاک ہوگا، ظاہر میں ابتری تب ہی آئے گی۔ ایک، دس، سو، ہزار، لاکھ، کروڑ...... اٹھارہ کروڑ صاف دل...... تب نظام بدلے گا کہ یہی ایک چابی ہے۔ اپنے آپ کو بدلنا ہوگا۔ Law Of Nature نہ بدلا ہے اور نہ بدلے گا۔ انور زاہدی نے ٹھیک کہا تھا کہ جب دنیا ڈیجیٹل ٹیکنالوجی اور نجانے کن کن میدانوں میں ایکسپلور کر رہے ہیں۔ ہم ابھی تک زندگی کے پلیٹ فارم پر کھڑے مردانہ اور زنانہ ڈبے ڈھونڈ رہے ہیں۔''

''انکل، اور چائے لیں گے؟'' صبا نے پوچھا۔

''نہیں، بس افتخار جوس ختم کرے تو نکلتے ہیں ایئرپورٹ کے لیے۔''

''انکل یہ چابیاں رکھ لیں۔'' زاہدہ نے ایک بڑا سا گچھا بریگیڈیئر سرخیل کی طرف بڑھایا۔ جو گھڑی دیکھتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

☆......☆......☆

جہاز نے ٹیک آف کیا اور شہر سرسبز کے اوپر نیم دائرے میں ایک نیچی پرواز کے بعد اونچی اُڑان بھری۔ افتخار احمد کے دل میں نصب لکڑی کے چھوٹے کواڑ کی کنڈی آہستگی سے کھلی اور اندھیر باغ کے اندھیروں میں ڈولی ایک صدا اُبھری۔

وہاں کون ہے تیرا مصحفی جائے گا کہاں؟

انہوں نے دونوں لرزتی ہتھیلیوں سے اپنے گیلے رُخسار صاف کیے۔ زاہدہ کے چہرے کی لکیریں اس گھڑی بہت گہری ہو چلی تھیں۔ صبا نے بھاری دل سے نظریں اٹھائیں اور اُن دونوں کے چہروں کی طرف دیکھا جہاں لکھا تھا۔ کہانی تم بھی ہو، کہانی میں بھی ہوں۔''

☆☆......☆☆

افسانہ

آگہی کا پل

''آزمائش شرط ہے؟ تمہارا مان سلامت رہے۔ تمہارے یہ خونی رشتے بے ضرر ثابت ہوں۔ جس طرح تم نے انہیں اور اُن کی اولاد کو سنبھالا، سہارا دیا، محبت دی، مالی امداد کی۔ خدا کرے کہ وہ تمام بھی تم سے تہی دست ہونے کے بعد بھی......

کبھی کبھی ایک پل میں بھی زندگی بدل جاتی ہے

رات گئے جب میں نیند نہ آنے کی وجہ سے کروٹ پر کروٹ بدل رہی تھی، یکدم ہی موبائل کی اسکرین روشن ہوئی اور ایک انجانے نمبر سے میسج موصول ہوا تو میں نے فوراً ہی موبائل اٹھالیا۔ رومن انگریزی میں اک جملہ تحریر تھا۔

''میں انتظار کروں گی۔'' اور اک نیا نمبر۔

''کون ہوسکتا ہے؟'' میں سوچنے لگی۔ آفس کولیگ، دوست، رشتہ دار، میکے اور سسرال میں سے تو کوئی نئے نمبر سے مجھے تنگ تو نہیں کر رہا۔ میں خاصی دیر تک سوچتی رہی پھر۔

''کون ہے؟'' کی گردان اتنی بڑھی کہ مناسب وقت نہ ہونے کے باوجود اس نمبر پر ڈائل کر دیا مگر...... کال کسی نے ریسیو نہیں کی تو تھک ہار کر فون رکھ دیا یوں بھی فجر کا وقت ہو چلا تھا۔ لہٰذا میں وضو کی نیت سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

پھر صبح کی ہلکی سفیدی کے ساتھ ہی معمولات زندگی شروع ہوگئے۔ بچوں کو اسکول کے لیے اُٹھانے، ان کے ناشتے اور لنچ باکس کی تیاری، میاں صاحب کے کپڑے واش روم تک پہنچاتے اور اُن سب کو گھر سے رخصت کرتے کرتے آخر آٹھ بج ہی گئے تھے۔ لہٰذا جلدی جلدی اپنی پھوپی ساس کے ساتھ ناشتہ کر کے میں ساڑھے آٹھ تک گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔

میں آپ کو بتاتی چلوں کہ میں اک معروف رسالے میں نائب ایڈیٹر کی پوسٹ پر جاب کرتی ہوں۔ کچھ مجھے بھی بیکار بیٹھنا پسند نہیں اور کچھ میرے شوہر میں ادبی ذوق کچھ زیادہ ہے لہٰذا میری شادی سے پہلے کی جاب نہ صرف جاری رہی تھی بلکہ میرے شوہر کے دیے ہوئے اعتماد نے مجھے خاصا پُراعتماد بنا دیا تھا، رہی گھریلو مصروفیات تو اُن کا بھی حل نکال ہی لیا تھا کچھ اس طرح کہ ''نوید'' میرے شوہر کی پھوپو بیوہ ہونے کے بعد سے ہی ہمارے ساتھ تھیں، لہٰذا مجھے اُن کی وجہ سے بچوں کی طرف سے خاصی بے فکری میسر آ گئی تھی۔ وہ بالکل دادی کی طرح ہی ہمارے بچوں سے محبت کرتی تھیں۔ اُس روز آفس میں بھی کچھ کام زیادہ تھا۔ واپسی میں کچھ دیر ہوگی لہٰذا آفس سے ہی فون کر کے میں نے بچوں کو بتا دیا تھا اُن سے بات کر کے موبائل رکھ ہی رہی تھی کہ پھر ایک بار اُسی نمبر سے مس کال آ گئی۔ میں نے فوراً اُس نمبر پر کال کی تھی۔ اور پہلی کال پر نہایت مترنم سی آواز میں اسلام وعلیکم کہا گیا۔

''میں آپ کو پہچانی نہیں؟'' سلام کے جواب میں، میں نے کہا۔

''آپ مجھے بھول سکتی ہیں۔ مگر میں نہیں! کیونکہ آپ کے صرف ایک جملے نے میری کایا کلپ کردی تھی۔ یعنی میری سُونی زندگی میں بہاروں کے رنگ بھر دیے ہیں۔ میں...... آ بگینے بات کر رہی ہوں۔ کچھ یاد آیا۔''

اور ایک دم ہی میرے ذہن میں نہایت کامنی سی، خوبصورت، پُروقار سراپے والی من موہنی سی، آ بگینے آن وارد ہوئی۔ چند مہینے بیشتر جب آفس وین نکل جانے کی وجہ سے مجھے پبلک ٹرانسپورٹ میں گلشن سے ٹاور آنا پڑا تھا تو میری ملاقات آ بگینے سے ہوئی تھی۔ بات چیت کا آغاز کراچی کے مظلوم عوام کی مشکلات سے شروع ہوا تھا۔ ملکی شورش، بجلی کی لوڈشیڈنگ، ٹریفک کے بدانتظامی، ٹریفک جام سے ہونے والے مسائل، ہوش رُبا مہنگائی، اخلاق کی گرتی قدریں، تعلیم کی کم یابی، انسانی ہمدردی، دور ہوتے اخلاقی معاشرتی بگاڑ، بات دیگر مسائل سے ہوتی ہوئی ذاتیات تک آ گئی تھی۔

تب اِس مختصر سفر کے دوران ہی ہم میں ناموں کا تبادلہ ہوا اور اس نے بتایا کہ وہ تقریباً 25 سال سے جاب کر رہی ہے۔ اسی جاب سے اُس نے اپنی دونوں چھوٹی بہنوں کی نہ صرف شادیاں کیں بلکہ ان کے چھٹی چھلے، عید، تہوار نبھائے، بالکل اک ماں کی طرح، اُن کو میکے کا مان دیا پھر...... چھوٹے اکلوتے بھائی کی تعلیم اور جاب سے فراغت کے بعد اُس کی شادی کی۔ غرض اتنی بھاری ذمہ داریوں سے نبٹ کر اب وہ اپنے بھانجے، بھتیجوں، بھانجیوں کو اپنے دامن

میں سمیٹ بیٹھی ہے۔ اتنی کامنی سی صورت اتنا نازک سراپا، اور اُس پر متزاد آبگینے جیسا کانچ کی طرح نزاکت والا نام، میں نے حیران ہوکر کہا تھا۔

''جی'' جانے کیا سوچ کر والدین نے اتنا سجیلا نام رکھ دیا ورنہ زندگی تو 'جبر مسلسل' کی طرح کاٹی ہے۔'' اُس نے یکدم ہی ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''دراصل امی کا انتقال تو ہمارے بچپن ہی میں ہوگیا تھا۔ والد صاحب نے ہی ہم تین بہن بھائیوں کو ماں اور باپ بن کر پالا اور جب میں نے گریجویشن کے بعد اسی جاب کو فالو کیا تھا تو محض دو سال بعد ہی والد بھی چند ماہ بیمار رہ کر خالقِ حقیقی سے جاملے تھے۔ مرتے وقت انہوں نے کہا تھا کہ بیٹا تم ابھی اتنی بڑی نہیں کہ حالات کو سہار سکو مگر...... میرے بعد...... اب تم ہی ان تینوں کو سنبھالنا۔ اُس وقت میری چھوٹی بہن بتدریج نائن اور میٹرک میں اور چھوٹا بھائی فرسٹ ایئر میں تھا۔ اباجی کے بعد...... ہم سب بکھر کر رہ گئے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ سر پر آسمان ہے نہ پاؤں تلے زمین۔ نوعمر بہن بھائی، گھریلو ذمہ داریاں، اخراجات، اکیلا پن، سوچ سمجھ کا بحران، غرض غموں کا اک پہاڑ تھا جو سینے پر آگرا تھا۔ دوسراہٹ کے نام پر خاندان بھر کی بڑی بوڑھی خواتین نے ازخود ہمارے ساتھ رہنے کی ڈیوٹی لگالی تھیں اور ان نام نہاد خالاؤں، نانیاں، پھوپیوں، مومانیوں کے نامہربان رویے، اضافی بجٹ، محبت ہمدردی کے نام پر زمانے کی اونچ نیچ کی لن ترانیاں، اک نئے مسئلوں کو جنم دینے لگی تو میں نے خود کو سنبھالا، مضبوط کیا بلکہ اپنی ذات کو آسمان بنا کر اپنے بہن بھائیوں کے لیے خاندان بھر سے ٹکرا گئی۔ اہل محلہ بہت پرانے اور مخلص تھے، لہٰذا نیچے کے پورشن میں کرایہ دار رکھ لیے۔ نصیب سے والد صاحب گھر اچھا خاصا بنوا کر گئے تھے، اس طرح اکیلے پن کا مسئلہ حل ہوگیا۔ پھر میں نے جلدی جلدی رشتے تلاش کر کے بہنوں کو چھوٹی عمر میں ہی اپنے گھر کا کردیا۔ ان کو ایک ماں کی طرح جہیز کے ساتھ رخصت کیا اور ایک باپ کی طرح ان کے مسئلوں کو حل بھی کیا۔ بھائی بھی میری ڈھال بن گیا تھا۔ اُس کی پرمنٹ جاب کے دوسرے سال ایک اچھی لڑکی دیکھ کر اُس کا بھی گھر بسا دیا۔ اللہ کا کرم احسان ہے کہ آج میرے بہن بھائی، بہنوئی بھاوج اور اُن کے بچے، پروانوں کی طرح میرے گرد گھومتے ہیں۔ مجھے سمجھتے ہیں تو میرا سر فخر سے بلند ہوجاتا ہے اور اب محض ایک سال بعد میری ریٹائرمنٹ ہونے والی ہے۔ سوچتی ہوں کہ بس آخری کام اور کرلوں وہ یہ کہ اپنے ریٹائرمنٹ کے پیسوں کو سب میں برابر تقسیم کر کے حج کرلوں اور پھر اباجی کا مکان جو وہ مرتے وقت میرے نام کر گئے تھے۔ بھائی کے نام کردوں پھر آرام سے اللہ اللہ کروں۔ بس یہی آخری خواہش رہ گئی ہے کیونکہ میرا سب کچھ یہی ہیں۔ میں اپنے لیے جینا تو بہت پہلے بھول چکی ہوں بس یہی میری خوشیاں ہیں۔ میں سرخروئی سے مرنا چاہتی ہوں۔''

اُس نے دل گیر لہجے میں داستانِ حیات ختم کی اور ٹشو سے آنکھیں صاف کیں، کچھ تھا اُس کے ٹوٹے دل گیر لہجے میں کہ میں یکدم ہی کہہ اُٹھی تھی۔

''مگر وقت اب بھی تمہارا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ ابھی دیر ہوئی ہے مگر اتنی بھی نہیں کچھ اپنے لیے بھی سوچو۔''

''اب وقت گزر چکا ہے۔'' آبگینے نے یاسیت سے جواب دیا اور یہی وہ لمحہ تھا جب اُس کا لہجہ، سراپا حزن و ملال کی تصویر بن گیا تھا۔ وہ ٹوٹا لہجہ جس میں اُس کی عمر بھر کی تپسیا، حسرت بن گئی تھی۔ اور پھر میں بولنے لگی۔

جانے کیوں چند لمحوں بیشتر دوست بننے والی وہ لڑکی مجھے یکدم کیوں عزیز ہوگئی تھی۔

''اب بھی وقت تمہارا ہے؟ تم کچھ اپنے لیے بھی

سوچو۔ تم نے عمر بھر اپنی ہڈیاں محنت کر کے گلائی ہیں، جب ریٹائر ہو کر گھر بیٹھ جاؤ گی تو پھر فاضل پرزہ بن جاؤ گی۔ اب بھی تمہاری ہڈیوں میں دم ہے لہٰذا تم اک اک رشتہ نبھا رہی ہو۔ مگر جب بڑھاپے میں تھک کر اُسی پیڑ تلے آرام کرنے کا سوچو گی تو تو...... وہ سایہ بے ثمر ثابت ہوگا۔ بوڑھے ماں باپ کو اولاد بھی سہارا نہیں دیتی تم کس رشتے کو پکارو گی۔ یہ بھائی بھاوج، بہن بہنوئی، بھانجے بھتیجے جیسے رشتے، تمہارے پیسے سے تمہارے قریب ہیں۔ صرف ایک مرتبہ صرف ایک دفعہ میرے کہنے پر انہیں آزمالو، کچھ دینے کے بعد...... کچھ اپنے لیے بھی مانگ کر دیکھو۔ آزمائش شرط ہے؟ تمہارا مان سلامت رہے۔ تمہارے یہ خونی رشتے بے ضرر ثابت ہوں۔ جس طرح تم نے انہیں اور اُن کی اولاد کو سنبھالا، سہارا دیا، محبت دی، مالی امداد کی۔ خدا کرے کہ وہ تمام بھی تم سے تہی دست ہونے کے بعد بھی اِسی لگاوٹ کا مظاہرہ کریں۔ تمہیں بھی اسی طرح دامن میں سمیٹیں جس طرح تم نے اپنی مالی، دلی، ذہنی، اخلاقی محبت سے انہیں اپنایا۔ اپنے دل میں اٹھنے والی، اپنے لیے سوچنے والی، اپنا گھر بسا کر اپنی زندگی مکمل کرنے والی، سوچ تک کو اپنے دل میں چھپالیا۔ خدا حامی و ناصر رہے مگر صرف اک پل تم خود غرض بن کر صرف اپنے لیے سوچنا۔''

اور پھر جدا ہونے سے پہلے ہم نے نمبروں کا تبادلہ کیا اور میں اُس موہنی سی لڑکی کے لیے احترام کا جذبہ لیے رخصت ہوئی، مگر وائے نصیب کہ ان ہی دنوں چھوٹی نند اندرونِ سندھ سے علاج کی غرض سے ہمارے گھر آ گئیں، اُن کے ساتھ اسپتالوں کے چکر، اُن کے آپریشن، بچوں کے اگزام، خاندان بھر سے آنے والے عیادت کرنے والے مہمانوں کا سواگت، آفس کی مصروفیات، نوید کے آفس میں ہونے والی تبدیلیوں کے اثرات، اس حد تک مجھ پر پڑے کہ میرے کئی خاص کام التوا میں پڑ گئے۔ میں نے آبگینے سے دوبارہ ملنے کا وعدہ تو کیا خود اُسے ہی بھلا بیٹھی۔ مگر آج ...... اُس کے فون نے مجھے پھر سے سب کچھ یاد دلا دیا تھا۔ فون پر ہی میں اُسے گھر انوائٹ کر چکی تھی۔ خود وہ بھی ملنا چاہ رہی تھی، لہٰذا شام سات بجے آنے کا وقت مقرر ہوا تھا۔

☆......☆......☆

وہ بالکل ٹھیک ٹائم پر اپنے شوہر کے ساتھ میرے گھر پر موجود تھی۔ نہایت نفیس سے کام والے سوٹ میں ملبوس، لائٹ میک اپ میں وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ اُس کے شوہر کا نام اختر عثمانی تھا۔

ہم دونوں بچھڑی ہوئی سہیلیوں کی طرح وارفتگی سے ملتی تھیں۔ اور ریفریشمنٹ سے نمٹنے کے بعد آرام سے باتیں کر رہی تھیں۔

اُس نے بتایا کہ میں اپنے خاندان یعنی اپنے سسرال میں بہت خوش ہوں اور میری زندگی کو گلزار بنانے والی آپ کی ذات، آپ کی سوچ اور آپ کا اک جملہ بنا تھا۔ آپ کے کہنے پر صرف ایک پل، میں نے اپنے لیے سوچا۔ بہت سوچا اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی جب ایک ویک اینڈ پر سب جمع تھے۔ میں نے اُن لوگوں سے مطالبہ کیا کہ میں...... اپنی پنشن خود تک محفوظ کرنا چاہتی ہوں تاکہ تمام دنیاوی مسائل سے عہدبرآں ہو کر زیارت کعبہ کر سکوں، بقیہ زندگی سکون سے گزاروں اور یہ کہ والد صاحب کے فیصلے کے مطابق یہ گھر میرے نام ہی رہنے دو۔ یوں بھی تو میں آپ سب کے ساتھ ہوں اور مرنے کے بعد تو ہے ہی تمہارا۔

اور بس...... ایک خاموش بلاسٹ ہوگیا تھا۔ چونکہ تمام لوگ میرے فیصلے سے متفق نہیں تھے۔ میری بہنوں اور بھائی نے تو سکوت کے چند وقف لمحوں کے بعد خود کو سنبھال لیا تھا یا خون کا اثر رنگ لایا

یا میری ان تھک قربانیوں کے گواہ تھے وہ سب۔ لہٰذا میرے بھائی بہنوں نے تو فوراً میرا فیصلہ قبول کرلیا تھا مگر اس طرح کہ اُن کے لہجے کھوکھلے ہوگئے تھے۔ مگر بھاوج تو بہا تنگ دہل غصے میں کمرے سے نکل گئیں۔ یہ وہی بھاوج تھی جو آپا...... آپا کرتے زبان سُکھاتی تھیں کیونکہ اُن کے تینوں بچے شہر کے مہنگے ترین انسٹیٹیوٹ میں اعلیٰ کورس کررہے تھے اور انہیں اپنے شوہر کے نام ہونے والا گھر بیچ کر ڈیفنس میں رہنے کا خواب ادھورا لگنے لگا تھا۔ چھوٹے بہنوئی پنشن کی ملنے والی رقم سے کاروبار کا منصوبہ بنائے بیٹھے تھے۔ بھانجیوں کو اپنی شادیاں خطرے میں نظر آنے لگی تھیں اور بھانجوں کو اپنا اسٹیٹس بلند ہونے کا خواب بکھرتا نظر آرہا تھا۔ غرض سالوں کی خوب جلا دینے والی تپسیا کا پھل مجھے لمحوں میں مل گیا تھا۔ بگڑتے چہرے، بدلتی نظریں، کھوکھلے لہجے، وہ محبت، وہ احترام، وہ اُنسیت، وہ لاڈ، سب کچھ بدل گیا۔ میری آنکھوں سے سرکتے پردے، خوش فہمی کے اندازے سب کچھ غائب ہوگیا تھا۔ میرے خون سے سینچنے والے درخت کے پھل کڑوے کسیلے، ناپسندیدہ پھل کی صورت میں میری گود میں آگرے تھے۔

پھر میں نے اِس ڈرامے میں ری ایکٹ کیا، خود کو سنبھالا، اپنی پنشن تمام بچوں میں یکساں تقسیم کرکے سائن کی۔ گھر بھائی کا تھا اُس کے نام کیا۔ اپنی ریٹائرمنٹ کو بھرپور انجوائے کیا۔ مگر میرا دل ٹوٹ چکا تھا، روح خالی ہوگئی تھی۔ پھر میں نے آپ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ کیا مگر کوئی رابطہ نہ ہوسکا۔ اِس موقع پر میری سینئر کولیگ بہت دل سے میرے کام آئیں۔ انہوں نے ہی بھاگ دوڑ کرکے اپنے دُور کے ایک عزیز سے میرا رشتہ کرایا۔ چونکہ یہ صاحب اپنے تینوں بچوں کی تمام ذمہ داریوں سے آزاد ہوچکے تھے، لہٰذا اُن کے پڑھے لکھے باشعور بچے اپنے والد کی تنہائی کو آباد کرنا چاہتے تھے۔ خالی دامن، خالی ہاتھ رہنے کے بعد یوں بھی میرے اپنے گھر میں اب کوئی حیثیت رہنے والی نہیں تھی لہٰذا سوچ بچار کے بعد میرا اِن سے نکاح کردیا گیا اور اپنی ازدواجی زندگی کے سات ماہ میں، مجھے آسودہ حال شوہر کے اعتماد نے پھر سے زندگی کی بھاگ دوڑ میں شامل کردیا۔ میرے سوتیلے بچے، بیٹی داماد، بہویں مجھے بے حد خوش رکھتے ہیں۔ ویسے بھی وہ دبئی واپس جانے والے ہیں۔ بہو بیٹا، اپنی چھٹیاں گزار کر پچھلے ہفتے ہی واپس امریکہ چلے گئے ہیں۔ میں اپنی نئی زندگی میں بہت خوش اور مطمئن ہوں اور میری روکھی اور بے رونق زندگی کو گل رنگ سویرا دینے والی تو خدا کی ذات ہے مگر اس زندگی میں شامل ہونے کا، سوچنے کا ...... قدم اٹھانے کا، محرک صرف آپ کی ذات، آپ کا اک جملہ ہے، سچ ہے کہ خدا جب چاہتا ہے، جس سے چاہتا ہے کام لے لیتا ہے۔ آپ کا وہ چند لمحوں کا ملنا، اک دوسرے سے متاثر ہوکر حالات ڈسکس کرنا۔ پھر دنیا کے رنگ ڈھنگ کو دیکھ کر مخلصانہ مشورہ دینا۔ جو میرے اپنے بھی عمر بھر کی عرق ریزی کے بعد ختم ہوجانے تک بھی سوچ نہ سکے، وہ سوچ، وہ فیصلہ میرا پیر کامل بن گیا۔ اپنا گھر، اپنا شوہر، اپنا فخر، اپنا مان، مجھے اب معلوم ہوا کہ عورت اس خوبصورت رفاقت کے بغیر ادھوری ہے۔ میں بھی اپنے شوہر کے ساتھ پندرہ دن بعد دبئی شفٹ ہوجاؤں گی۔ لہٰذا آپ سے ملنے، آپ کا شکریہ ادا کرنے حاضر ہوگئی تھی۔'' آبگینے نے اپنی بات مکمل کی تو میں نے اُٹھ کر اُسے گلے لگالیا۔

''اب کبھی اپنی آپی کو بھولنا نہیں۔ نیٹ پر ہم روز ملا کریں گے۔''

یہی زندگی ہے، کبھی کبھی ہم ساری عمر سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی کچھ سمجھ نہیں پاتے اور کبھی کبھی اک پل، آگہی کا بن جاتا ہے۔

☆☆......☆☆

ناول

عقیلہ حق

آئینہ، عکس اور سمندر

خواہشوں، امیدوں اور ہر پل رنگ بدلتی زندگی سے آباد، ناول کی بیسویں قسط

خلاصہ

رفیق احمد اور نفیس احمد دو بھائی ہیں جن کے درمیان بہت محبت اور رکھ رکھاؤ ہے۔ رفیق احمد کے دو بچے عرفان اور زرقون ہیں، جبکہ نفیس احمد کے دو بیٹے احمد، فراز اور ایک بیٹی مریم ہے۔ مریم ایک سلیقہ شعار اور درمیانی صورت وشکل کی کم پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ مریم کی منگنی عرفان سے ہوگئی ہے۔ عرفان سے مریم بے انتہا محبت کرتی ہے، جبکہ زرقون، جو بے حد خوب صورت، خوش اخلاق اور زندہ دل لڑکی ہے، یونیورسٹی سے ماسٹر کر رہی ہے۔ اس کا رشتہ اپنا تایا زاد فراز کے ساتھ طے ہے۔ فراز اور زرقون ایک دوسرے کو بے حد چاہتے ہیں۔ رفیق احمد کی بیوی فہمیدہ بیگم ایک سلجھی ہوئی خدمت گزار خاتون ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے میکے پر بے حد جان چھڑکتی ہیں۔ میکے میں اُن کی بھاوج رقیہ بیگم بے حد حسین عورت ہیں۔ رقیہ بیگم کو ہمیشہ سے اپنی نند، فہمیدہ بیگم سے حسد ہے کہ وہ کس قدر آسودہ اور پُرتعیش زندگی بسر کرتی ہیں اور اُن کے میاں انہیں کس قدر چاہتے ہیں لیکن وہ اپنا حسد کبھی ظاہر نہیں کرتیں۔ حالات خراب ہونے کے باعث عرفان چند دن رقیہ بیگم کے گھر میں گزارتا ہے، جہاں وہ ثمینہ (جو اُس کی ماموں زاد ہے) کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے اور مریم سے منگنی توڑ دیتا ہے۔ مریم کو منگنی ٹوٹنے کا گہرا صدمہ ہوتا ہے اور وہ بیمار ہو جاتی ہے۔ ثمینہ سے شادی کے لیے فہمیدہ بیگم، بیٹے کا ساتھ دیتی ہیں جس کی وجہ سے رفیق احمد کے دل میں بیوی کی طرف سے بال آ جاتا ہے۔ فہمیدہ بیگم کو اُمید ہوتی ہے کہ اُن کی بھتیجی آ کر سب کا دل جیت لے گی۔ فطرتاً وہ دل کی نرم ہوتی ہیں، اس لیے انہیں مریم کی تکلیف کا بھی احساس ہوتا ہے اور وہ دل میں عہد کرتی ہیں کہ وہ مریم کے لیے اچھا سا رشتہ خود تلاش کریں گی۔ جہاں آرا بیگم جو نفیس احمد کی بیوی ہیں، مریم کا رشتہ ٹوٹنے کے بعد رفیق احمد اور اُن کے گھروں سے سخت ناراض ہو جاتی ہیں۔ ثمینہ اور عرفان کی شادی ہو جاتی ہے۔ عرفان بہت خوش، فہمیدہ بیگم مطمئن اور رفیق احمد اور زرقون اُداس ہوتے ہیں۔ شادی کے دوسرے دن جب زرقون اپنی کزنز کے ساتھ دلہن کو لینے جاتی ہے تو رقیہ بیگم، ثمینہ کو بھیجنے سے انکار کر دیتی ہیں۔ نفیس احمد اس بات کو سُن کر چراغ پا ہو جاتے ہیں۔ فہمیدہ بیگم چاچی زلیخا کے ساتھ ثمینہ کو لینے جاتی ہیں، جہاں اُن کو رقیہ بیگم ایک دوسرے ہی روپ میں ملتی ہیں۔ چاچی زلیخا یہ خبر جہاں آرا بیگم کو سُنانے پہنچ جاتی ہیں۔ جہاں آرا بیگم ایک رات کی دُلہن کے میکے بیٹھ جانے کا سُن کر دل ہی دل میں خوش ہونے کے ساتھ ساتھ حیران رہ جاتی ہیں۔ زرقون کو اپنی مامی کے رویے کا بہت دُکھ ہوتا ہے۔ اُس کے دُکھ پر فراز محبت کے پھائے رکھتا ہے۔ آفتاب احمد جو ایک بہت بڑی کمپنی کے ایم ڈی ہیں، وہ نرگس جو زرقون کی دوست ہے اور جس کا مڈل کلاس سے تعلق ہے، اُس کو بے حد پسند کرنے لگتے ہیں، لیکن نرگس اُن کی پسندیدگی سے ناواقف ہے۔ عرفان اور ثمینہ کی شادی سے رفیق
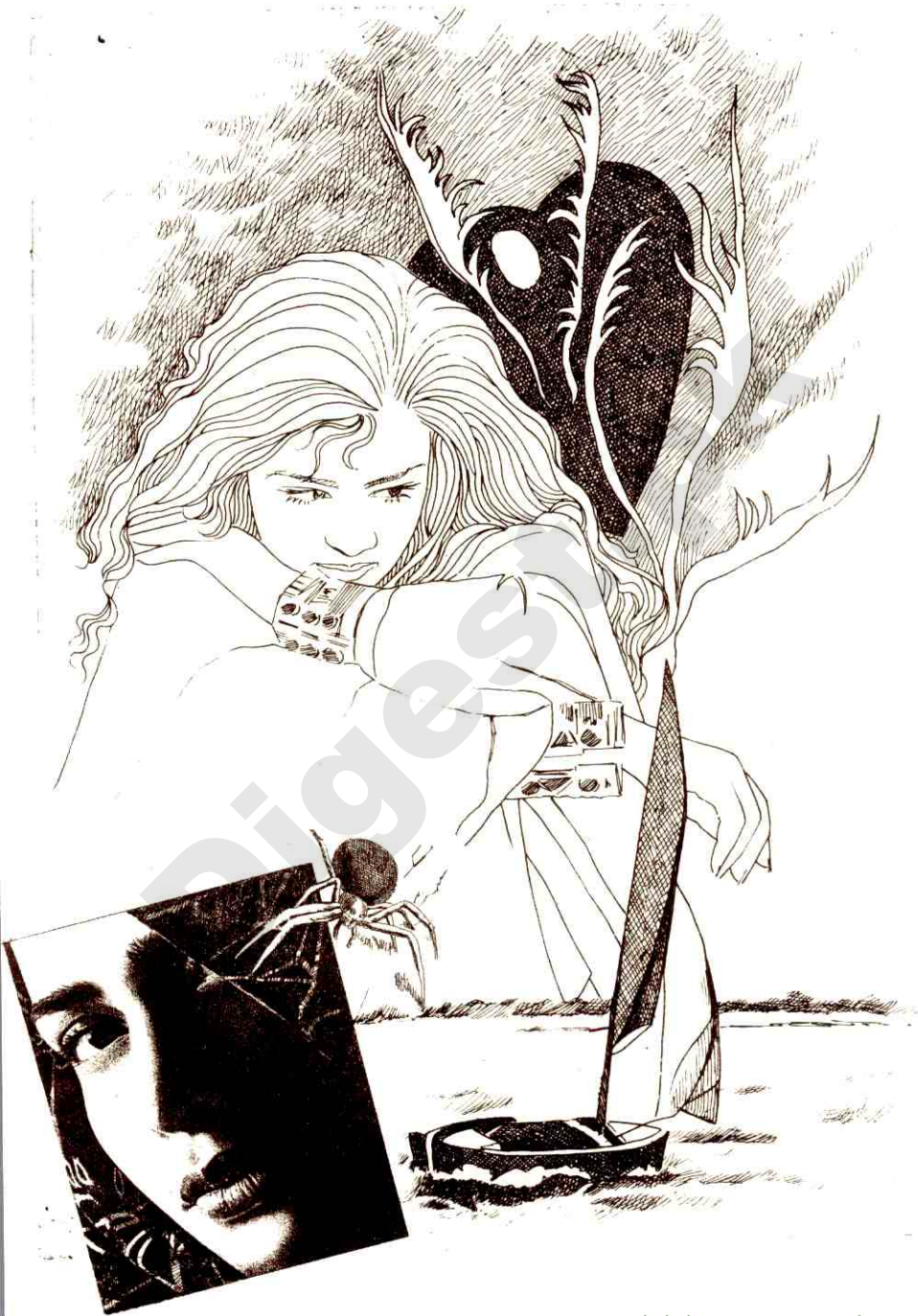
احمد ناخوش ہونے کے باوجود زرقون کو سمجھوتہ کرنے کو کہتے ہیں۔ رفیق احمد ایک رکھ رکھاؤ والے خاندانی آدمی ہیں۔ اُن کے گھر کے کچھ اصول ہیں۔ ثمینہ اُن اُصولوں کی پروانہیں کرتی۔ جس پر اُن کو اعتراض ہوتا ہے۔ ثمینہ پھوپو کے گھر کو سسرال ہی سمجھتی ہے۔ اور وہ سسرال والوں کو تنگ کرنے کا کوئی موقع نہیں گنواتی۔ مریم روز...... روز کے رد کیے جانے کی وجہ سے چڑچڑی اور بیمار رہنے لگی ہے۔ نفیس احمد اور جہاں آرا بیگم بیٹی کی بدلتی ہوئی کیفیت سے بہت پریشان ہیں۔ نفیس احمد دیکھ رہے ہیں کہ حالات تیزی سے کروٹ بدل رہے ہیں، لہٰذا وہ زرقون کا جلد از جلد فراز کے ساتھ بیاہ کردینا چاہتے ہیں۔ فراز، زرقون کو بے حد چاہتا ہے۔ رقیہ بیگم چھوٹی چھوٹی باتوں کو بنیاد بنا کر فہمیدہ بیگم سے سوال جواب کرنے کھڑی ہو جاتی ہیں اور ایسے موقعوں پر ثمینہ مظلومیت کی شاندار اداکاری کرتی ہے۔ عرفان، ثمینہ کا دیوانہ ہے۔ اُن دِنوں جب عرفان کے سر پر ثمینہ کی محبت سوار ہوتی ہے، ایک خوب صورت، خوش مزاج لیڈی ڈاکٹر کا عرفان کی دکان پر آنا جانا شروع ہوجاتا ہے۔ ثمینہ نے اپنے رنگ دِکھانے شروع کردیے ہیں۔ اُس کو فراز اور زرقون سے عجیب سا حسد محسوس ہونے لگا ہے۔ جہاں آرا کے مزاج میں رفیق احمد اور اُن کے گھر والوں کے لیے تلخی بڑھ رہی ہے۔ وہ فراز کو اُن کے گھر جانے سے منع کردیتی ہیں۔ رفیق احمد کی آنکھوں میں کالا پانی اُتر آیا ہے۔ اُن کی آنکھوں کا آپریشن ناکام ہوجاتا ہے۔ عرفان ڈاکٹر تابندہ کو کاروبار کے لیے سونا دے دیتا ہے۔ مریم بہت ساری نفسیاتی اُلجھنوں سے نکل کر آخر زندگی کی طرف قدم بڑھا دیتی ہے۔ زرقون آفتاب کا نمبر حاصل کرکے اُس کو فون کرتی ہے۔ وہ دراصل یہ معلوم کرنا چاہتی ہے کہ آیا وہ نرگس سے محبت کرتا ہے یا نہیں۔ جہاں آرا بیگم نے کھل کر رفیق احمد کے گھرانے، زرقون اور فراز کے رشتے کی مخالفت شروع کردی ہے۔ اس ساری صورت حال سے فراز بہت پریشان رہنے لگا ہے۔ زرقون سب کچھ سمجھ رہی ہے۔ لیکن اُس کو سوائے اللہ کے آگے گڑگڑانے کے کچھ نظر نہیں آرہا۔ اِدھر ثمینہ نے ہنگامہ کھڑا کردیا ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ جلد از جلد الگ ہوجائے۔ مریم کا رشتہ ایک متوسط طبقے سے آتا ہے۔ جہاں آرا بیگم مریم کے رشتے سے بہت خوش ہیں لیکن زرقون اور رفیق احمد کے تمام گھر والوں کے ساتھ اُن کا رویہ بہت سرد ہوجاتا ہے۔ وہ فراز کو رفیق احمد کے گھر جانے سے منع کرتی ہیں۔ فراز بہت پریشان ہے لیکن نفیس احمد اُس کو حالات کو سنبھالنے کی اُمید دلاتے ہیں۔ زرقون جہاں آرا بیگم کے رویہ سے بہت دل برداشتہ ہے۔ ثمینہ ایک بیٹے کو جنم دیتی ہے۔ ثمینہ اور رقیہ بیگم نے سارے خاندان میں بدگمانیاں پھیلا دی ہیں۔ فہمیدہ بیگم کے سارے رشتے دار اُن کی مخالفت کررہے ہیں، جس کا اُن کو بہت صدمہ ہے۔ عرفان نے ثمینہ کو بہت جلد الگ گھر لینے کی اُمید دلائی ہے۔ مرتضٰی اور شیری کے جھگڑے دن بدن بڑھ رہے ہیں۔ شیری ایک مکمل امریکن عورت کا روپ دھار رہی ہے اور مرتضٰی اس بات سے سخت نالاں ہے۔ وہ چاہتا ہے اللہ اُس کو اولاد دے دے۔ شاید اس طرح شیری کو گھر داری کا شوق پیدا ہوجائے۔ آفتاب اور نرگس کی محبت خوب صورت جذبوں کے ساتھ پروان چڑھ رہی ہے۔ لیکن زرقون اور فراز کی محبت تیز آندھیوں کی زد میں ہے۔ اللہ نے ثمینہ کو بیٹے سے نوازا ہے، فہمیدہ بیگم بہت خوش ہیں لیکن رقیہ بیگم ثمینہ کو اپنے ساتھ گھر لے گئیں اور روک لیا۔ اب ان کا مطالبہ ہے کہ ثمینہ کو الگ گھر لے کر دیا جائے۔ وہ چاہتی ہیں کہ فہمیدہ اپنا برسوں کا بسا بسایا گھر بیچ کر عرفان کو ورثہ دے دیں۔ فہمیدہ بیگم ان کے مطالبے سے بہت پریشان ہیں، رقیہ بیگم نے ان کے اور ان کے تمام گھر والوں کے خلاف پورے خاندان والوں کو بدگمان کردیا ہے جس کا فہمیدہ بیگم کو بہت صدمہ ہے۔ مریم کا رشتہ طے ہوگیا ہے۔ جہاں آرا بیگم جہاں مریم کے رشتے سے خوش ہیں وہیں پرانے طے کردہ رشتوں کے بارے میں وہ بہت کچھ سوچ چکی ہیں۔ فراز جہاں آرا بیگم کے رویّے کے بارے میں پریشان ہے لیکن نفیس احمد اس کو تشفی دیتے ہیں کہ جہاں آرا کا غصہ وقتی ہے۔ لیکن فراز مطمئن نہیں ہے۔ زرقون کے دل کو بھی اپنی تائی امّاں کے سرد رویے کی وجہ سے عجیب سی بے چینی ہے۔ وہ فراز سے کہتی ہے، لیکن فراز اُس کو اطمینان دلاتا ہے۔ مریم اب بہت بدل گئی ہے۔ اُس میں ہونے والی ناخوش گوار تبدیلیاں جہاں آرا بیگم کے لیے اطمینان کا باعث ہیں۔ فہمیدہ بیگم اپنے میکے والوں کے رویّے پر بہت دلبرداشتہ ہوجاتی ہیں وہ زرقون اور مریم سے اپنے دِل کی حالت بیان کرتی ہیں اُن کی باتوں کا کچھ حصہ رفیق احمد بھی سُن لیتے ہیں۔ اُن کو احساس ہوتا ہے انجانے میں وہ بھی فہمیدہ بیگم کے ساتھ زیادتی کررہے ہیں وہ دِل ہی دِل میں فہمیدہ بیگم کو معاف کردیتے ہیں اور عہد کرتے ہیں کہ وہ بھی اُن سے معافی مانگ لیں گے۔ لیکن کس معافی تلافی کے بغیر فہمیدہ بیگم ایک رات جو سوتی ہیں تو سوتی ہی رہ جاتی ہیں...... وقار...... کو جہاں آرا بیگم کاروبار کے لیے پیسا دیتی ہیں اور سمجھتی ہیں کہ انہوں نے بیٹی کے لیے سُکھ خرید لیے، لیکن وقار کا شکی مزاج مریم کو ہر وقت ڈستا رہتا ہے اور مریم کے مزاج میں چڑچڑا پن آجاتا ہے...... اِدھر آفتاب نرگس کے لیے اپنے والدین سے بات کرتا ہے...... اُس کے والد کہتے ہیں کہ انہوں نے اُس کے رشتے کے لیے اپنے دوست جنید سے اُن کی بیٹی حیا کے لیے بات کر رکھی ہے۔ آفتاب یہ سن کر حیران رہ جاتا ہے...... جہاں آرا بیگم کے ساتھ ساتھ مریم بھی فراز کے ساتھ زرقون کی شادی کے خلاف ہے کیوں کہ مریم کا خیال ہے اگر اس کی شادی عرفان سے ہوجاتی تو اُس کو دِن رات وقار کے طعنے تو سُننے کو نہ ملتے...... زرقون کے لیے فراز کی محبت سے اُس کو حسد ہونے لگتی ہے۔ جہاں آرا بیگم نے زرقون کے خلاف ایک محاذ کھڑا کر رکھا ہے کیونکہ مریم نہیں چاہتی زرقون کی شادی فراز سے ہو۔ زرقون اور فراز بدلتے حالات

کی وجہ سے بہت پریشان ہیں۔ زرقون فراز سے کہتی ہے کہ وہ وعدے کرے کہ وہ اُس کے علاوہ کسی اور سے شادی نہیں کرے گا۔ تو وہ ساری زندگی اُس کا انتظار کرنے کے لیے تیار ہے۔ رفیق احمد، رقیہ بیگم سمیت فہمیدہ بیگم کے سارے خاندان کو اپنے گھر آنے سے منع کر دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ثمینہ اور عرفان پر کوئی پابندی نہیں وہ جب جس کے گھر جانا چاہیں جا سکتے ہیں، لیکن اُن کے گھر کوئی نہیں آئے گا۔ مرتضیٰ اپنی ماں کے سمجھانے پر شیری سے ایک بار پھر سمجھوتے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ آفتاب حیا کو نرگس کے بارے میں بتاتا ہے وہ چاہتا ہے حیا اِس رشتے سے انکار کر دے۔ وہ حیا کو چائے پر لے کر جاتا ہے لیکن حیا کوئی جواب دیے بغیر اُٹھ کر چلی جاتی ہے۔ آفتاب پریشانی سے سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ ثمینہ کو فہمیدہ بیگم کے بعد بہو ہونے کے ناتے گھر کی ذمے داری سپرد کی جاتی ہے۔ لیکن وہ حد سے زیادہ لاپروائی اور بے حسی کا مظاہرہ کرتی ہے اور یوں اُس کا اور زرقون کا پہلا جھگڑا ہوتا ہے۔

(اب آپ آگے پڑھیے)

''تم نے آفتاب کے لیے تو انکار کر دیا۔ ویسے ایک بات بتا دوں حیا مجھے اور تمہارے پاپا کو تمہارے اِنکار کا کوئی سر پیر نظر نہیں آ رہا ہے۔'' روحی نے خاموش لیٹی حیا سے پوچھا، حیا خاموش رہی۔

''میں تم سے کچھ کہہ رہی ہوں اور تم گونگے کا گُڑ کھا کر بیٹھی ہو۔ میں کہتی ہوں حیا اگر آفتاب تم کو پسند نہیں تھا۔ تمہاری مرضی نہیں تھی تو وہ سب ڈرامہ رچانے کی ضرورت کیا تھی۔ اب ہم تو پریشان ہو گئے ہیں ایک، ایک کو جواب دیتے ہوئے، روحی نے جھنجلا کر خاموش بیٹھی، دیواروں کو تکتی حیا کو جیسے لتاڑ ہی ڈالا۔

''اوفوہ ممی! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آفتاب اِتنا بڑا مسئلہ کیوں بن گیا ہے۔ وہاں اس کی منگنی ہو گئی ہے۔ شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں اور یہاں ہمارے گھر میں اب بھی یہی مسئلہ زیرِ بحث ہے کہ آفتاب سے منگنی کیوں توڑی گئی ہے۔ It Is Enough Mummy۔'' حیا کا لہجہ بیزار تھا۔

''ہاں میں جانتی ہوں وہاں شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ صبح بھابی کا فون آیا تھا، بتا رہی تھیں، لیکن سوال یہ ہے حیا، جب تم نے اِس رشتے کو خود ختم کیا ہے تو پھر اب یہ روتی بسورتی شکل بنا کر جوگ کس بات کا لیے بیٹھی ہو۔ پہلے کی طرح ہنستی بولتی کیوں نہیں ہو؟ کلب کیوں نہیں جا رہی تمہارے دوستوں کے فون آ رہے ہیں اُن سے بات کیوں نہیں کر رہی ہیں۔'' روحی نے جرح کی۔

''دوست۔'' حیا کے لب کانپے۔

''پتا ہے مما! اَفی نے اپنی ساری ٹافیاں مجھے دے دیں اور اَفی کہہ رہا تھا تم چاہو تو میرا بیٹ بھی لے لو۔'' ننھی سی حیا نے پونیاں ہلاتے ہوئے فخریہ لہجے میں ہنستی مسکراتی روحی کی گود میں چڑھتے ہوئے کہا۔

''اچھا! تو اَفی آپ کا دوست ہے۔'' مسز اسد نے اُس کے گالوں پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''اور کیا آنٹی! اَفی میرا بہت اچھا دوست ہے۔ اسکول میں بھی بہت خیال رکھتا ہے۔ اگر کوئی بچہ مجھے تنگ کرے تو اَفی اُس بچے کی خوب پٹائی لگا دیتا ہے۔ اُف آنٹی آپ کو نہیں پتا He Is Wonderful Boy۔'' ننھی سی حیا کا لہجہ فخر سے بھرپور تھا۔

''چلو یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ اَفی آپ کا اِس قدر خیال رکھتا ہے۔'' مسز اسد بیٹے کی تعریفوں پر کھل کر مسکراتے ہوئے بولیں۔

''ویسے ایک بات ہے، روحی ہماری دوستی تو ہے ہی لیکن ہماری دوستی کو پائیدار ان بچوں کی دوستی نے بنا دیا ہے جو کبھی ہم کو فرصت نہ ہو تو یہ چلے آتے ہیں۔ رابطے قائم رہتے ہیں، رابطے ٹوٹتے نہیں ہیں۔ اصولاً مرتضیٰ اور آفتاب میں دوستی ہونی چاہیے لیکن شروع ہی سے آفتاب کو حیا اچھی لگتی ہے۔ اور حیا کی خاطر اُس نے ایک گریڈ کم میں ایڈمیشن لیا تا کہ وہ حیا کے ساتھ رہ سکے۔ میرے خیال سے This Is Wonderful

(میرے خیال سے یہ دوستی اور محبت کی بہترین مثال Example Of Love And Friendship ہے)''مسز اسد نے محبت سے ایک ایک کر کے ساری ٹافیوں کو ختم کرتی حیا کو دیکھتے ہوئے روحی سے کہا۔

آج سنڈے تھا۔ اسد علی خان اور جنید دونوں گولف کورس گئے ہوئے تھے۔ روحی کو جنید، حیا اور مرتضٰی کے ساتھ حیا کی ضد کی وجہ سے کہ آفتاب کے ساتھ کھیلنا ہے اسد علی خان کے گھر ڈراپ کر گئے تھے اور حیا اُس کو تو لگ رہا تھا جیسے عید ہو۔ وہ اسد علی خان کے خوبصورت محل نما گھر میں اِدھر سے اُدھر خوبصورت رنگین تتلی بنی اُڑتی پھر رہی تھی۔

آفتاب کو وہ ہمیشہ سے ایک پنک کلر کی گڑیا لگتی تھی جس کی ہنسی کے لیے جس کی خوشی کے لیے وہ اپنا قیمتی سے قیمتی کھلونا توڑ دیتا تھا۔

''بھئی حیا! اپنے گھر چلو۔'' روحی نے کھیل میں مگن حیا کو پیچھے سے آواز دی۔

''نہیں ممی! میں نہیں جارہی۔ میں اَفی کے ساتھ رہوں گی۔'' حیا نے قطعیت سے ماں کو انکار کیا۔

''ارے یہ کیا بات ہوئی بیٹا۔ کسی کے گھر اتنی دیر تھوڑی بیٹھتے ہیں۔ بس اپنے گھر چلو، بُری بات۔'' روحی نے حیا کو بہلایا۔

''ارے...... روحی جب بچی کا دل نہیں چاہ رہا تو رہنے دو نا۔'' مسز اسد نے محبت سے حیا اور آفتاب کو کھیلتے دیکھ کر کہا۔

''جی...... ممی...... مجھے رہنے دیں نا۔'' حیا گڑگڑائی۔

''حیا تمہارا تو یہاں سے جانے کا دل ہی نہیں چاہتا۔ ایسا کرتے ہیں تمہاری شادی آفتاب سے کر دیتے ہیں، پھر تم ہمیشہ ہمارے ساتھ رہو گی۔'' مسز اسد نے محبت سے حیا کو چمکارا۔

''اَفی سے شادی کے بعد مجھے ممی کے گھر نہیں جانا پڑے گا۔ اَفی کے سب کھلونے مجھے مل جائیں گے۔ بس میں تو اَفی سے ہی شادی کروں گی۔'' حیا نے خوشی سے تالیاں بجائیں۔

''اَفی تم کو یاد ہے، تم بچپن میں اپنی ساری چیزیں مجھے دے دیا کرتے تھے اور آج...... آج یہ آئس کریم، تم یہ آئس کریم اکیلے کھا رہے ہو۔ تم کو بچپن کی کوئی بات یاد نہیں ہے۔''

حیا جو ابھی ابھی آفتاب کے آفس میں داخل ہوئی تھی۔ آفتاب کو آئس کریم کھاتا دیکھ کر ندیدے انداز میں اُس کے آگے سے آئس کریم کا کپ اٹھاتے ہوئے رقت بھرے انداز میں بولی۔

''ارے! مجھے بچپن کی ہر بات یاد ہے۔ مس ندیدی بلکہ مجھے تو یہ بھی یاد ہے کہ تم بچپن ہی سے مجھے لائن مارتی تھیں اور بچپن ہی سے میرے چکر میں تھیں اور مجھ سے شادی کرنے کے لیے میری ممی کو مکھن لگاتی تھیں۔'' آفتاب نے حیا کو ٹھنڈی آئس کریم حلق سے اُتارتے دیکھ کر اپنے دل کے پھپھولے پھوڑے۔

''وہ تو ہے...... شادی تو میں تم سے ہی کروں گی۔'' حیا نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔

''تم نے ساری آئس کریم کھالی ندیدی۔'' آفتاب نے آئس کریم کے خالی کپ کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے دل گرفتگی سے کہا۔

''Oh Yes See۔'' حیا اٹھلائی۔

''تم...... حیا تم...... دل چاہتا ہے تم کو گولی ماردوں۔'' وہ اب آفتاب کے موبائل فون میں اپنی سم ڈال کر فون اپنے پرس میں رکھ رہی تھی۔

''میرا فون دو۔'' آفتاب چیخا۔

''I Am Sorry اَفی...... دراصل میرا فون مس ہوگیا ہے۔ اور You Know میری زندگی موبائل فون کے بغیر ادھوری ہے اور تم جیسے ناکارہ ترین انسان کو فون کی کیا ضرورت ہے۔ تم کو لفٹ ہی کون کرواتا ہے۔ بہت سے بہت تم کو مجھ سے بات کرنی ہوتی ہے۔ تو میرے خیال میں اگلے چند دن تک تو تمہارا دل قطعی نہیں چاہے گا مجھ سے بات کرنے کو، تو یہ پھر میرے ہی پرس میں ٹھیک ہے۔''

حیا اُس کے غصے کو انجوائے کر رہی تھی اور وہ کون سا غصہ کر رہا تھا۔ اُس کا غصہ ہوتا ہی کتنی دیر کا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر بعد وہ سب بھول بھال کر حیا سے گپیں مارتا ملتا۔ حیا اُس کی واحد دوست تھی اور حیا اُس کی زندگی میں اپنی اہمیت سے واقف تھی۔ لیکن لمحہ لمحہ زندگی کروٹ بدلتی ہے۔ دل بدلتا رہتا ہے۔ زندگی کی ترجیحات بدلتی رہتی ہیں۔ حیا نہیں جانتی تھی۔

''میں تو سوچتا ہوں وہ شخص کون ہوگا۔ جس کے پلّے تم بندھو گی۔ میری تو ابھی سے ساری ہمدردیاں اُس نامعلوم شخص کے ساتھ ہیں۔''

ہر طرح کی کوشش کے باوجود موبائل فون پر صبر کرنے کے بعد اپنی کُرسی پر بیٹھتے ہوئے آفتاب نے جلے بھُنے لہجے میں کہا۔

''وہ شخص تم ہو گے صرف تم اَفی تم۔'' حیا کے دل کی بات زبان سے بھی ادا ہوئی۔

''اللہ نہ کرے۔'' آفتاب بڑبڑایا۔

''اللہ ایسا ہی کرے گا۔'' حیا ہنسی۔ وہ آفتاب سے اتنی ہی کلوز تھی۔ اُس کی زندگی میں آفتاب کے علاوہ کوئی رنگ نہیں تھا۔

''منہ دھو رکھیے مس بے حیا۔ تم سے تو میں مر کر بھی شادی نہیں کروں گا۔ انشاء اللہ۔'' آفتاب کا لہجہ پُریقین تھا۔ ایک لمحے کو حیا کو اپنا دل نہ جانے کیوں زندگی میں پہلی بار رُکتا ہوا محسوس ہوا۔ اُس کے اور آفتاب کے درمیان ایسی ہی گفتگو ہوتی تھی لیکن نہ جانے آفتاب کے لہجے میں آج کیا تھا کہ ایک لمحے کے لیے حیا کو چپ سی لگ گئی۔

''بولتے رہو، اسد انکل نے کل ہی میرے ڈیڈی سے بات کی ہے۔ تمہاری مرضی کے بغیر وہ اِتنی بات آگے کیسے بڑھا سکتے ہیں۔ میں تمہاری محبت اور واحد دوست ہوں۔ حیا کے دل نے آفتاب کو جیسے سرزنش کی۔

''میرا ایک ہی تو دوست تھا ممی!'' حیا جو خیالوں کی وادی میں بھٹک رہی تھی روحی کے کندھا ہلانے پر خود فراموشی کی حالت میں گویا ہوئی۔

''یہی تو......''

''پلیز ممی! اب اِس Topic کو ختم کریں۔ آپ میری ماں ہیں۔ میں آپ سے کہہ رہی ہوں، مجھے آفتاب سے منگنی ٹوٹنے کا کوئی غم نہیں ہے۔ میں ذرا اپنی اسٹڈی کی طرف سے پریشان ہوں۔ آپ پلیز میرا ایڈمیشن یونیورسٹی آف نیویڈا میں کنفرم کردیں تا کہ میں جا کر یکسوئی کے ساتھ اپنی اسٹدی کمپلیٹ کرسکوں۔'' حیا نے کھڑے ہو کر پیروں میں چپل اٹکاتے ہوئے گم صم کھڑی ماں سے کہا۔

''لیکن......'' روحی نے کچھ کہنا چاہا۔

''اب آپ پھر وہی سوال دھرائیں گی جو پچھلے چند ہفتوں سے سُن سُن کر میرے کان پک گئے ہیں۔ دل میں زخم پڑ گئے ہیں۔ اعصاب چٹخنے لگے ہیں۔ ممی یہ میری زندگی کو بدل دینے والا فیصلہ ہے۔ میرے اِس فیصلے کا 'سر' بھی ہے اور 'پیر' بھی ہے۔ میں آفتاب سے بہت محبت کرتی ہوں۔

میرے نزدیک محبت اور محبت کا مفہوم 'اَنی' ہے۔ لیکن ممی یکطرفہ محبت گھر نہیں بنا سکتی۔ میں آفتاب کے ساتھ ایک محبت بھرا گھر بسانا چاہتی تھی۔

اگر میں بالفرض آفتاب سے شادی کر بھی لیتی تو محبت بھرا گھر تو دور کی بات میں گھر بھی نہیں بسا سکتی میں آرام و آسائش سے بھرپور ایک مکان میں رہتی۔

میں آفتاب سے کیسے شادی کرتی۔ جبکہ وہ مجھ سے شادی کرنا ہی نہیں چاہتا۔ اُس کی محبت، اُس کے خواب، اُس کی خوشیاں، اُس کا سب کچھ کسی اور لڑکی کے ساتھ جڑا ہے۔ میں تو اُس کی زندگی میں کہیں بھی نہیں ہوں۔''
حیا نے دکھی دل سے سوچا۔

ہم بہت ساری باتیں صرف سوچ سکتے ہیں اور حیا بھی سوچ رہی تھی۔

''No Argument Mummy۔'' حیا نے سوچوں کے گرداب سے باہر نکلتے ہوئے لہجے کو پُراعتماد بناتے ہوئے مسکراتے لہجے میں ماں سے کہا۔ اور نہ جانے کیوں اُس کا مسکرانا، روحی کو رُلا گیا۔

وہ ماں تھیں...... اور ماں...... اپنی اولاد کی رگ رگ سے واقف ہوتی ہے۔ لیکن اِس وقت......

☆......☆......☆

''کیوں؟'' مریم نے حیرت سے ماتھے پر بل ڈالے تڑختے ہوئے لہجے میں بولتی ساس سے پوچھا۔

''بس ہماری مرضی۔'' مریم کی ساس ایسی ہی تھیں بدلحاظ۔

''دیکھیں بھابی۔ آپ کا بھائی تو آپ کی کزن کا دیوانہ ہے اور میں کم از کم کسی ایسے لڑکے سے شادی نہیں کر سکتی جو کسی اور لڑکی کا کلمہ پڑھتا ہو۔'' شمائلہ اتنی زبان دراز ہے اِس کا اندازہ کم از کم مریم کو نہیں تھا۔

شمائلہ کو فراز پسند تھا وہ اُس سے شادی کرنا چاہتی تھی وہ اپنی ماں کی بہت سرچڑھی تھی اُس نے ضد کر کے مریم کی شادی وقار سے کروائی تھی لیکن اُس کو اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ فراز کسی اور میں اِس حد تک دلچسپی رکھتا ہوگا۔ وہ شاید اِس بات کو بھی نظر انداز کر دیتی لیکن جب سے گلشن میں رہنے والی اُس کی دوست کے بھائی نے اُس سے شادی کی خواہش کا اظہار کیا وہ تو جیسے ہواؤں میں اڑنے لگی۔ فراز کے چھ سو گز کے بنگلے کے آگے احمر کا امریکن پاسپورٹ اور ہزار گز کی کوٹھی بہت پُرکشش تھی۔ سو مہینوں سے چڑھایا خوش اخلاقی کا لبادہ اُس نے ایک جھٹکے میں اُتار پھینکا۔ ویسے بھی اب اُس کو اس لبادے کی ضرورت نہیں تھی۔

''ویسے بھی میری بچی میں کوئی کمی نہیں ہے۔ بڑے بڑے گھروں سے اُس کے رشتے آرہے ہیں۔ میرے وقار کے ساتھ ہی زیادتی ہوگئی کافی ہے۔ اب میں اپنی بچی کو تو قطعی نہیں جھونکوں گی۔''

''ایسا کہا تمہاری ساس نے۔'' جہاں آرا نے ساری بات اطمینان سے سُننے کے بعد بے یقنی سے مریم سے پوچھا۔ مریم آج خاص طور پر اپنی ساس کا پیغام لے کر میکے آئی تھی۔ اُس کا غصے سے برا حال تھا۔

''تو کیا امی میں جھوٹ بول رہی ہوں۔ اِدھر کی اُدھر لگا رہی ہوں۔ آپ کو کیا پتا انہوں نے میری کتنی بے عزتی کی ہے۔ میرا تو دل چاہ رہا تھا۔ اپنا سامان باندھوں اور چلی آؤں۔ اور اب آ گئی ہوں تو واپس جانے کا دل نہیں چاہ رہا۔ پہلے تو اُن لوگوں کو مجھ سے یہ لالچ تھا کہ اُن کی موٹی ناک والی پھیکا شلجم بیٹی کو میں اپنے شہزادے جیسے بھائی سے بیاہ کر لے جاؤں گی اور اب تو وہ لالچ بھی ختم، ایک تو ویسے ہی میری اوقات دو کوڑی کی ہے۔ اب تو میری اور مٹی پلید ہو جائے گی۔ اللہ فہمیدہ چچی سے پوچھے۔'' مریم چیخ چیخ کر اپنی فرسٹریشن ظاہر کر رہی تھی۔

''بُری بات مریم! بہت بُری بات۔ فہمیدہ کا اب انتقال ہوگیا ہے۔ جو اللہ کے پاس چلا گیا اُس کو اب کیا کوسنا، پیٹنا یا بُرا بھلا کہنا۔'' جہاں آرا بیگم نے درشت لہجے میں مریم کو ٹوکا۔

''ہاں بھئی مرگئیں تو مرگئیں، ہماری زندگی بھی عذاب کرگئیں۔ اگر وہ اپنی بھتیجی کو بیاہ کر نہ لاتیں تو کم از کم یہ جو میں ہر وقت سولی پر لٹکی رہتی ہوں، ایسا تو نہیں ہوتا نا۔ اور امی میں آپ کو بتا رہی ہوں میں کسی بھی قیمت پر زری کی شادی فراز سے نہیں ہونے دوں گی۔ اگر فراز یہ سمجھ رہا ہے کہ میں ہمت ہار دوں گی یا اُس کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال دوں گی یا آپ لوگوں کو منالوں گی تو ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ مجھے زری سے نفرت ہے میں زری کو ہنستا مسکراتا اور خوش نہیں دیکھ سکتی۔''

مریم ہسٹریائی انداز میں چیخ رہی تھی اور جہاں آرا بیگم کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے کہ گھر میں داخل ہوتے نفیس احمد کو وہ دیکھ چکی تھیں۔

''مجھے آج مریم کی باتیں سُن کر بہت رنج ہوا۔ میں جب سے مسلسل یہ سوچ رہا ہوں کہ ہماری تربیت میں کہاں کمی رہ گئی کہ مریم اتنی بدتمیز ہوگئی ہے؟''

رات کے کھانے کے بعد جب چائے کا کپ لے کر جہاں آرا بیگم میاں کے پاس آئیں تو انہوں نے دلگرفتہ لہجے میں کہا۔

''اور یہ چائے لے جایئے میرا دل نہیں ہے۔'' انہوں نے بھاپ اُڑاتی چائے کو دیکھ کر عجیب سے لہجے میں کہا۔

''چائے تو پی لیں آپ نے کھانا بھی صحیح طرح نہیں کھایا اور رات کو آپ چائے تو پیتے ہی ہیں ورنہ آپ کے سر میں درد ہو جاتا ہے۔'' جہاں آرا بیگم اُن کے بستر پر جگہ بناتے ہوئے، اُن کے پیروں کے قریب بیٹھ کر ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے گویا ہوئیں۔

''اور ویسے بھی آپ خود سوچیں، مریم کی ساس نہ جانے اُس کو کیا کیا باتیں سُناتی ہوں گی۔ کیسے کیسے اُس کا کلیجہ نوچتی ہوں گی۔ میری بچی رات دن اُن کے گھر میں کولہو کے بیل کی طرح جُتی رہتی ہے۔ وہ تھک جاتی ہے۔ اور......''

''تو اِس کا مطلب ہے وہ گالم گلوچ کرے۔ بڑے چھوٹوں، مردہ زندہ، جس کو جو دل چاہے کہے۔ میرا بھائی اتنا پریشان ہے لیکن آپ دونوں ماں بیٹی، ایک ضد باندھے بیٹھی ہیں۔ آپ دونوں نے تہیہ کرلیا ہے کہ میرا بھائی چھڑوا کر ہی دم لیں گی۔ ایک غلطی اُن کی طرف سے ہوگئی تو ضروری ہے کہ ہم بھی اُس غلطی کو دہرائیں۔ ارے اِن نماز روزوں سے زیادہ حسن اخلاق کی اہمیت ہے۔ زمین پر رہنے والوں کو ہم معاف نہیں کرتے اور اُمید کرتے ہیں کہ آسمان پر رہنے والا ہم کو معاف کردے گا۔ ایسا کیسے ہوسکتا ہے ہوتا تو وہی ہے جو اللہ نے رقم کردیا لیکن ہم کتنے کم ظرف ہیں یہ بات ہم بار...... بار دھراتے ہیں اور ساری دنیا کو بتاتے ہیں۔''

نفیس احمد نے بیٹی کا کمزور دفاع کرتی جہاں آرا بیگم کی بات کاٹی اور بھیگے لہجے میں کہا۔

''آپ کی بات صحیح ہے لیکن ہم انسان ہیں اتنا ظرف اپنے اندر کہاں سے لائیں۔'' جہاں آرا بیگم نے نرم نرم مٹھیوں سے میاں کی پنڈلیاں دباتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔

''بس جو بات آپ کو نہیں کرنی، وہاں پر آپ ظرف اور کم ظرفی کا تذکرہ لے آتی ہیں۔ جہاں آرا بیگم آپ کے ہر جگہ اپنے قانون ہیں۔ میں سمجھتا تھا میرا گھر آپ بہت احسن طریقے سے سنبھالے ہوئے ہیں مگر مجھے نہیں پتا تھا کہ میرے گھر میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ حد ہے اندھیر کی۔'' نفیس احمد کا لہجہ آہستہ آہستہ تیز ہو رہا تھا۔

''کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ ساری زندگی کی کمائی دو لمحوں میں ضائع کر رہے ہیں۔ کیا ہے جو میں نے آپ کے گھر کے لیے نہیں کیا۔'' جہاں آرا بیگم جو میاں کو منانے کے لیے حد درجہ میٹھی بنی ہوئی تھیں۔ تنتنا کر بولیں۔

''گھر سنبھالنا، جھاڑو برتن، روٹی سالن پکانا نہیں ہوتا، گھر سنبھالنا بچوں کی تربیت ہے۔ یہ آپ نے میرے بچوں کی کیسی تربیت کی ہے۔ نہ اِن میں صبر و برداشت ہے اور نہ ہی عفو و درگزر۔ نہ چھوٹے بڑے کی تمیز۔ ہماری بیٹی کو اگر تھوڑی سی مشکل ملی تو اتنا کچھ کرنے کے باوجود نہ تو وہ خوش ہوتی ہے اور نہ ہی نظر انداز کرتی ہے۔ میں دیکھ رہا تھا احمر کی شادی میں کہ اُس کا رویہ زرقون کے ساتھ بہت روکھا پھیکا تھا لیکن آفرین ہے اُس بچی پر وہ اُسی طرح رہی۔ کسی بات سے، کسی عمل سے وہ یہ ظاہر نہیں کر رہی تھی کہ آپ دونوں ماں بیٹیاں اچھی طرح اُس کو ذلیل کر رہی ہیں اور یہ بات جب میں نوٹ کر سکتا ہوں تو اور لوگوں نے کیا نہیں نوٹ کی ہوگی؟''

''اونہہ! زری، زری، زری!! ہر وقت زری کی تسبیح پڑھتے رہتے ہیں، ساری زندگی اِن کے گھر میں اِن کی جوتیاں سیدھی کرتے گزار دی۔ سیاہ بال سفید ہوگئے۔ نہ دن دیکھا نہ رات...... اُن کی جی جی کرتی رہی اور یہ فرما رہے ہیں کہ میں نے صحیح طرح اِن کا گھر نہیں سنبھالا۔ مریم صحیح کہتی ہے کہ ابھی تو زری اِس گھر میں آئی نہیں ہے۔ تو اِس پر یہ حال ہے کہ یہ باپ بیٹے اُس کے نام کی مالا جپتے پھرتے ہیں۔

مجھے اِس مسئلے کا حل نکالنا ہوگا۔ میری بچی اِس قدر پریشان اور دکھی ہے اور میں دوسروں کے غم سمیٹتی پھروں اور غم بھی اُن لوگوں کے جنہوں نے ایک نہ ختم ہونے والی پریشانیوں کا سلسلہ میرے آگے کھڑا کر دیا ہے۔ ایک مسئلہ ختم ہوتا ہے تو دوسرا شروع ہو جاتا ہے۔ میں تھک گئی ہوں۔

بس ٹھیک ہے مریم صحیح کہتی ہے۔ مجھے اِس معاملے کو دوسرے انداز سے ہی دیکھنا چاہیے۔ نفیس احمد نہ جانے کب کے کروٹ بدل کر سو چکے تھے اور جہاں آرا بیگم بیٹھی سوچوں کے تانے بانے سلجھا رہی تھیں یا زندگی کو مزید اُلجھا رہی تھیں۔

☆......☆......☆

ساری زندگی میری گزر گئی۔ اِدھر کی اُدھر کرتے کرتے، تیری میری خوشامدیں کرتے، اب جب ہاتھ میں کچھ نہیں رہا۔ نہ وقت، نہ زندگی، نہ کوئی خوشی اور نہ ہی زندہ رہنے کا سبب، لیکن پچھتاوا، ہاں پچھتاوا ساری زندگی اب میرا پیچھا کرے گا۔ میں تو جیتے جی مرگئی۔ بچپن سے سُنا تھا کر بھلا ہو بھلا۔ لیکن میں ایسی بدنصیب تھی کہ اتنی آسان سی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ سب سے زیادہ خسارے میں وہ لوگ ہیں جو دوسروں کی دنیا کے لیے اپنی آخرت تباہ کر لیتے ہیں۔ آہ! میں نے ہاں مجھ بدنصیب نے بھی دوسروں کی دنیا کے لیے اپنی دنیا تو دنیا اپنی آخرت بھی تباہ کر لی۔ ہائے اِس انسان ناشکرے کے لیے جس کے شکوے اللہ سے ختم نہیں ہوتے۔ جو ہزار نعمتوں کے بعد ذرا سی آزمائش پر اللہ سے شکایتیں کرنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ اُس انسان ناشکرے کے لیے میں نے جہنم کی آگ خرید لی۔

کیا کچھ نہیں کیا میں نے۔ کتنے دل توڑے۔ کس قدر اِدھر اُدھر کی باتیں کی، ایک رقیہ بیگم کو خوش کرنے کے لیے لیکن وہ کمبخت کبھی خوش نہ ہوئی۔ میں سمجھتی تھی وہ میری ہے۔ میری ہمدرد اور میری دوست لیکن آج سوچتی ہوں تو خیال آتا ہے وہ تو نہ میری ہمدرد تھی اور نہ ہی دوست۔ وہ تو کسی کی بھی نہیں ہے۔ وہ تو ایک زہریلی ناگن تھی جس کو میں نے ہمیشہ دودھ پلایا لیکن مجھے کیا ملا۔ آہ......

فہمیدہ کیسی سیدھی سادی، نیک اور سُلجھی ہوئی تھی ہمیشہ سے۔ محبت کرنے والی اور پُرخلوص۔ لیکن نہ جانے کیوں میں رقیہ کی باتوں میں آ گئی۔ فہمیدہ نے مجھ بیوہ کا ہمیشہ ہی خیال رکھا۔ ہمیشہ میری عزت کی۔ میرے برے وقتوں میں کام آئی۔ اور میں بدنصیب...... احسان فراموش...... اُس کا ہر احسان بھول گئی۔ یاد رہا تو صرف یہ کہ اگر رقیہ ناراض ہوگئی تو یہ جو سر چھپانے کو ایک ٹھکانہ مل گیا ہے وہ چھن جائے گا۔ میں نے اللہ پر بھروسہ نہ کیا۔ اُس کے بندوں سے اُمیدیں باندھ لیں۔

اور واقعی جو اللہ سے نہیں مانگتا۔ جو اللہ کے آگے نہیں جھکتا۔ وہ سب سے مانگتا ہے اور سب کے سامنے شرمندہ ہوتا ہے۔

بعض گناہ ایسے ہوتے ہیں جن کی تلافی ہم چاہیں بھی تو نہیں کر سکتے۔ میں نے زندگی میں بہت سے گناہ کیے ہیں لیکن فہمیدہ کے ساتھ جو کیا اُس کی تلافی ناممکن ہے۔ وہ تو منوں مٹی تلے جا سوئی۔ اب میں کیسے اُس کے پیر پکڑوں۔ کیسے اُس سے معافی مانگوں۔ ہم کتنے ہی گناہ کرلیں، اللہ سب دیکھ رہا ہے۔ وہ بعض اوقات گناہگاروں کی رسی دراز کر دیتا ہے لیکن رسی کا سرا تو اُس کے ہاتھ میں ہی ہوتا ہے۔ جب چاہتا ہے کھینچ لیتا ہے۔ اُس نے میری دراز رسی بھی کھینچ لی۔ مجھ گناہگار کو اب کیسے معافی ملے گی۔

خودکشی حرام نہ ہوتی تو شاید میں زہر کھا کر مر جاتی لیکن سوچتی ہوں ساری زندگی غلط کام کیے۔ اب موت بھی حرام مروں؟''

کیسی بے عزتی کی تھی فہمیدہ کی میں نے رقیہ کی باتوں میں آ کر مجھے سو فیصد یقین ہے وہ جو سوتے سوتے ہی اللہ کے پاس چلی گئی اُس دن کی بے عزتی نے اُس کو بے موت مار دیا۔

میرے اللہ تُو مجھے معاف کر دے۔ میرے لیے کوئی ایک در ایسا کھول دے کہ میں اپنے گناہوں کی تلافی کر سکوں۔ شاید اب چین سے جی تو نہ سکوں گی لیکن چین سے مر ضرور سکوں۔

میرے مالک تُو سب کی سنتا ہے۔ تُو بڑا رحمٰن ہے تو بڑا مہربان ہے۔ تُو کریم ہے۔ تُو رحیم ہے۔ تُو غفور ہے۔ تُو حکیم ہے۔ تُو مجھے معاف کر دے اور میرے لیے کوئی ایک در ایسا کھول دے کہ جو میں نے کیا ہے اُس کی تھوڑی بہت تلافی کر سکوں میں پشیمان ہوں۔ آج اکیلی ہوں۔ جب عمر کی نقدی ختم ہوئی تو معلوم ہوا سارے آسرے بے کار تھے۔ جھوٹے تھے۔ بس ایک تیرا ہی آسرا ہے۔ ایک تیرا ہی در ہے جو ہر وقت کھلا رہتا ہے۔

خالہ بتّو کے بیٹے کا جنازہ جا چکا تھا۔ ایک ایک کر کے سارے لوگ اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔ اپنے فلیٹ کے سیلن زدہ کمرے میں خالہ بتّو اکیلی بیٹھی تھیں۔ جس بیٹے کو انہوں نے ساری زندگی دے کر پالا تھا، وہ بیٹا اپنی بیماری نہ سہہ سکا۔ علاج کروانے کے باوجود، خالہ بتّو اُس کو نہ بچا سکیں۔ اور جب اُن کے اپنے ہاتھ خالی ہوئے تو اُن کو احساس ہوا۔ اُن کے ہاتھوں کے ساتھ ساتھ اُن کا دل بھی خالی ہو گیا۔

اور اِس وقت پلستر اکھڑی سیلن زدہ، وحشت برساتی دیواروں کے درمیان تنہا بیٹھی خالہ بتّو اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھیں۔ تلافی کا در ڈھونڈ رہی تھیں۔ بیٹے کی جدائی کے ساتھ ساتھ زندگی میں کی گئی بے انصافیاں اور گناہ اُن کو رُلا رہے تھے۔

اُن کے رویے نے رفیق احمد کے گھر کا سکون چھینا تو بدلے میں اُن کو اپنے گھر کا چراغ دینا پڑا۔ بڑھتا اندھیرا اُن کو احساس دلا رہا تھا کہ انہوں نے گھاٹے کا سودا کیا۔

اب وہ اپنی بے رونق اور بے مصرف زندگی میں کوئی اچھا کام کرنا چاہتی تھیں۔ یوں تو زندگی میں انہوں نے بہت سی غلطیاں کی تھیں لیکن کچھ غلطیاں ایسی تھیں جن کی وہ تلافی کر سکتی تھیں۔ اور وہ تلافی کرنا بھی چاہتی تھیں۔ اور جب بندہ اپنے گناہوں پر شرمندہ ہو کر اللہ سے توبہ استغفار کر رہا ہو۔ تو اللہ اُس کو دوبارہ موقع دیتا ہے اور آسمانوں پر بیٹھا کاتب تقدیر خالہ بٹو کی آہ وزاری بھی سن رہا تھا اور پھر اُس نے فیصلہ لکھ ڈالا۔

☆......☆......☆

''یہ عرفان دوکان کیوں نہیں جا رہے۔'' آج جب نفیس احمد نے دوپہر بارہ بجے عرفان کو چائے پیتا دیکھا تو مومنہ سے پوچھا۔

''پتا نہیں ابا! بھائی تو کئی دنوں سے ہی دوکان پر نہیں جا رہے۔'' مومنہ نے اُن کے کمرے کی ڈسٹنگ کرتے ہوئے سادگی سے کہا۔

''ہاں یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔ میں سوچ رہا تھا شاید طبیعت خراب ہے، لیکن ایک دن، دو دن کتنے دن طبیعت خراب رہے گی۔ وہاں کون ہے؟ دوکان کھل بھی رہی ہے یا نہیں۔'' رفیق احمد کے منہ سے نکلا۔

''کیا بات ہے عرفان! دوکان پر کون بیٹھا ہے۔'' مومنہ کے صفائی کرنے کے بعد کمرے سے جاتے ہی انہوں نے عرفان کو بلایا اور پھر ذرا فکرمند سے لہجے میں پوچھا۔

''بس ایسے ہی ابا میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' عرفان نے جیسے اُن کو ٹالا۔

''طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو ڈاکٹر کو دکھاؤ، آج سے پہلے تو تم کبھی اس طرح گھر پر نہیں بیٹھے۔ میرے خیال سے پورا ہفتہ ہو گیا تم کام پر نہیں گئے ہو۔'' رفیق احمد کا لہجہ باز پُرس کرتا ہوا تھا۔

''ہاں لیکن دوکان کھل رہی ہے۔ افتخار (سیلز مین) کھول رہا ہے۔'' عرفان کی آواز پست تھی۔

''کیا مطلب تم نے چابیاں سیلز مین کو دے رکھی ہیں تم ہوش میں تو ہو۔ تم جوئیلری کی دوکان کی بات کر رہے ہو جہاں سے آدمی اگر ایک پڑیا بھی جیب میں رکھ کر لے جائے تو لاکھوں کی ہوتی ہے۔ یہ پرچون کی دکان نہیں ہے جہاں نمک اور چینی کی بوریاں رکھی ہوتی ہیں۔ یہ جوئیلری کی دکان ہے۔ جہاں سونا چاندی اور ہیرے موتی رکھے ہوتے ہیں۔ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو مجھے بتاتے، میں چلا جاتا۔ میں بیمار ضرور ہوا ہوں مرا نہیں ہوں۔ نہ ہی پورا اندھا ہوا ہوں۔ بہر حال مجھے نظر آتا ہے۔'' رفیق احمد کا لہجہ غیر اختیاری طور پر تیز ہوا۔

''ابا آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ دو منٹ میں آپ نے میرے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ آپ تو ایسی باتیں کر رہے ہیں جیسے میں بالکل نکما اور ہڈ حرام ہوں اور میں نے کچھ کیا ہی نہیں۔'' عرفان نے برا مانتے ہوئے کہا۔

''بھائی آہستہ آواز میں بات کریں۔ آپ بھول رہے ہیں شاید کہ آپ ابا سے بات کر رہے ہیں، زرقون جو بالکل خاموش کمرے میں ایک طرف بیٹھی تھی عرفان کو تیز آواز میں بولتے دیکھ کر رسان سے کہا۔

''تم تو چپ ہی رہو۔ ابا کی چمچی، میں جانتا ہوں یہ ساری آگ تم نے ہی لگائی ہے۔''

''میں نے لگائی ہے؟ میں نے کیا کیا ہے بھائی؟'' زرقون حیران ہوئی۔

''تم ہی سارا وقت ابا کے کان میرے اور میری بیوی بچوں کے خلاف بھرتی ہو......اور......''

''خاموش رہو عرفان...... یہ تم کیا اول فول بک رہے ہو۔ نہ تو ہماری ایسی تربیت ہے اور نہ ہی تمہاری بہن اِس طرح کی حرکتیں کرتی ہے۔ تم تو پاگل ہو چکے ہو۔'' اِس سے پہلے کہ عرفان مزید کچھ بولتا نفیس احمد نے تیز

آواز میں اُس کو جھڑکا۔ اور زری...... زری کو ایسا لگا جیسے سارے رابطے، سارے رشتے سب خلوص اور محبتیں۔ اندھیرے کنویں میں جا گری ہوں۔ وہ چپ چاپ ساکت بیٹھی اُس بھائی کو دیکھتی رہی جو سردیوں میں اُس کے لیے چھلے ہوئے چلغوزے لاتا تھا تاکہ کوئی چھلکا اتارتے وقت اُس کی بہن کے نازک ہاتھوں میں نہ چبھ جائے۔ آج اُس نے کیسا تیر چبھویا تھا کہ جلن دل سے نکل کر آنکھوں میں ہونے لگی تھی۔

''خیر ابا آپ کی تسلی کے لیے بتا دیتا ہوں کہ میں نے سونا ایک ایکسپورٹر کے ذریعے باہر بھیجا ہے۔ اُس کو آنے میں دیر ہوگئی ہے۔ اِس لیے کام نہیں ہے تو میں دوکان پر نہیں جا رہا۔'' عرفان نے نہ جانے کیوں آنکھیں چرائیں۔

''کیا مطلب؟ کس کو دے دیا؟ کتنا دے دیا؟ اور مجھ سے پوچھے بغیر کیسے دے دیا۔'' رفیق احمد نے عرفان پر سوالوں کی جیسے بوچھاڑ کردی۔

''ابا میں اِسی لیے آپ کو نہیں بتا رہا تھا؟ آپ اتنا پریشان ہوگئے؟ آپ فکر مت کریں۔ ڈاکٹر تابندہ بہت شریف اور سلجھی ہوئی خاتون ہیں اس سے پہلے بھی وہ کئی دفعہ میرا مال لے کر جا چکی ہیں اور ہمیشہ ایک مناسب منافع کے ساتھ واپس آتی رہی ہیں۔ اِس دفعہ نا جانے کیوں بہت دیر ہوگئی۔ میں خود پریشان ہوں۔'' عرفان نے کمزور، پریشان، ہراساں باپ کو تسلی دینے کی کوشش کی۔ لیکن ہر کوشش کامیاب نہ ہوتی۔ وہ سمجھ رہا تھا۔''

''عرفان تم نے مجھ سے پوچھا کیوں نہیں؟'' رفیق احمد گرجے۔

''زندگی میں رِسک تو لینا پڑتا ہے۔'' ثمینہ کی آواز عرفان کے کانوں میں گونجی۔

''بس ابا زندگی میں رسک تو لینا ہی پڑتا ہے نا۔'' ایک ہپناٹائز سی کیفیت میں عرفان کے منہ سے نکلا۔

رفیق احمد نے گردن موڑ کر خاموش بیٹھی زرقون کی طرف دیکھا۔ پھر اپنی پریشانی کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتے، کمزور دلائل دیتے عرفان کو دیکھا۔ اُن کو ایسا لگا ایسا کچھ ہوگیا ہے جو زندگیوں میں طوفان لے آئے گا۔ جو زندگیوں کا رُخ بدل دے گا۔

کچھ ایسا ضرر ہوا ہے جس کو وہ بیان کرنے کے باوجود بیان نہیں کر سکتے۔ کچھ ایسی انہونی ہوئی ہے۔ جو نہیں ہونی چاہیے تھی۔

''جاؤ زرقون میری بچی میرے لیے ٹھنڈا پانی لاؤ۔'' رفیق احمد نے ڈوبتے اعصاب کو بحال کرنے کے لیے زرقون سے کہا۔

''دیکھو میاں مجھے نہیں پتا وہ ڈاکٹر تابندہ کون ہے لیکن ہاں میں اتنا ضرور سمجھ چکا ہوں کہ تم زندگی کی سب سے بھیانک غلطی کر چکے ہو۔ خیر اللہ بہتر کرے، وہ جو کوئی بھی خاتون ہیں اللہ اُن کو نیکی دے اور وہ واپس آ جائیں لیکن میری زندگی کا تجربہ یہ کہتا ہے کہ اب وہ کبھی نہیں آئیں گی۔'' رفیق احمد نے شیشے کا گلاس پانی پی کر خاموش کھڑی زرقون کو تھمایا اور افسردگی سے تکیے سے ٹیک لگالی۔ صحن میں کھلنے والی کھڑکی سے سورج کی کرنیں کمرے میں روشنی پھیلانے کے باوجود ایک عجیب سی تاریکی کا احساس دلا رہی تھیں۔ ایک ایسی تاریکی جو نظر نہیں آتی لیکن ہوتی ہے۔ جس کے اندھیرے میں ہر چیز چھپ جاتی ہے۔

''ابا! آپ اِس قدر پریشان نہ ہوں۔ وہ بازار کے اور لوگوں کا مال بھی لے کر گئی ہیں۔ میرا مال پہلے تو کم لے کر گئی تھیں۔ لیکن پھر ایک ہندو دکاندار نے اُن کو بہت بڑا آرڈر دیا۔ تو پھر میں نے اُن کو باقی مال بھیجا۔ انشاء اللہ وہ بتا رہی تھیں پرافٹ دوسو فیصد سے زیادہ ہوگا، میرا دوسو تولہ سونا ابا انشاء اللہ چھ سو تولہ ہو کر واپس آئے گا۔''

رفیق احمد کو گھبراتا دیکھ کر عرفان نے ہر وہ بات بھی بتادی جو شاید عام حالات میں وہ کبھی نہیں بتاتا۔

''یااللہ! یہ تم نے کیا کیا؟ کون لے کر گیا تھا تمہارا سامان؟'' رفیق احمد نے پوچھا۔

''ڈاکٹر تابندہ کا کزن؟'' عرفان نے جواب دیا۔

''وہ کزن کہاں رہتا ہے؟'' رفیق احمد نے جرح کی۔

''پتا نہیں۔'' عرفان نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

''میں کپڑے بدل کر آتا ہوں تم مجھے اُن خاتون کے گھر لے کر چلو۔'' رفیق احمد گھبرا کر اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولے۔

''ابا اُن کا گھر بند ہے۔ وہ اکیلی رہتی تھیں یہاں۔'' عرفان نے تو جیسے فیصلہ کرلیا تھا کہ رفیق احمد کی جان لینے کا۔

''کیا بکواس کر رہے ہو۔ کیا کسی لاوارث عورت کو تم نے میری ساری زندگی کی جمع پونجی تھمادی۔ نالائق! تم نے کس سے مشورہ کیا تھا۔ احمق، گدھے!'' رفیق احمد کا بس نہیں چل رہا تھا کہ عرفان کو گولی ماردیں۔

''مشورہ...... آپ سے مشورہ کرتا تو یہی ہوتا جو آج ہو رہا ہے۔ میں نے اپنی بیوی سے مشورہ کیا تھا اور اُس نے سچ کہا تھا کہ اِس بات کو، اِس کام کو خاموشی سے کرنا، ورنہ تمہارے گھر والے تم کو کبھی ترقی کرتا نہیں دیکھ سکتے۔ واقعی ثمینہ نے سچ کہا تھا۔'' عرفان سوچ کی وادیوں میں ڈوبنے اور ابھرنے لگا۔

''تم یونہی چپ بیٹھے رہو۔ سارے گھر کو تم نے تباہی کے دروازے پر لا کھڑا کیا ہے۔'' رفیق احمد کی آواز میں دُکھ کی شدید لہر تھی۔ ساتھ ہی اُن کو سر میں شدید درد محسوس ہوا۔

''ابا آپ کا بلڈ پریشر شوٹ کر جائے گا۔ زری نے باپ کی بگڑتی کیفیت کو دیکھ کر گھبرا کر کہا۔

''ارے چھوڑو بیٹا! روز روز کے مرنے سے بہتر ہے آدمی ایک دفعہ ہی مر جائے۔'' اُن کے جملے نے زری کے ساتھ ساتھ عرفان کو بھی لرزا دیا۔ لاکھ وہ بیوی کا غلام سہی، لاکھ نافرمان سہی لیکن وہ اپنے باپ کو بہت چاہتا تھا یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔

''ابا اللہ کے واسطے آپ گھبرائیں نہیں میں ڈاکٹر تابندہ سے رابطہ کرتا ہوں۔'' عرفان نے باپ کو تسلی دی۔ جواب میں رفیق احمد نے ایک بے پناہ ناراض نظر عرفان کے چہرے پر ڈالی۔

''زری تم ابا کو سمجھاؤ نا۔ تمہاری تو بہت سُنتے ہیں ابا۔'' عرفان کا لہجہ ٹوٹا۔ ایک لمحے کو عرفان کو اِس طرح ٹوٹتے دیکھ کر زری کے دل کو بہت تکلیف ہوئی۔ عرفان بھائی تھا وہ بہن کے ساتھ لاکھ برا کرتا لیکن زری تو بہن تھی نا اور بہن بھی محبتوں سے گندھی۔

''خیر جو ہونا تھا ہو گیا'' رفیق احمد اپنے اوپر قابو پاتے ہوئے گویا ہوئے۔ ''لیکن یہ بتاؤ تم کام پر کیوں نہیں جارہے۔ اگر اِس طرح گھر بیٹھ جاؤ گے تو گھر کیسے چلے گا۔''

اور پھر عرفان کے منہ سے نکلنے والے الفاظ نے جیسے رفیق احمد کے پیروں تلے سے زمین کھینچ لی اور وہ یک ٹک عرفان کو دیکھتے رہ گئے۔ اُن کے سر میں درد کی شدید لہر اُٹھی اور اُن کو اپنا سانس رُکتا ہوا محسوس ہوا۔

☆......☆......☆

''یااللہ تیرا احسان۔ تُو نے مجھے ہدایت کا راستہ دکھلایا۔ میں بدنصیب ساری زندگی سکون نہ جانے کہاں کہاں ڈھونڈتا پھرا، سکون تو صرف تیرے دربار میں ہے۔ اطمینان تو صرف سجدے میں نصیب ہوتا ہے۔ بڑائی

تو تیرے آگے جھکنے میں ہے۔ میرے مالک زندگی میں کیے گئے بہت سارے احسانوں میں سے تیرا یہ ایک اور بڑا احسان مجھ گناہ گار پر ہے۔''

عشاء کی نماز کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے مرتضٰی اللہ سے سرگوشیاں کر رہا تھا۔ شیری کو زندگی سے نکال دینے کے بعد مرتضٰی جو کہیں سکون نہ پا رہا تھا۔ بے چینی، اضطراب اُس کو گھیرے رکھتے تھے۔ تو پھر ایک دوست کے کہنے پر اُس نے مسجد آنا شروع کیا۔ اُس اللہ کے گھر جو جب بھی جاؤ تو خوش آمدید کہتا ہے جو کبھی نہیں کہتا کہ اب آئے ہو؟ اِس سے پہلے کہاں تھے۔''

جو اپنے بندوں سے ماؤں سے ستر گناہ زیادہ محبت کرتا ہے۔

شروع شروع میں مرتضٰی کا مسجد میں بھی دل نہیں لگتا تھا۔ لیکن اللہ کے گھر میں ایک عجیب سی مقناطیسیت ہوتی ہے، جو غور کرو۔ تو پاؤں جکڑ جاتے ہیں۔ اُس کی رحمتیں، اُس کی محبتیں، پیروں یں زنجیریں بن کر اٹک جاتی ہیں۔

اور یہی حال مرتضٰی کا ہوا۔ وہ آہستہ آہستہ اللہ کی محبت میں ڈوب رہا تھا۔ جب اُس کا دل چاہتا اللہ اُس سے بات کرے تو وہ قرآن پڑھتا۔ اور جب اُس کا دل چاہتا وہ اللہ سے باتیں کرے تو وہ نماز پڑھتا۔ شکوے، شکایتیں، ناراضگیاں، تلخیاں، غصہ، بے یقینی اُس کے مزاج سے نکلتے جا رہے تھے۔ مسجد میں ہی اُس کی ملاقات ڈاکٹر احمد منیب سے ہوئی۔ اور پھر وہ گھنٹوں خاموش...... دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا اُن کے درس سُنتا۔ اُن کی باتیں سمجھتا۔

ڈاکٹر احمد منیب کے پاس بہت سے لوگ آتے تھے، وہ مولوی نہیں تھے۔ وہ ایک عام انسان تھے۔ ایسے انسان جن کی صحبت میں سکون ملتا، اطمینان ملتا۔ مرتضٰی ہر جمعہ کی شب عشاء کے بعد مسجد کے اُس حصے میں جا بیٹھتا جہاں ڈاکٹر صاحب لوگوں سے باتیں کیا کرتے۔ اُن کے مسئلے سنتے۔ وہ خاموش بیٹھا سنتا رہتا۔ اُس کو اُن کے پاس سکون ملتا، اُن کے پاس گزرے ہوئے وقت میں وہ اپنے ڈپریشن سے باہر نکل جاتا۔ بعض اوقات اُن کے پاس خاموش بیٹھے اُن کو سنتے سنتے اُس کا دل چاہتا وہ رونے لگے۔ دل کا ہر زخم اُن کو دکھا دے۔ وہ سارے دکھ اُن کو دکھائے جو ناسور بنتے جا رہے ہیں۔

دکھ، احساس شرمندگی، بے چینی، بے بسی، شرمندگی، ندامت...... ہر چیز، ہر بات، ہر دکھ اُن سے کہہ دے لیکن وہ خاموش رہتا، ڈاکٹر احمد منیب اُس کے اندر تک جھانک لیتے۔ وہ اُس کی آنکھوں کو پڑھ لیتے۔ اور پھر خوبصورت کتابوں کا تحفہ اُس کو دے دیتے۔ آہستہ آہستہ کتابیں اُس کی دوست بنتی جا رہی تھیں۔ دینی کتابیں، اخلاقی کتابیں، اُس نے قرآن پڑھ رکھا تھا۔ لیکن اب وہ قرآن کا ترجمہ پڑھ رہا تھا۔ وہ قرآن کو سمجھ رہا تھا۔ اور قرآن اُس کو بتا رہا تھا اُس نے جو زندگی گزاری وہ فضول تھی۔ وہ رائیگاں گئی۔ وہ زندگی رائیگاں جانے پر دکھی تھا۔

وہ آدمی تھا اُس کو وقت نے احساس دلایا، اُس کو انسان بننا تھا اور ڈاکٹر منیب انسان بننے میں اُس کی مدد کر رہے تھے۔

اُن کے پاس اُس کے ہر سوال کا جواب تھا۔ وہ ابہام دور کرنا جانتے تھے۔ وہ دین کو سمجھنا چاہ رہا تھا۔ وہ مذہب اسلام کی نرمی کو محسوس کر رہا تھا۔

''اسلام کو سمجھ کر سیکھیں۔ اگر دین اسلام کو سمجھیں گے تو آپ کو احساس ہوگا کہ اُس میں کتنی وسعت ہے۔

دین اسلام تنگ نظری اور تنگ دلی کا مذہب نہیں ہے۔ اسلام دکھاوے کا مذہب نہیں ہے۔ یہ آپ سے آپ کی زندگی سے حوالہ چاہتا ہے۔ ایک اچھا مسلمان اپنی باتوں سے نہیں اپنے کردار سے متاثر کرتا ہے۔ آپ اپنا کردار بدلیں نہ پڑھیں نفلی نمازیں، نہ رکھیں نفلی روزے...... لیکن فرض کو قرض کی طرح ادا کریں۔''

ڈاکٹر احمد منیب کا لیکچر اُس کے دل میں اُتر رہا تھا۔ وہ خاموش تھا اُس کے لب ایک دوسرے میں پیوست تھے۔ وہ بدل رہا تھا۔ یا اُس کی زندگی بدل رہی تھی۔

☆......☆......☆

''میں نے ایک لڑکی دیکھی تھی۔ بہت پیاری اور معصوم سی بہت سادہ۔ لیکن افسوس اُس کی منگنی ہوئی ہے۔'' مسز روحی جنید نے فورک میں فش کا ٹکڑا پھنساتے ہوئے پُر جوش لہجے میں جنید صاحب سے کہا۔

''کہاں دیکھ لی؟ اور دیکھ ہی لی تو اِس قدر ایکسائیٹڈ کیوں ہو رہی ہیں۔ ہم کو کون سی لڑکی کی تلاش ہے۔'' جنید نے پانی پی کر کرسٹل کا صاف شفاف گلاس ٹیبل پر رکھتے ہوئے نیپکن سے منہ پونچھتے ہوئے کہا۔

''حد ہوگئی! میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ آپ اتنا بڑا بزنس کیسے سنبھال لیتے ہیں۔ گھر کے تو چھوٹے چھوٹے کام تک آپ بھول جاتے ہیں۔ کیا مرتضیٰ کی شادی نہیں کرنی۔'' مسز روحی جنید نے جل کر کہا۔

''کیوں؟ کیا صاحبزادے کا ایک شادی سے دل نہیں بھرا۔ یا آپ کا کوئی ارمان رہ گیا ہے۔ جو دوسری شادی کی باتیں کر رہی ہیں۔'' جنید احمد نے اطمینان سے کہا اور ٹی وی کا ریموٹ اُٹھا کر چینل سرچنگ کرنے لگے۔

''توبہ ہے! بند کریں یہ ٹی وی۔ ایک تو آپ کا بیٹا نخرے دکھا رہا ہے۔ اوپر سے اُس نے یہ باتیں سُن لیں تو پھر تو وہ کبھی بھی قابو میں نہیں آئے گا۔ وہ شبانہ تو اُس گورے کے ساتھ مزے اڑا رہی ہے۔ اور میرا بیٹا، مسجدوں میں جا بیٹھا۔ نہیں مجھے جلد از جلد کسی اچھی نیک لڑکی سے اُس کی شادی کرنی ہے۔ بس!'' روحی کا لہجہ قطعیت لیے ہوئے تھا۔

''رہنے دیجیے۔ اچھی اور نیک لڑکی! شبانہ کو بھی آپ نے یہی کہہ کر پسند کیا تھا۔'' جنید نے اُن کو جتلایا۔

''چھوڑیے اُس شبانہ چڑیل کا ذکر۔ میں آپ سے یہ کہہ رہی تھی کہ میں نے بہت اچھی لڑکی دیکھی ہے لیکن افسوس صد افسوس اُس کی منگنی ہوگئی ہے۔ لیکن خیر لڑکیوں کی تو کمی نہیں ہے۔ لیکن میری خواہش ہے کہ مجھے ویسی ہی لڑکی ملے۔'' روحی نے جذباتی انداز میں کہا۔

''اچھا تو بیگم صاحبہ کہاں آپ نے لڑکی دیکھی ہے۔'' جنید احمد اُن کی جذباتیت پر مسکراتے ہوئے پوچھ بیٹھے۔

''میری دوست ہے نا عذرا لیعقوب، جو کراچی یونیورسٹی میں پڑھاتی ہے۔ اُس کی اسٹوڈنٹ ہے۔ بہت پیاری، عذرا بہت تعریف کر رہی تھی۔ لیکن جب معلومات کیں تو منگنی شدہ نکلی۔ میں نے مرتضیٰ سے بات کی تو اُس نے تو صاف انکار کر دیا کہ وہ شادی کرنا ہی نہیں چاہتا لیکن میں اُس کی بات نہیں مانوں گی۔ زندگی اِس طرح کیسے گزرے گی۔ ابھی تو جوانی ہے لیکن زندگی میں ایک موڑ ایسا ضرور آتا ہے۔ جب رفیقہ حیات کی ضرورت ہوتی ہے۔ جوانی تو گزر ہی جاتی ہے۔ لیکن بڑھاپا ساتھی کا ساتھ مانگتا ہے۔'' روحی جنید برسوں پہلے پڑھا ایک جملہ دُہرایا تو جنید صاحب بے ساختہ ہنس کر بولے۔

''رفیقہ حیات کی ضرورت پڑتی ہے آپ صحیح فرما رہی ہیں تو آپ تو میری دوست ہیں۔ میرے لیے ایک رفیقہ حیات تو ڈھونڈ دیں کہ رفیقہ حیات کی مجھے بہت شدید ضرورت ہے۔'' جنید احمد نے بیوی کو چھیڑا۔

''چھوٹے میاں تو چھوٹے میاں بڑے میاں کے کیا کہنے۔'' روحی بے ساختہ ہنس پڑیں۔

''دیکھتی رہیے گا آپ اپنے لاڈلے کے لیے لڑکیاں لیکن پہلے مرتضٰی کو تو منا لیں۔ ہاں خیال آیا، ہمایوں کے سلسلے میں حیا کیا کہتی ہے۔'' جنید احمد کو ایک دم خیال آیا کہ ہمایوں کی والدہ کئی دفعہ حیا کو اپنی بہو بنانے کا ارادہ ظاہر کر چکی ہیں۔ اور جب سے آفتاب سے حیا کا رشتہ ختم ہوا ہے اُن کا اصرار کافی بڑھ گیا ہے۔ جنید احمد کی بھی خواہش تھی کہ اب حیا کو اپنے گھر کا ہو جانا چاہیے۔

''میں نے پوچھا تھا لیکن یہاں تو کسی کا مزاج ہی نہیں ملتا۔ بٹی صاحبہ بُرا سا منہ بنا کر بیٹھی ہیں زیادہ زور دیا تو سر درد کا بہانہ بنا کر بیٹھ گئیں، میں تو اِن دونوں کی طرف سے بہت پریشان ہوگئی ہوں۔ اللہ اِن کو عقل دے۔ اللہ اِن کی زندگیوں کے بہترین فیصلے فرما دے۔'' اور آسمانوں پر بیٹھا کاتب تقدیر ایک ماں کی دعا سُن رہا تھا۔

☆......☆......☆

''کیسی ہے؟''

''20 سے 22 سال عمر، 5 فٹ 4 انچ سے نکلتا قد، شہد میں دودھ جیسے گھلا ہوا ایسی رنگت، کمر کو چھوتے ڈارک براؤن بال، متناسب بدن، چھوٹی سی ناک میں لشکارے مارتی ہیرے کی لونگ، کانوں میں شعاعیں بکھیرتے ننھے ننھے ہیروں کے ٹاپس، گہری شرارتی مسکراتی آنکھیں۔''

فراز نے مریم کے سوال پر سر سے پیر تک اُس لڑکی کا جائزہ لیا۔ آج مریم فراز کو لے کر اپنی ایک جاننے والی کے گھر چائے پر آئی تھی۔ چند دن پہلے جب مریم زمزمہ کے ایک پارلر میں اپنے بالوں کی Glossing کروانے آئی تھی تو اُس کی وہیں کی رہائشی ایک خاتون سے بات چیت ہوگئی اور فون نمبرز کے تبادلے ہوگئے۔ اور وہ ایک اتفاقیہ ملاقات بہت جلد بہترین تعلقات میں بدل گئی تھی۔ اور آج مریم فراز کو اپنی دوست عامرہ کی بیٹی شانزہ کو دکھانے لائی تھی۔

جب مریم نے عامرہ سے ذکر کیا کہ وہ اپنے چھوٹے بھائی کے لیے لڑکی ڈھونڈ رہی ہے تو عامرہ نے بغیر کسی تکلف کے مریم سے اپنی بیٹی کے لیے کہہ دیا۔

عامرہ زمزمہ پر ایک بوتیک چلاتی تھی۔ ڈیفنس فیز V کے ہزار گز کے بنگلے میں وہ رہائش رکھتی تھی۔ مریم نے پہلے تو یہ سوچا کہ شاید عامرہ کی بیٹی معمولی صورت و شکل کی ہوگی کیونکہ عامرہ نہ صرف بہت سارا جہیز دے رہی تھی بلکہ اُس کی بیٹی برٹش پاسپورٹ بھی رکھتی تھی۔ عامرہ کو تو فراز اس قدر پسند آیا تھا کہ اُس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اپنی لاڈلی، اکلوتی اور حسین بیٹی کو ابھی ساتھ ہی کر دے۔

''اچھی ہے نا۔'' مریم نے خاموش بیٹھے فراز کے کان میں سرگوشی کی۔

کہنے کو بہت کچھ ہے
مگر کس سے کہیں ہم

فراز نے اُڑتے پرندوں پر نظر ڈالی پھر سیاہ جوڑے میں اُداس بیٹھی زرتون کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

بہتر ہی ہے، خاموش رہیں

اور کہیں ہم ......

زرقون نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

دل کرتا ہے دنیا کی ہر ایک رسم مٹا دیں

دیوار جو ہم دونوں میں ہے آج گرا دیں

فراز کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

کیوں دل میں تڑپتے رہیں

لوگوں کو بتا دیں

زرقون نے ایک گہری نظر فراز کی طرف دیکھتے ہوئے عجیب بے اعتباری سے کہا۔

ہاں! ہم کو محبت ہے

''محبت'' فراز کا لہجہ حتمی تھا۔ زرقون مسکرائی۔

دل میں یہی بات اب اِدھر بھی ہے

اور اُدھر بھی

زرقون نے نظم مکمل کی۔

آج زرقون کی برتھ ڈے تھی اور حسبِ معمول فراز اُن کے گھر آیا ہوا تھا۔ فراز، اُس سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن زری، اِس ایک بات پر بضد تھی کہ فراز اِس رشتے کو حتمی شکل دے دے کیونکہ اُمید اور نا اُمیدی کے درمیان کھڑی زرقون اب تھک گئی تھی۔

''زری تم جانتی ہو کہ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔'' فراز نے اُس کو یقین دلانا چاہا۔

''ہاں، آپ یہی کہتے ہیں، لیکن محبت دلیل مانگتی ہے۔ محبت عمل مانگتی ہے۔ محبت اختیار مانگتی ہے۔ آپ کیا کر رہے ہیں۔ آپ کچھ نہیں کر رہے۔ خالی محبتوں کے دعوؤں کا میں کیا کروں۔ میں تو آپ سے کچھ بھی نہیں مانگ رہی بلکہ ساری عمر کے لیے آپ سے صرف ایک وعدہ چاہتی ہوں کہ آپ میرے علاوہ کسی سے شادی نہیں کیجیے گا۔ میں آپ کے ساتھ اُس جگہ کسی لڑکی کو کھڑا نہیں دیکھ سکتی جہاں کھڑے ہو کر بچپن سے میں نے خواب بُنے ہیں۔ میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں۔ یہ بات میں ثابت کر سکتی ہوں۔ میں لڑکی ہوں۔ میری ماں بھی نہیں ہے۔ میرے ابا بیمار رہتے ہیں، میرا بھائی میرا نہیں رہا۔ اُس کے باوجود میں ساری عمر آپ کا اِس گھر کی دہلیز پر انتظار کر سکتی ہوں اور کروں گی۔

میں آخری سانسوں تک آپ سے محبت کروں گی۔ لیکن محبت کبھی یکطرفہ نہیں ہوتی۔ مجھے آپ کا ساتھ چاہیے۔ میں آپ کی محبت میں پامال ہونا چاہتی ہوں۔'' زرقون نے اُداس اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں فراز سے کہا۔

''میں جانتی ہوں۔ میں سُن رہی ہوں مریم آپا اور تائی اماں آج کل آپ کے لیے لڑکیاں دیکھ رہی ہیں۔ آپ لاکھ مجھ سے چھپائیں۔ میں سب جانتی ہوں۔ بلکہ اِس بات کا مجھے بہت دکھ ہے کہ میرے اور آپ کے درمیان ایک ایسا وقت بھی آ گیا کہ آپ مجھ سے باتیں چھپانے لگے ہیں اور جب ایک دوسرے کے درمیان دیوار کھڑی ہونی شروع ہوتی ہے تو رازداری اُس دیوار کی پہلی اینٹ ہوتی ہے۔'' زرقون نے خاموش بیٹھے فراز

کو دیکھ کر اپنی بات جاری رکھی۔
''لیکن میں آپ سے کہتی ہوں کہ میں آپ کا انتظار کروں گی اور اُس وقت تک آپ سے محبت کرتی رہوں گی جب تک آپ مجھ سے محبت کرتے رہیں گے۔'' زرقون نے توجہ سے سنتے ،فراز کو دیکھ کر کہا۔
''پتا نہیں تقدیروں میں کیا لکھا ہوتا ہے۔ ساری زندگی ہم کس کے پیچھے بھاگتے ہیں اور آخر میں پتا چلتا ہے وہ سب تو ایک سراب تھا۔ زری مجھ سے محبت کرتی ہے میں بھی اُس کو چاہتا ہوں لیکن بہت سوچنے کے بعد یہ بات سمجھ میں آئی کہ محبت اور شادی دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ میں زری سے محبت کرتا ہوں لیکن شاید شادی نہیں کر سکتا لیکن ہاں چاہے میں شادی کر لوں یا سات سمندروں کی تہوں میں جا چھپوں میں محبت زری ہی سے کرتا رہوں گا۔
فراز نے حسین وجمیل، شوخ و شریر سی شانزے کو دیکھتے ہوئے زرقون کی یادوں اور اپنی سوچوں کے درمیان ڈوبتے اُبھرتے ہوئے جیسے اپنے آپ سے کہا۔ اور زری...... زری تو مجھ سے بہت محبت کرتی ہے۔ میں اُس کو کسی کے ساتھ برداشت نہیں کر سکتا، ویسے بھی اُس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ساری زندگی اُس دہلیز پر بیٹھ کر میرا انتظار کرے گی۔ وہ ہمیشہ میری رہے گی۔ میں ہمیشہ اُس سے ملتا رہوں گا۔ ہمیشہ اُس سے محبت کروں گا۔ زری محبت کے قابل ہے۔ لیکن شادی......
''میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے۔ فراز اور تم نہ جانے کیا سوچ جا رہے ہو۔ بتاؤ نا کیسی ہے؟'' مریم کو بہت جلدی تھی۔ وہ جلد از جلد زرقون نام کا کانٹا فراز اور اپنی زندگی سے نکال دینا چاہتی تھی۔
فراز نے ایک نظر دور دور تک پھیلے لان کو دیکھا۔ پورچ میں کھڑی چار گاڑیوں کے درمیان V-8 کو دیکھا اور پھر منہ بنا بنا کر چائے پیتی شانزے کو اور پھر اُس کے منہ سے نکلا۔

☆......☆......☆

لکھے تھے برف پر اُس نے سبھی وعدے وفاؤں کے
تو اُس آغاز کا سوچو کیا انجام ہونا تھا

''یا اللہ یہ میں کیا سُن رہی ہوں۔ زری یہ کوئی مذاق تو نہیں ہے۔'' نرگس نے گھبرا کر خاموش بیٹھی زری سے پوچھا۔
زری نے ایک نظر نرگس کی طرف دیکھا اور خاموش رہی۔
''میں ابھی ابھی بازار سے آئی تو امی نے کہا کہ تمہارا فون آیا تھا۔ یقین کرو زری میں دوڑی چلی آئی ہوں۔ گھر میں گھستے ہی موی نے جو خبر بلکہ منحوس ترین خبر مجھے سنائی ہے کیا وہ درست ہے۔ زری یا پھر اِس موی بدتمیز کا کوئی بے ہودہ مذاق ہے۔'' نرگس خود ہی سوال کر رہی تھی اور خود ہی جواب دے رہی تھی۔
''تم میری بات کا جواب کیوں نہیں دے رہیں زری۔ مجھے ہول آ رہے ہیں پلیز کچھ تو بولو۔'' نرگس کو زرقون کی خاموشی ہراساں کر رہی تھی۔ وہ صرف یہ چاہتی تھی کہ زرقون ہنس دے اور کہہ دے یہ سب مذاق تھا لیکن...... زری بولی تو،

کہانی درد کی میں زندگی سے کیا کہتا
یہ درد اُس نے دیا ہے اُسی سے کیا کہتا
مرے عزیز ہی مجھ کو سمجھ نہ پائے کبھی

''کچھ نہیں، لیکن یہ لفظ اُس کے اندر جیسے گردش کرنے لگے۔ وہ خاموش ہی رہی۔ بعض اوقات ہمارے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں ہوتا۔ جینے کے لیے جواز نہیں ہوتا۔ مرنے کا سوال نہیں ہوتا۔ یہی حال زرقون کا تھا۔

''تم کو معلوم ہے نرگس صبر اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ اللہ قرآن میں فرماتا ہے کہ جب ہمارے پیارے مرجاتے ہیں تو وہی ہے جو ہم کو صبر دیتا ہے ورنہ ہمارے کلیجے ہی پھٹ جائیں۔ نرگس کوئی سوال نہیں کرو۔

''تمہارے کسی سوال کا میرے پاس جواب نہیں ہے۔ میں تو خود اپنے آپ سے سوال کرتے کرتے تھک گئی ہوں۔ کوئی جواب ہی نہیں مل رہا۔ آج سمجھ میں آیا کہ یہ کہنا کتنا آسان ہوتا ہے کہ بھئی تقدیر میں ہی یہ لکھا تھا لیکن جب خود پر بیتی ہے تو سوچتے ہیں تقدیر میں یہ سب کیوں لکھا تھا۔ اپنے آپ کو سمجھانا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ یہ بات آج سمجھ میں آئی۔''

''بعض دُکھ ایسے ہوتے ہیں نرگس کے اُن کو چھپاؤ تو دل پر چھالے پڑ جاتے ہیں اور دکھاؤ تو زمانہ پتھر مارتا ہے۔ میرا دکھ میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ لگ رہا ہے عمر رائیگاں گئی۔ ایک ایک خواب، مٹی میں مل گیا۔ لیکن میں اپنا درد کس سے کہوں! اُس باپ سے جو مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔ جو مجھ کو اپنا گوہر نایاب کہتا ہے۔ کیا اُس باپ کو دُکھی کردوں۔ یا اُس بھائی سے کہوں جس کو اِس گھر کی، اِس گھر میں رہنے والوں کی رائی برابر بھی پروا نہیں ہے۔ جو اگر دشمنوں کے ساتھ مل کر ہنسا نہیں تو ہماری تذلیل کرنے سے اُن کو روکتا بھی نہیں ہے۔

میں کس سے کہوں نرگس، اُس ماں سے جو مجھے چھوڑ کر منوں مٹی تلے جا سوئی۔ ہاں ایک ہستی ہے جس سے کچھ پوشیدہ نہیں۔ جو سب کی سُنتا ہے۔ اور ہر کسی کے لیے وہ ہمدرد ہے۔ ''میرا اللہ۔''

میں نے اپنے اللہ سے کہہ دیا ہے۔ میرے لیے میرا اللہ کافی ہے۔ دماغ سے ہر چیز کو نکال دینا۔ اِس قدر آسان نہیں ہے۔ لیکن مجھے اپنے اللہ سے اُمید ہے کہ وہ عزت اور بھرم کے ساتھ میرے لیے کافی ہے۔ میں صبر کرنا جانتی ہوں۔ میں جانتی ہوں دشمن آنکھیں کھولے میری طرف دیکھ رہے ہیں۔ میں عزت سے رہنا چاہتی ہوں۔ میری مٹھی میں عزت کے علاوہ کچھ نہیں بچا۔

میرے لیے یقین کرنا بہت مشکل ہے کہ جو شخص محبت کے بڑے بڑے دعوے کرتا تھا۔ جس کی محبت میں میں نے اپنی شناخت کھودی بلکہ وہ بن گئی جو وہ چاہتا تھا۔ وہ شخص ایک گرم ہوا کا تھپیڑا برداشت نہیں کرسکتا۔

وہ جو کہتا تھا کہ میں سنتا ہوں تو تمہارے کانوں سے۔ میں دیکھتا ہوں تو تمہاری آنکھوں سے۔ میں سانس لیتا ہوں تو تمہارے دل سے۔ آج ...... آہ ...... آج وہ شخص ...... نہیں میں اُس کے لیے اپنے شریف باپ کے سفید بالوں میں کالک نہیں ملوں گی۔ اُس باپ کے جس نے کبھی بال نہیں رنگے۔ وہ باپ جس نے ہماری ذمہ داریوں کو اِس طرح اٹھایا کہ اپنی زندگی جینا بھول گیا۔ جو کبھی سمندر کے کنارے جا کر نہیں بیٹھا۔ وہ باپ جو ہمارے لیے جوانی میں بوڑھا ہوگیا۔ میں انسان ہی تو ہوں، مجھے رونا آرہا ہے، میں بہت روئی ہوں شاید میں بہت روؤں گی۔ محبتوں کا ماتم منانا آسان نہیں ہوتا۔ محبتوں کا لاشا اٹھانا اور پھر بے کفن رات کی تاریکیوں میں دبا دینا بہت دل گردے کا کام ہے۔ لیکن نرگس انشاء اللہ تعالیٰ اپنے اللہ کی مدد سے میں یہ بھی کرگزروں گی ...... لیکن تم جانتی ہو۔ میرا تو کوئی مطالبہ ہی نہیں تھا۔ میں تو یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ فراز ......''

زرقون جو بہت تحمل سے، بہت اطمینان کے ساتھ خشک آنکھوں اور ستے ہوئے چہرے کے ساتھ خاموش،

غمزدہ بیٹھی نرگس کو اپنے دل کا حال سنا رہی تھی۔ برداشت کا دامن چھوڑ بیٹھی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''تو کیا......'' ریفریجریٹر پر رکھے مٹھائی کے ڈبے نے نرگس کا جملہ پورا نہیں ہونے دیا۔ وہ چاہنے کے باوجود نہیں پوچھ سکی۔

''ہاں......نرگس باجی فراز بھائی کی بات پکی ہوگئی ہے۔ اگلے ہفتے اُن کی شادی ہے۔ ڈیٹ بھی فکس ہوگئی ہے۔'' مومی نے ایسے نظریں جھکا کر بتایا کہ روتی ہوئی زرقون کا دل کانپ گیا۔ اُس نے آگے بڑھ کر مومی کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ مومی اُس کی بانہوں میں اُس کے سینے کی گرمی کو محسوس کر کے زاروقطار رونے لگی۔

''نہیں مومی مت رو۔ اللہ کے ہر کام میں حکمت ہوتی ہے۔ ہمیں نہیں پتا اللہ کو کیا منظور ہے لیکن اِس بات پر یقین رکھو۔ اللہ کو جو بھی منظور ہوگا، وہ ہمارے حق میں بہتر ہوگا۔ اللہ کسی کو دے کر آزماتا ہے اور کسی سے لے کر آزماتا ہے۔'' نرگس نے روتی ہوئی مومی اور آنسو پونچھتی زری کو ٹوٹے ہوئے لہجے میں تسلی دی۔

''تم نے فراز بھائی سے بات کی۔'' نرگس نے زری سے سوال کیا۔ وہ خاموش رہی۔

''کیا بات کریں اُن سے نرگس باجی، وہی باتیں، وہی کمزور دلائل۔'' مومی کا لہجہ تیز ہوا۔

''مثلاً کیا؟'' نرگس نے پوچھا۔

''میں زری سے بہت محبت کرتا ہوں بلکہ محبت ہی زری سے کرتا ہوں لیکن مومی میں کیا کروں میں مجبور تھا۔ مریم آپا کا گھر داؤ پر لگا ہوا تھا۔ وقار بھائی کی بہن کے انکار سے میں خوش ہوگیا تھا۔ لیکن پھر وقار بھائی نے ایک شرط رکھ دی کیونکہ وہ مریم آپا اور عرفان کے سابقہ رشتے کی وجہ سے مریم آپا پر شک کرتے ہیں تو انہوں نے کہا کہ اگر فراز کی شادی زرقون سے ہوئی تو مریم آپا کا اِس گھر سے رابطہ پھر سے جڑ جائے گا۔ اور وہ یہ برداشت نہیں کر سکتے۔ مریم آپا بہت پریشان تھیں۔''

''تم پلیز زری سے کہو مجھ سے بات کرے۔'' فراز گڑگڑایا۔

''اگر وہ آپ سے بات بھی کرنا چاہیں گی تو میں انہیں منع کردوں گی۔ وہ اتنی کمزور نہیں ہیں جتنے کمزور آپ ہیں۔ انہوں نے آپ سے کب کہا تھا کہ آپ اُن سے شادی کریں۔ انہوں نے کہا تھا کہ آپ شادی نہ کریں۔ اور نہ ہی وہ شادی کریں گی۔ اگر بڑے راضی ہوگئے تو ٹھیک...... ورنہ دونوں اپنے اپنے گھروں میں ایک دوسرے کے لیے جیئں گے۔ لیکن معاف کیجیے گا فراز بھائی۔ آخر آپ بھائی تو مریم آپا کے ہی ہیں خودغرض، خود پسند۔ آپ کو زری آپا اچھی لگتی تھیں۔ اس میں بھی کوئی کمال نہیں کہ وہ تو ہیں ہی اچھی۔ لیکن آپ نے کبھی اُن سے محبت نہیں کی۔ محبت کرنے والے اتنے بزدل اور کمزور نہیں ہوتے۔ آپ شانزے کی دولت، خوبصورتی پر مرمٹے ہیں۔ ہم سے سچ نہ بولیں تو کم از کم اپنے آپ سے تو سچ بولیں۔ اللہ آپ جیسا شخص زری باجی کے لیے کیسے چن سکتا تھا۔'' مومی نے زندگی میں پہلی بار کسی سے اِس طرح بات کی۔

''خدا کی قسم مومی میں زری سے محبت کرتا ہوں۔ میں زری کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں بہت مجبور ہوں۔ میری ماں اور بہن......'' کہتے کہتے فراز کا لہجہ رُندھ گیا۔

''ٹھیک کیا تم نے مومی۔'' نرگس نے مومی کی ساری بات سُن کر کہا۔ ''ذرا میری ملاقات ہو تو......''

''نہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ میں نے اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کردیا ہے اور جب اللہ کی عدالت میں کیس چلا گیا تو پھر سب کو اُس کے فیصلے کا انتظار کرنا چاہیے۔'' زرقون نے پُراعتماد اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں غصے سے بل

کھاتی نرگس اور مومنہ کو ٹوکا۔

''عصر کا وقت ہورہا ہے۔ میں نماز پڑھنے جارہی ہوں۔ میرے خیال سے تم لوگوں کو بھی نماز پڑھنی چاہیے۔'' زری کا لہجہ پُرسکون تھا۔ واقعی خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ جن کو اللہ صبر کی توفیق دیتا ہے۔ جو اللہ کی آزمائش کو خندہ دلی سے برداشت کرتے ہیں اور ایسے ہی لوگوں کے لیے اللہ کے گھر میں انعام ہوتا ہے۔

یہ وہی لوگ ہوتے ہیں جن کے دلوں پر اللہ اپنی رحمت سے سکون خاص اُتارتا ہے۔

''یا اللہ تُو نے فراز بھائی کو دودھ سے مکھی کی طرح میری بہن جیسی دوست کی زندگی سے نکالا ہے۔ اب میں منتظر ہوں اُس انعام کا جو تو اُس کو اپنے او پر یقین، صبر اور برداشت کے صلے میں عطا کرے گا۔'' نرگس نے جائے نماز پر نیت باندھے کھڑی زری کو دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں اللہ سے بات کی۔

☆......☆......☆

''ارے اماں! بہت مزہ آرہا ہے۔ اللہ کی قسم سینے میں ٹھنڈک پڑ گئی ہے۔ بڈھے کی تو داڑھی چند دنوں میں ہی سفید ہوگئی۔ بڑا اِتراتا تھا اپنی بیٹی پر، اپنے خاندان پر۔ ایسی بے عزتی کی ہے اُس کی، اُس کے بھائی کے گھر والوں نے کہ دل خوش ہوگیا۔'' ثمینہ نے خوشی سے بے حال لہجے میں ماں کو بتایا۔

''مجھے تو یقین تھا کہ میرا کاٹا تو پانی نہیں مانگتا، یہ لوگ...... ارے اِن لوگوں سے تو میں ایک ایک بدلہ لے کر رہوں گی۔ فہمیدہ کے مرنے سے میرے کلیجے کی آگ کافی ٹھنڈی ہوئی تھی۔ لیکن جب سے رفیق احمد نے مجھے گھر آنے سے منع کیا اور پھر پہلے ماں میرے مقابلے پر پھر بیٹی میری بیٹی کے مقابلے پر...... نہیں اب میں برداشت نہیں کرسکتی تھی۔ میں نے برداشت کیا بھی نہیں......''

''پتا ہے اماں فراز کی منگنی ہوگئی ہے۔ بہت مالدار لڑکی ہے۔'' ثمینہ نے ماں کی بات بیچ میں کاٹتے ہوئے جلدی سے بتایا۔

''اچھا واقعی......'' رقیہ بیگم حیران ہوئیں۔

''اور کیا اماں آج مٹھائی آئی ہے۔ اِن کے تایا ہی دے کر گئے تھے۔ بہت چپ چپ ہیں میرے سسر......'' ثمینہ نے ماں کی معلومات میں اضافہ کیا۔

''اور وہ تیری نند! وہ گوہرِ نایاب، وہ ماں کی لاڈلی، وہ کیا کررہی ہے۔'' رقیہ بیگم کو مزید مرچ مسالے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

''پتا نہیں اماں کس مٹی کی بنی ہوئی ہے۔ میں تو سمجھی تھی بہت روئے پیٹے گی، واویلا مچائے گی۔ اپنی تایا زاد بہن مریم کی طرح اسپتال کے بستر پر جا پڑے گی۔ لیکن وہ تو اِس طرح گھر میں پھر رہی ہے۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہو۔ ہمیشہ کی طرح اپنے تایا کو دروازے تک چھوڑنے گئی بلکہ وہ اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر آبدیدہ ہوگئے۔ لیکن یہ معمول کی طرح اُن سے باتیں کرتی رہی۔ ظاہر ہے دل تو بہت دکھا ہوگا لیکن بہت گھنی ہے۔ ظاہر بالکل نہیں کرتی۔ مجھے تو اِس سے بہت ہی نفرت ہے دل چاہتا ہے اِس کی چوٹی پکڑ کر اِس کا سر زمین پر رگڑ دوں۔ اِس کو ذلیل کروں؟ اِس بدنصیب، کمبخت کے منہ پر طمانچے ماروں لیکن اماں یہ تو ہر جگہ مجھے ہرا دیتی ہے۔'' ثمینہ نے ناگن کی طرح بل کھاتے ہوئے ماں کے آگے دل کھولا۔

''اری تُو تو لگتا ہے میری بیٹی ہی نہیں ہے۔ ارے وقت کا انتظار کیا کر۔ جو چاہتی ہے وہ سب کچھ ہوگا۔ ذرا

ٹھہر تو سہی...... ہتھیلی پر سرسوں تھوڑا ہی جماتے ہیں۔ احمق کہیں کی۔'' رقیہ بیگم نے ثمینہ کو اُس کی جلد بازی پر ڈانٹا۔

''دیکھو بھئی اماں! تم مجھے احمق مت کہا کرو۔ سارے خاندان کو میں نے چھٹی کا دودھ یاد دلا دیا ہے اور تم مجھے احمق کہتی رہتی ہو۔'' رقیہ بیگم کے ریمارکس پر ثمینہ جل ہی تو گئی۔

''اچھا چھوڑ یہ بتا عبداللہ کی طبیعت کیسی ہے۔''

''ٹھیک ہے اماں بس کمزور بہت ہوتا جا رہا ہے۔ اب ایک بڑے ڈاکٹر سے ٹائم لیا ہے، وہاں لے کر جاؤں گی لیکن تمہارے کنگلے داماد کے پاس پیسے ہی نہیں ہیں۔ میں نے تو صاف کہہ دیا اپنی اماں کی قبر کھود کر لاؤ لیکن میرے بچے کے لیے تو لے کر آؤ۔ شام کو لے کر جاؤں گی۔'' ''اچھا اِس وقت عرفان کہاں ہیں۔'' بعض اوقات بیٹی کی لمبی زبان رقیہ بیگم جیسی بدزبان عورت کو بھی کوفت میں مبتلا کر دیتی تھی۔

''کہاں ہیں؟ اپنے ابا کے پاس بیٹھے ہیں۔ پتا نہیں دونوں باپ بیٹے کن اُلجھنوں میں گھرے ہیں۔'' ثمینہ کا انداز لاپروا تھا۔

''ارے بیوقوف سُن گُن رکھا کر، دھیان رکھا کر کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ باپ بیٹے سے وہ کام کروا لے جو فہمیدہ نہ کروا سکی۔ رفیق احمد بہت سمجھدار اور ہوشیار آدمی ہے، تُو نہیں جانتی اُن کو۔'' رقیہ بیگم کے لہجے میں کچھ ایسا ضرور تھا کہ ثمینہ چپ سی ہوگئی۔

☆......☆......☆

''ابا میں بہت پریشان ہوں۔ عبداللہ کی طبیعت ٹھیک ہونے پر نہیں آ رہی۔ ڈاکٹر تابندہ سے بات ہوگئی ہے۔ وہ کہہ رہی ہیں امریکہ میں اُن کے ساتھ کوئی مسئلہ ہو گیا ہے۔ میں پاکستان میں اُن کے پارٹنر کے گھر گیا تھا۔ انہی نے بات کروائی ورنہ میرا تو وہ فون ہی نہیں اٹھا رہی تھیں۔ خیر...... Back To The Point ڈاکٹر تابندہ کہہ رہی ہیں کہ امریکہ میں اُن کے ساتھ کوئی مسئلہ ہو گیا ہے۔ اُن کو تھوڑا ٹائم لگے گا۔ جب میں نے اُن سے اپنے سامان کے بارے میں کہا، تو کہنے لگیں جب وہ پاکستان آئیں گی تو حساب کر دیں گی۔ میں بہت پریشان ہوں۔ میں نے تو کئی لوگوں سے اپنی ذمہ داری پر سامان دلوا دیا تھا۔ وہ لوگ اِس قدر تقاضا کر رہے ہیں کہ میرا بازار میں بیٹھنا مشکل ہو گیا ہے۔''

''تم اپنی اماں کا زیور لے گئے تھے کیا اُس کو بیچ کر بھی تمہارا قرضہ نہیں اُترا۔'' رفیق احمد جو بہت خاموشی سے بیٹے کی باتیں سُن رہے تھے۔ اُس بیٹے کی جس کے پاس اُن کی خیریت پوچھنے کے لیے بھی ٹائم نہیں ہوتا، وہ جانتے تھے کوئی بڑا مسئلہ ہے جو بیٹا اُن کے پاس آ کر بیٹھا ہے، لیکن وہ باپ خود غرض، مطلب پرست اولاد کے لیے بھی سائبان ہی تھے۔ انہوں نے اپنا چشمہ اُتار کر سائیڈ ٹیبل پر رکھنا اور پھر دھندلی ہوتی آنکھوں سے بیٹے کے فکرمند چہرے کی طرف دیکھا۔ کم نظر آنے کے باوجود اُن کو عرفان کے چہرے پر فکر کی پرچھائیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ شاید انہوں نے بیٹے کو دل کی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

رفیق احمد نے گردن موڑ کر صحن میں ٹہل ٹہل کر فون پر باتیں کرتی، ہنسی مسکراتی اپنی بہو کو دیکھا اور پھر فکرمند چہرہ لیے بیٹھے بیٹے کو دیکھا۔ ننھے عبداللہ کو انہوں نے شفقت سے اُٹھا کر اپنی گود میں بٹھا لیا۔

''تو تم کیا چاہتے ہو۔'' ننھے عبداللہ کے بالوں کو پیار سے سہلاتے ہوئے انہوں نے عرفان کو بات کرنے کا

حوصلہ دیا۔

''ابا...... اگر آپ کہیں تو میں گاڑی بیچ دوں۔ بس جیسے ہی ڈاکٹر تابندہ آئیں گی، ہم دوسری گاڑی لے لیں گے۔'' عرفان نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''ہونہہ!'' رفیق احمد نے ایک ہنکارہ بھرا۔ ''ٹھیک ہے اگر گھر کی گاڑی چلانے کے لیے اس گاڑی کو بیچنا ضروری ہے تو بیچ دو۔'' انہوں نے جیسے ہتھیار ڈالے۔

''یہ زرقون کی پسندیدہ گاڑی تھی۔ بلیک XLI جو اُس نے بہت شوق اور ضد سے خریدی تھی۔''

''نہ جانے میری بچی کی قسمت میں کیا لکھا ہے۔ ایک ایک کرکے اُس کی ہر پسندیدہ چیز اُس کے ہاتھوں سے نکلتی جارہی ہے۔'' اُن کے دل کو ملال ہوا۔ اُن کو لگا اُن کا ملال سارے گھر میں پھیل گیا ہے۔ پہلی دفعہ لگا۔ سارا کمرہ دیواریں، تکیہ اور بستر سب ہی اُداس ہیں۔ اُن کا دل اِس اُداسی سے گھبرانے لگا۔ انہوں نے جلدی سے اُس گھبراہٹ سے نکلنے کی کوشش کی۔ اور وہ کامیاب بھی ہوگئے۔

''اور عرفان جلد از جلد میرے بچے عبداللہ کو کسی اچھے سے ڈاکٹر کے پاس لے کر جاؤ۔ اب تو یہ ہنستا ہی نہیں، نہ ہی کھیلتا ہے کیوں میاں؟ دادا کے لیے تو ہنسو گے نا۔'' انہوں نے عبداللہ کے گدگدیاں کیں اور وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ واقعی بچے معصوم ہوتے ہیں۔

☆......☆......☆

''تجھے پتا ہے نا بتول مجھے کمال سے کتنی محبت ہے اور کمال نے ہمیشہ مجھ کو پسند کیا لیکن یہ ضوفی نہ جانے کیسے بیچ میں آگئی۔'' رتی نے اپنی دیرینہ سہیلی بتول کو احمد کمال اور ضوفی کی منگنی کا البم دکھاتے ہوئے کہا۔

''تو تُو کیوں غم کرتی ہے۔ تُو تو اتنی حسین ہے تیرے لیے کیا کمی ہے۔'' بتول نے اُس کو مکھن لگایا۔

''وہ تو میں ہوں ہی خوبصورت، جبھی تو زیادہ دُکھ ہورہا ہے۔ اگر احمد کمال میرے مقابلے میں مجھ سے زیادہ یا کم از کم مجھ جیسی کسی لڑکی کو اپناتا تو شاید مجھے اتنا ملال نہیں ہوتا۔ افسوس اور ملال ہی تو ہے کہ جس کو پسند کیا وہ تو میرے پیر کی جوتی کے برابر بھی نہیں ہے۔ سوئٹر میرے ہاتھ کے بنے پہنتا رہا۔ کھانے میں پکا پکا کر کھلاتی رہی اور رشتہ بھیجا تو اُس نکٹی چپٹی ضوفی کے لیے میرا بس نہیں چل رہا کہ ضوفی کے چہرے پر تیزاب پھینک دوں۔'' رتی کا غصہ سے برا حال تھا۔

''اب ایسی باتیں نہ کرو رتی یہ دیکھو میں تعویذ لائی ہوں۔ ہماری اماں ان ہی مولوی صاحب کے پاس جاتی ہیں، جبھی تو ہمارے ابا غلاموں کی طرح اُن کے پیچھے پیچھے پھرتے رہتے ہیں۔ میں نے اُن کو تمہارا سارا کیس بتایا تھا تو کہنے لگے کہ یہ تعویذ پلاؤ۔ انشاءاللہ دل پر ایسی گھبراہٹ ہوجائے گی کہ خود منگنی توڑ دے گا۔'' بتول نے پرس کی چھوٹی جیب سے ایک مڑا تڑا کاغذ نکال کر رتی کی طرف بڑھاتے ہوئے رازدارانہ انداز میں کہا۔

''ارے رہنے دو بتول! پہلے بھی کتنے ہی پیسے جھونکے کچھ نہیں ہوا اور کمال گھٹنوں گھٹنوں ضوفی کی محبت میں ڈوب گیا۔ اب مجھے کچھ اور ہی کرنا پڑے گا۔ کچھ ایسا...... جو عام طور پر نہیں ہوتا۔ کیونکہ میں بھی عام نہیں ہوں۔'' رتی کا لہجہ عجیب سا تھا۔

''کیا کرو گی تم ایسا ویسا۔ خدا کے واسطے کچھ اُلٹا سیدھا مت کر بیٹھنا۔ چھوڑو اِس منحوس کمال کا پیچھا۔'' بتول اُس کے لہجے کی قطعیت پر گھبرا کر بولی۔

''ارے تم تو بہت ہی ڈرپوک ہو بتول۔ مجھے کمال پسند ہے۔ وہ میری پہلی محبت ہے۔ لیکن اب مجھے کمال سے شادی نہیں کرنی بلکہ اگر وہ ضوفی کو ٹھکرا کر میرے پاس آئے گا تو میں خود ایک زوردار ٹھوکر اُس کے منہ پر ماردوں گی لیکن اب مجھے ضد سی ہوگئی ہے۔ زندگی بھر ضوفی مجھ سے جیتتی رہی۔ ہمارے تو ابا مر گئے، اور ہماری اماں نے ہم کو جیسے پالا، بس اللہ جانتا ہے۔ ہمیشہ جو کھلونا مجھے پسند آیا۔ میں نے اُس کھلونے سے ضوفی کو کھیلتے دیکھا۔ میں دل مسوس کر رہ جاتی۔ جو اماں سے کہتی تو اماں اُس کے پرانے کھلونے مجھے لا دیتیں۔ میں ضوفی کی اُترن سمیٹتے سمیٹتے تھک گئی ہوں۔ ضوفی چار نئے سوٹ بناتی تو ایک پھوپو ترس کھا کر میرا بھی لا دیتیں اور ہماری اماں وہ جوڑا بھی سنبھال کر ٹرنک میں رکھ دیتیں۔ اور میں پھر پہنتی۔ مجھے وہی ملتی، ضوفی کی اُترن...... میں اِس زندگی سے، میں اِس خیرات زدہ زندگی سے تھک گئی ہوں۔ دل چاہتا ہے آسمان کی بلندیوں میں پرندوں کے ساتھ اُڑتی پھروں۔ کمال کو دیکھ کر میں نے سوچا تھا۔ شاید میری زندگی ایک نیا موڑ لے لے۔ مجھے یقین تھا اس دفعہ میں ضوفی سے جیت جاؤں گی۔ میں تو یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ یہاں پر...... اِس موقع پر، ضوفی...... نہیں میں یہ برداشت نہیں کرسکتی۔'' رقی نے غصے سے مٹھیاں بھینچیں۔

''آپ کو منگنی بہت بہت مبارک ہو۔'' رقی نے کمال سے ایک ادا سے کہا۔

''شکریہ۔'' کمال مسکرایا۔ اُس کی مسکراہٹ نے رقی کے دل پر ایک بھالہ مارا۔ ''تم اور تمہاری مسکراہٹ۔'' رقی کھول کر رہ گئی۔

''لیکن منگنی کرنے سے پہلے رشتہ ڈالنے سے پہلے کم از کم آپ ضوفی سے تو پوچھ لیتے۔'' رقی نے کمال کے کان میں سرگوشی کی۔

''کیا مطلب؟'' کمال نے حیرت سے سر سے پیر تک رقی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اوہ! جبھی ضوفی اِس قدر پریشان ہے۔ آپ تو جانتے ہیں وہ کس قدر بے وقوف اور احمق ہے۔ آپ نے رشتہ بھیجا اور اُس کے ماں باپ نے ہاں کردی اور ضوفی...... ضوفی کے دل کی کسی کو خبر ہی نہیں۔ آہ میری بہن ضوفی، اُس کی زندگی...... اُس کی زندگی کا ہر رنگ اپنا مرزا رفیق احمد کمال آپ نے چھین لیا۔''

رقیہ نے رفیق احمد کمال کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''کیا مطلب؟ آپ کیا کہنا چاہتی ہیں۔ فہمیدہ خوش نہیں۔'' رفیق احمد کمال کے منہ سے بے ساختہ ضوفی کی جگہ فہمیدہ نکلا۔

چلو تکلف کی ایک دیوار تو کھڑی ہوئی۔ رقیہ نے دل ہی دل میں قہقہہ لگایا۔

☆☆......☆☆

☆ فراز اور زرقون کی محبت کا اختتام ہوا۔ اب زرقون کا کیا ہوگا؟
☆ حیا اور مرتضٰی، دونوں بہن بھائی کیا کشمکش سے نکل پائیں گے؟
☆ عرفان کو زندگی کے انہونے فیصلے، جینے دیں گے؟
☆ رقیہ بیگم کے ماضی کے کون سے راز آشکار ہونے والے ہیں؟
☆ بڑو خالہ اپنے لیے معافی کا کون سا در کھولنے جارہی ہیں؟

اِن سب سوالوں کے جواب آئینہ، عکس اور سمندر کی ماہِ نومبر کی قسط میں ملاحظہ کیجیے۔

شادی کے ایسے بھرپور ہنگامے میں اماں نے مجھے ایک سادہ بادامی رنگ کے سلک کا جوڑا پہننے کو دیا تھا۔ اور وہ صندوقچی جس سے میری تمام آرزوئیں وابستہ ہوکر رہ گئی تھیں۔ وہی صندوقچی اماں نے آج بھی نہیں کھولی۔ میں اس قدر اُداس تھی کہ جب گھر میں دولہا......

روایات سے جڑا، ایک بہت خاص انتخاب

اُبٹن اور چکسہ مل مل کر سہیلیوں نے مجھے گا گا کر نہلایا۔ میرے لمبے لمبے بالوں میں عُود اور کچے اگر بتی کی دھونی دے کر انہیں خوشبوؤں میں بسا دیا، آنکھوں کو کاجل سے قاتل بنایا، کومل ہتھیلیوں کو مہندی سے خون رنگ کیا اور پھر سرخ چادر سے ڈھکے ہوئے بستر پر لا کر مجھے بٹھا دیا۔

آج میری شادی کا حسین دن ہے۔ وہ حسین دن جس کے لیے ہر لڑکی بچپن سے ہی خواب دیکھتی آئی ہے۔ میرے دل میں اس وقت کیسے ارمان اور اندیشے ایک ساتھ دھڑک رہے ہیں۔ اللہ! میری زندگی کا یہ سب سے حسین دن ہے۔ اے خدا......

میری خوشیوں کو ہمیشگی عنایت کردے۔ اے معبود!'' ابھی ابھی اماں آئیں گی۔ مجھے یقین ہے آج میری زندگی کی ایک اور تمنا حقیقت کا روپ دھارنے والی ہے۔

میرا زیوروں سے والہانہ عشق اور ہر بار اماں کا یہ کہنا ''اری بیٹی! لڑکیاں کنوارے پن میں زیور پہنتی ہیں تو شادی کے دن ان کے چہروں پر نور نہیں اترتا۔ ایسی تجھے کیا جلدی ہے۔ میں تو اپنی رانی بیٹی کو زیوروں سے لاد دوں گی۔ اک ذرا خدا تیری شادی کا دن تو لائے۔''

اماں کے پاس لکڑی کی ایک چھوٹی سی صندوقچی میں بچپن سے دیکھتی چلی آرہی ہوں۔ میں اماں کی اکلوتی اولاد ہوں۔ جب میں پیدا ہونے والی تھی تو بدنصیبی سے ابا ایک ٹرک کے نیچے آکر کچلے گئے اور پھر کبھی ہمارے گھر میں مردانہ قہقہہ نہ گونجا۔

اور اسی کے ساتھ چوڑیوں کی جھنکار بھی جیسے ہمیشہ کے لیے کھو کر رہ گئی۔ جب میں ذرا بڑی ہوئی تو میں نے اماں کو ہمیشہ سفید کپڑوں، سونی کلائیوں اور اجڑی مانگ کے ساتھ ایک حور کے روپ میں پایا۔ میری یادداشت میں کوئی ایسی گھڑی نہیں جب میں نے اماں کے بال سنورے ہوئے دیکھے ہوں، یا ان کے جسم پر کوئی خوبصورت سی ساڑھی دیکھی ہو۔

خاندان ہمارا بہت بڑا تھا۔ ننھیال اور ددھیال دونوں طرف کے بہت سارے رشتہ دار تھے۔ آئے دن کوئی نہ کوئی ہنگامہ مچا رہتا۔ کسی کے یہاں بچہ پیدا ہوا ہے، کسی کے یہاں شادی ہے، کسی کی منگنی ہے، کسی کی سالگرہ کا دھوم دھڑکا ہے۔ اماں نے زندگی میں کسی کا احسان مول نہ لیا۔ ہمیشہ مجھے اپنی خودی اور غیرت کو قائم رکھنے اور سر اٹھا کر چلنے کی تعلیم دی اور خود بھی میرے لیے مثال اور مشعلِ راہ بنی رہیں۔ کتنے ہی رشتہ داروں نے مجھے آسرا دینا چاہا، لیکن اماں نے کبھی اسے گوارا نہ کیا۔ ہمیشہ ایک درد بھری مسکراہٹ کے ساتھ انہوں نے یہی جواب دیا۔

''ابھی خدا کے فضل سے میرے بازوؤں میں اتنی قوت ہے کہ میں اپنا اور اپنی بیٹی کا بوجھ اٹھا سکوں۔'' ہر بار جب بھی کسی ہنگامے کی مجھے دعوت ملتی۔ اماں مجھے ساتھ لے کر ضرور جاتیں۔ سیدھے سادھے کپڑے، زیوروں سے میرا ہاتھ، کان گلا خالی......ایسے میں میرا جی مچلا کرتا کہ اماں کبھی تو وہ صندوقچی کھولیں جو ان کی الماری میں رہتی ہے۔ میری کتنی ساری سہیلیاں تھیں۔ سب یہی کہتی تھیں۔

''چاند تُو واقعی چاند ہے۔ خالہ نے تیرا نام کس قدر مناسب اور موزوں چُنا ہے۔ کبھی تو گہنے پائے پہنے تو اللہ قسم لوگ دل تھام کر رہ جائیں۔''

ایک لڑکی ہونے کے ناتے میرا دل خود بھی زیورات کے لیے ترسا کرتا۔ لیکن میں نے جب کبھی اماں سے شادی بیاہ منگنی سالگرہ کے موقعوں پر پہننے کے لیے گھڑی دو گھڑی ہی کو زیور مانگے، اماں نے وہی ایک جواب دیا۔ ''ایک ذرا خدا تیری شادی کا دن تو لائے۔''

☆......☆......☆

ننھی سی گڑیا سے میں ایک بچی بنی، بچی سے لڑکی اور پھر میں ایک بھرپور جوانی میں بدل گئی۔ اسکول سے نکل کر میں ایک کالج میں آ ئی۔ خدا مجھ پر ضرورت سے زیادہ مہربان تھا۔ میں نے ہر سال نمایاں کامیابی حاصل کی۔ اماں نے مجھ میں خود اعتمادی کا جذبہ یوں کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا کہ میں نے کبھی ناکامی کا منہ نہ دیکھا اور زمانے کے سب سے بڑے امتحان میں بھی میں نے کامیابی حاصل کر لی۔

میری محبت کا امتحان۔

☆......☆......☆

سلمٰی باجی کی شادی کا ہنگامہ عروج پر تھا۔ سب لڑکیاں بھاری زرتار جوڑوں میں ملبوس، زیورات سے اجلی، پیلی، ہنستی، کھیلتی شادی کی ریت رسموں میں حصہ لے رہی تھیں۔ اس دن زندگی میں مجھ پر شاید پہلی بار اُداسی اور غم کا شدید جذبہ چھایا ہوا تھا۔ شادی کے ایسے بھرپور ہنگامے میں اماں نے مجھے ایک سادہ بادامی رنگ کے سلک کا جوڑا پہننے کو دیا تھا۔ اور وہ صندوقچی جس سے میری تمام آرزوئیں وابستہ ہو کر رہ گئی تھیں۔ وہی صندوقچی اماں نے آج بھی نہیں کھولی۔ میں اس قدر اُداس تھی کہ جب گھر میں دولہا آ گیا، دولہا آ گیا کا شور مچا اور سب لڑکیاں بالکنی پر بھاگیں تو میں اسی جگہ ستون سے لگی کھڑی رہی۔ صحن میں ہزاروں قمقمے جل رہے تھے۔ میرے آنسوؤں کی طرح، ان ستاروں کی طرح جو میری آنکھوں میں چمک اٹھتے تھے اور جنہیں میں ہر بار جذب کرتی جاتی تھی۔ سب لڑکیاں، عورتیں اوپر بھاگ چکی تھیں۔ میں تنہا ہی کھڑی تھی کہ کسی کے قدموں کی چاپ پیچھے سے اُبھری۔ میں نے یوں ہی سر اٹھا کر دیکھا۔

ایک شعر

دیکھنا چاہتے ہو تم جہاں سارا
میری آنکھوں میں جھانک کر دیکھو

شاعرہ: صفیہ سلطانہ مغل

جمال نے مجھے بھرپور نگاہوں سے دیکھا۔ اس قدر بے باکی سے وہ میرے قریب چلا آیا کہ جس کی حد نہیں۔ بے پناہ اپنائیت اور پیار سے بولا۔

''خدا کی قسم چاند تم سچ مچ چاند ہو۔ یہ تمہارے سیدھے سادے کپڑے، یہ زیوروں سے محروم حسن۔ تم اتنی پیاری ہو کہ دنیا میں کوئی اتنا پیارا نہیں۔ کیا میں خالہ جان سے تمہارا یہ پیارا سا، مہندی سے بے رنگ ہاتھ مانگ لوں۔'' میں نے حیرت سے انکھیں اٹھا کر دیکھا تو وہ ذرا فخر سے ہنس کر بولا۔

''ارے بھئی! یوں ہی تم جیسی شہزادی کو نہیں مانگ رہے ہیں۔ انجینئر بن گئے ہیں اور اب ساڑھے بارہ سو تنخواہ پا رہے ہیں۔''

باہر زور زور سے باجے بجنے لگے شاید عقد خوانی ہو چکی تھی ایک دولہا نے ایک دلہن کو زندگی بھر کے لیے اپنا لیا تھا۔

میں نے اپنے گلے کو ٹٹولا، انگلیوں کو دیکھا، کانوں کی لوؤں کو ہاتھ سے محسوس کیا۔ کیا واقعی جمال نے مجھے پسند کر لیا ہے؟ اگر میں زیوروں سے سجی سنوری ہوتی۔ گوٹے کناری ٹانکے کپڑوں میں ملبوس ہوتی تو...... ایک لمحے کو میں سوچ سکتی تھی کہ شاید میرے حسن نے زیور اور کپڑے کے دھوکے اور بھرم میں جمال کے سامنے اپنا غلط روپ پیش کیا لیکن اس نے تو مجھے یوں سادگی میں دیکھا ہے کہ مجھے اپنے روپ سے شرم آ رہی تھی تو کیا میں یقین کر لوں کہ محبت کی یہ مانگ واقعی حقیقت پر مبنی ہے؟ کسی بناؤ سنگھار، کسی بناوٹ کو اس میں دخل نہیں؟

☆......☆......☆

اور بی اے کا نتیجہ نکلتے ہی اماں نے میرا ہاتھ جمال کے ہاتھوں میں دے دیا۔ وہ مضبوط ہاتھ جو زندگی بھر ان پھیلے ہوئے ہاتھوں میں خوشیوں کی سوغاتیں بھرتے رہیں گے اور میرے زیوروں سے، کنگنوں سے، چوڑیوں سے خالی ہاتھوں کو وہی ہاتھ سہاگ کے زیور بھی تو پہنائیں گے نا؟

لیکن خوشیوں سے بھرپور دل میں میری خوشی کا ایک اور چاند بھی چمک رہا تھا۔ آج تو بالآخر اماں مجھے وہ صندوقچی دے ہی دیں گی نا۔ جس میں جھلمل کرتے کرن پھول، جھمکے، جڑاؤ گلوبند، ہاتھوں کے کنگن، گلے کی سہاگ لڑی، انگلیوں کی انگوٹھیاں، ناک کی ننھی سی جگمگ کرتی لونگ۔ اور پتا نہیں کیا کیا نہ ہوگا۔

میرا دل مارے خوشی کے دھک دھک کرنے لگا، سچ مچ میں اور کتنی حسین نظر نہ آؤں گی۔ ابھی چند لمحے گزرے ہیں کہ کمرے میں اماں کے مبارک قدموں کی مانوس اور مدھم چاپ اُبھرے گی اور پھر اماں اپنے ناتواں اور کمزور لیکن عظیم ہاتھوں سے مجھے زیوروں سے لاد دیں گی۔

ارے اماں تو میرے سامنے ہی کھڑی ہیں۔ عزم واستقلال کا ایک عظیم ستون جس نے زندگی بھر مجھے سر اٹھا کر چلنے کی تعلیم دی، جس نے دکھوں میں بھی مسکراتے ہی رہنے کا سبق دیا، جس نے سدا آنسوؤں سے دشمنی کا درس دیا۔

ارے! آج ان آنکھوں میں آنسو! اماں خدا کے لیے مجھے آسرا دیجیے ورنہ میں گھٹ کر رہ جاؤں گی۔ میں اماں سے لپٹ گئی۔

تھرتھرائی ہوئی آنسوؤں بھری آواز سے وہ مجھ سے مخاطب ہوئیں۔

میری چاند! میری بیٹی، میری چاندنی، مجھے پتا ہے تو کتنی سمجھدار ہے۔ زندگی کی ناکامیوں سے کبھی ہار نہ ماننے والی۔ میری جان! غم تو صرف اس بات کا ہے کہ تیرے میکے میں تجھے صرف آس ہی آس ملی۔ عورت ہونے کے ناتے میں خود ہی اس چاہت کا اندازہ کرسکتی ہوں جو کسی بھی لڑکی کو زیوروں سے ہوتی ہے۔ میری گڑیا میں نے چاندی سونے کے زیورات کے بدلے تجھے علم کا زیور پہنایا۔ ظاہری حُسن کے بجائے یہ چاہا کہ میری بیٹی زندگی کی راہوں پر ثابت قدمی سے چلنا سیکھے، تیری انگلیوں میں انگوٹھیوں کی بجائے قلم دیکھنا زیادہ پسند کیا۔ میں عورت تھی بیٹا اور وہ بھی غموں کی ماری ہوئی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ تیرا حسن ان زیوروں کا محتاج رہتا جو بہرحال پیلی اُجلی دھات ہی تو ہے۔'' اماں کے گلے میں پھندا سا پڑنے لگا۔ وہ دم لے کر پھر بولنے لگیں۔

''وہ صندوقچی جو ہمیشہ خالی رہی۔ تیری توجہ کا مرکز بنی رہی۔ مجھے اس بات کی خوشی بھی ہے کہ میں جڑاؤ گلوبند سے بھی قیمتی ہار تجھے دے رہی ہوں۔ وہ مضبوط بانہیں جو سدا تیرے گلے کا ہار بنی رہیں گی۔ بیٹا ظاہری دکھاوا کوئی چیز نہیں۔ بس دعا ہے کہ تم اپنے شوہر کا دل جیت کر زندہ رہو۔ تمہارا آنگن ننھی منی کلکاریوں سے گونجتا رہے کہ یہی زندگی کا سب سے حسین زیور ہے...... اور خدا ہمیشہ تمہارا دامن محبت کے موتیوں سے بھرا رکھے۔ میری بیٹی......'' ایک سسکی نے سارے بند توڑ دیے۔

''اماں مجھے کوئی زیور نہیں چاہیے۔ اماں، اماں آپ نے وہ سب کچھ مجھے دیا ہے جو کوئی ماں اپنی بیٹی کو نہیں دے سکتی۔ اماں یہ صندوقچی خالی نہیں ہے۔ یہ تو منہ تک موتیوں سے بھری ہوئی ہے۔ میری اماں۔''

☆☆......☆☆

دوشیزہ میگزین
رنگِ کائنات
دوشیزہ گلستاں
نئے لہجے' نئی آوازیں
یہ ہوئی نا بات
لولی وُڈ' بولی وُڈ
نفسیاتی الجھنیں اور اُن کا حل
کچن کارنر
بیوٹی گائیڈ
Digest.pk

اسماء اعوان

فرمانِ الٰہی

کون ہے کہ اس کی اجازت کے بغیر اس سے (کسی کی) سفارش کر سکے۔ جو کچھ لوگوں کے روبرو ہو رہا ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہو چکا ہے۔ اسے سب معلوم ہے اور اس کی معلومات میں سے کسی چیز پر دسترس حاصل نہیں کر سکتے۔ ہاں جس قدر وہ چاہتا ہے (اسی قدر معلوم کرا دیتا ہے) اس کی بادشاہی (اور علم) آسمانوں اور زمین سب پر حاوی ہے۔ اور اسے ان کی حفاظت کچھ بھی دشوار نہیں۔ وہ بڑا عالی رُتبہ (اور) جلیل القدر ہے۔

(سورۃ البقرۃ 2۔ ترجمہ: آیت 255)

قانون ساز

اللہ رب العزت نے قرآن حکیم میں جگہ جگہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قانون ساز اور شارح قانون کی حیثیت کو واضح کیا ہے۔ مثلاً سورۃ النساء میں ایک جگہ ارشاد فرمایا ہے۔ ''اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسولؐ کی بھی اطاعت کرو اور تم میں سے جو لوگ صاحب اختیار ہوں، ان کی بھی اطاعت کرو، پھر اگر تمہارے اور صاحب اختیار لوگوں کے درمیان میں کسی معاملے میں کوئی اختلاف پیدا ہو جائے تو اس کو اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف لوٹا دو۔'' (سورۃ النساء: 59) اور ان کے احکام کی روشنی میں اس معاملے میں فیصلہ کرو اور حاکم وقت اور صاحب اختیار کے حکم کو ٹھکرا دو کہ ان معاملات میں صرف اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی فرماں برداری کی جائے کسی اور کی نہیں۔ اصل فرمانبرداری اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ہے۔

مرسلہ: کرم الٰہی۔ میر پور خاص

ظالم امتحان

کوئی مانے یا نہ مانے۔ ہم تو یہی کہیں گے کہ بچہ پیدائش کے وقت اس لیے روتا ہے کہ اب اسے اس ظالم دنیا میں نازل ہونے کی پاداش میں کئی امتحان دینے پڑیں گے۔ تعلیمی امتحان غالباً واحد مصیبت ہے جو بتا کر آتی ہے۔ نبض تیز اور سانسیں اکھڑنا شروع ہو جاتی ہیں، جیسے وقت نزع آن پہنچا ہو۔ وہ تو اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے ہماری موت کا ٹائم ٹیبل نہیں دیا۔ ورنہ بندہ ہر وقت الٹی گنتی گنتا رہتا۔ موت تو خیر سب کو آنی ہے مگر اس جینے کا کیا کیجیے کہ جس میں ہر گھڑی امتحان ہو، ویسے بھی روز جینا اور روز مرنا خاصا مشکل کام ہے۔

امتحان کے دنوں میں ان لوگوں پر خاص غصہ آ رہا ہوتا ہے جو گدھے گھوڑے سب بیچ کر سو رہے ہوتے ہیں۔ یہ غصہ رفتہ رفتہ حسرت میں تبدیل ہو جاتا ہے اور پھر یہ حسرت یوں شعر میں

ڈھل جاتی ہے۔

ہم راتوں کو اُٹھ کر روتے ہیں
جب سارا عالم سوتا ہے

امتحان کے دنوں میں دنیا بھی عجیب عجیب سی دکھائی دیتی ہے۔ تمام سوچیں گھوم پھر کر امتحان پر ہی آ کر رُکتی ہیں۔ امتحان ختم ہونے والے دن کا تصور کر کے خوش ہونے کا ہر دم جی چاہتا ہے۔ امتحان سے فراغت ملتے ہی ذہن میں سیر کرنے اور دوسرے پروگراموں کی ترتیب و تفصیل گھومتی رہتی ہے۔ خواہ فرصت ملنے پر بندہ چاہے کچھ بھی نہ کرے، مگر خوش ہونے کو یہ تصور بھی کافی ہوتا ہے کہ امتحان ختم ہو چکے ہیں۔

حسنِ انتخاب۔ شعبان کھوسہ۔ کوئٹہ

باعث افسوس

کرکٹ کے ایک جنونی شائق نے اپنے دوست کو بتایا۔ ''میری بیوی نے دھمکی دی ہے کہ اگر میں نے کرکٹ کو ترک نہ کیا تو وہ مجھے چھوڑ کر چلی جائے گی۔''

''ہاں! واقعی، یہ تو بہت برا ہوگا۔'' دوست نے افسوس سے کہا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو، میں اس کی کمی شدت سے محسوس کروں گا۔'' کرکٹ کے شائق نے افسردہ ہوتے ہوئے کہا۔

مرسلہ: شہزوری۔ پڈعیدن

آخری خواہش

جولیا مر رہی تھی۔ زندگی کی آخری سانسیں لیتے ہوئے اس نے پاس بیٹھے ہوئے اپنے شوہر سے کہا۔ ''میں چاہتی ہوں کہ جب میرا جنازہ قبرستان جا رہا ہو تو تم میت گاڑی میں میرے بھائی کے ساتھ بیٹھو۔''

''یہ ناممکن ہے جولیا ڈارلنگ۔'' شوہر نے کہا۔ ''تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں تمہارے بھائی سے شدید نفرت کرتا ہوں۔''

''مگر یہ میری آخری خواہش ہے ڈارلنگ، کیا تم اتنی سی خواہش بھی پوری نہیں کر سکتے۔'' جولیا نے افسردہ ہو کر کہا۔

''تم نہیں مانتی ہو تو میں اس کے ساتھ بیٹھ جاؤں گا۔ مگر یہ سمجھ لو کہ جنازے کا سارا مزا کرکرا ہو جائے گا۔'' شوہر نے بے ساختہ کہا۔

مرسلہ: حاذق ندیم۔ کراچی

غزل

دل میں جب آرزوئیں پلتی ہیں
پھر نگاہیں کہاں سنبھلتی ہیں
مری آنکھیں نہیں چراغ ہیں یہ
شام ہوتے ہی جلنے لگتی ہیں
کچھ سخن زادیاں ہیں ایسی بھی
جو مرے واسطے سنورتی ہیں
خواب ہے یہ کہ جادو نگری ہے
نت نئی صورتیں نکلتی ہیں
بن کے تصویر سی تری یادیں
جب مرے آنسوؤں میں ڈھلتی ہیں
لڑکیاں سارے شہر کی محبوب
رات دن میرے شعر پڑھتی ہیں

شاعر: محبوب صابر

انعام

درج ذیل اشتہار لندن سے شائع ہونے والے ایک معروف اخبار کے ''تلاش گمشدہ'' کے کالم میں شائع ہوا تھا۔

''نیلی آنکھوں والی ایک خوبصورت دوشیزہ جس کا قد ساڑھے پانچ فٹ، وزن 110 / پونڈ،

عمر 18 برس اور جو بہترین رقاصہ، اچھی شراب کی رسیا اور فن گفتگو میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ سونے کا ایک سگریٹ لائٹر کہیں کھو بیٹھی ہے، واپس لا کر دینے والے کو معقول انعام دیا جائے گا۔"

نمرہ عرفان۔کراچی

بڑے لوگ...... بڑی باتیں

☆ کوئی چیز بذاتِ خود اچھی یا بری نہیں ہوتی۔ یہ ہماری سوچ کا انداز ہے جو اسے اچھا یا برا بنا دیتا ہے۔ (شیکسپیئر)

☆ عظمت طاقتور ہونے میں نہیں بلکہ طاقت کے صحیح استعمال میں ہے۔ (ہنری وارڈ)

☆ بے مقصد زندگی سمندر میں ڈولتی ہوئی اس کشتی کی مانند ہے جس کو اپنے ساحل کا علم نہیں۔ (فردوسی)

☆ دوسروں کا بھلا کرتے وقت یقین رکھو کہ تم اپنا بھلا کر رہے ہو۔ (فارابی)

☆ نفرت کو محبت سے کم کرو کیونکہ نفرت، نفرت سے کم نہیں ہوتی۔ (گوتم بدھ)

☆ سچا دوست وہ ہے، جو آپ کی طرف اس وقت آئے جب ساری دنیا آپ کا ساتھ چھوڑ چکی ہو۔ (بقراط)

نور العین۔اسلام آباد

محبت

ہر خوبصورت چیز سے پیار کیا جاتا ہے اور اسے حاصل کرنے کی خواہش اس وقت تک قائم رہتی ہے جب تک وہ نہ مل جائے۔ کسی انجانی شے کو دل ہر قیمت پر دیکھنا چاہتا ہے لیکن جب پردہ اٹھ جاتا ہے تو دیکھنے کی خواہش بھی ختم ہو جاتی ہے۔

محبت بھی ایسا حسین تخیل ہے جو دلوں تک محدود رہتا ہے۔ جب دلوں کے پاک جذبوں کو انسان پھلانگ جاتا ہے تو محبت ختم ہو جاتی ہے اور یہیں سے ہوس کی حد شروع ہو جاتی ہے جس میں محبت کا شائبہ تک نہیں ہوتا کیونکہ محبت کا وجود تو صرف پاکیزگی کی حدت ہوتا ہے۔

اگر پتھر کو بھی محبت سے سنوارا جائے تو صنم بن جاتا ہے۔

مرسلہ: رابعہ وقاص۔گوجرانوالہ

باتوں سے خوشبو آئے

☆ حق کا پرستار کبھی بھی ذلیل نہیں ہوتا، پھر چاہے ساری دنیا اس کے خلاف ہو جائے۔

☆ جس گھر میں کتابیں نہ ہوں، وہ اس جسم کی طرح ہے جس میں روح نہ ہو۔

☆ آزادی کی حفاظت نہ کرنے والا، غلامی میں گرفتار ہو جاتا ہے۔

☆ ہر شخص کو اپنے سے بہتر سمجھو، عزت اور بلندی پاؤ گے۔

☆ دنیا دریا ہے اور آخرت کنارہ، کشتی تقویٰ ہے اور لوگ مسافر۔

☆ خوشی ہی تندرستی ہے اور اس کے برعکس غم بیماری کا گھر ہے۔

☆ حسنِ اخلاق اور نیک اعمال ایسا حسن ہے جس کو کبھی زوال نہیں۔

مرسلہ: ایمن۔شیخوپورہ

شاعری میں......

☆ ایک سطر کو مصرع کہتے ہیں۔

☆ دو مصرعوں کو شعر کہتے ہیں۔

☆ تین مصرعوں والی نظم کو مثلث یا ثلاثی کہتے ہیں۔

☆ چار مصرعوں والی نظم کو رباعی کہتے ہیں۔

☆ پانچ مصرعوں والی نظم کو مخمس کہتے ہیں۔
☆ چھ مصرعوں والی نظم کو مسدس کہتے ہیں۔
مرسلہ: علوینہ۔ خوشاب

خوش فہمی

تفریحی مقام پر پہنچنے والے ایک صاحب نے گائیڈ سے تصدیق چاہی۔ ''کیا یہ جگہ دمہ کے مریضوں کے لیے اچھی ہے۔''

''جی ہاں!'' گائیڈ نے جواب دیا۔ ''جبکہ یہاں کی لڑکیاں اتنی بے وقوف ہیں کہ وہ سمجھتی ہیں کہ یہاں آنے والے لوگوں کی سانسیں اُنہیں دیکھ کر تیز ہو رہی ہیں۔''

مرسلہ: نسیم شفیق۔ اسلام آباد

اپریل فول

ایک چھوٹا مگر ذہین بچہ اپنی تیز و طرار ماں سے کمرے میں آ کر اپنے ملازمین کی شکایت کرنے لگا۔ ''امی، امی! فضلو اور نوراں کچن میں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہوئے نہ جانے کیا کیا باتیں کر رہے تھے۔ مجھے دیکھا تو دونوں الگ ہو گئے۔''

''کیا کہا تم نے......؟ میں ابھی ان دونوں کی خبر لیتی ہوں۔ بچے کے سامنے ایسی حرکتیں کرتے ہوئے شرم نہیں آتی دونوں کو...... فضلو کو تو میں ابھی نوکری سے نکالتی ہوں اور نوراں کو......!''

وہ غصے میں زور سے بولتی جا رہی تھی کہ بچے کی تالیوں کی آواز سُن کر رُک گئی۔ ''اپریل فول...... اپریل فول......! امی، وہ فضلو تھوڑی تھا، وہ تو ڈیڈی تھے۔''

مرسلہ: ذیشان بخاری۔ لاہور

بدلنا پڑا

دوستیاں، رشتے اور حسین ناتے
کہیں رکھ کے سارے بھول گئی
نثار اپنی زندگی کر دی
اُس سے ملنے پر خود کو بھول گئی
پر آج اُس کے لہجے میں
کچھ تو ایسا عجب تکلف تھا
کہ مجھے فیصلہ بدلنا پڑا
اور خود ہی آنسوؤں میں رُلنا پڑا

شاعرہ: شگفتہ شفیق

میری ماں

آٹھ سال کے بچے کی ماں انتقال کر گئی تو کچھ عرصہ بعد اس کے باپ نے دوسری شادی کر لی۔ ایک دن باپ نے بچے سے پوچھا۔ ''تمہیں پہلی ماں اور نئی ماں میں کیا فرق لگا؟''

بیٹا معصومیت سے بولا۔ ''پہلے والی ماں جھوٹی تھی جبکہ نئی والی سچی ہیں۔''

باپ نے حیرت سے کہا۔ ''وہ کیسے بیٹا؟''

بچے نے کہا۔ ''جب میں شرارت کرتا تھا تو پہلے والی ماں کہتی تھی کہ اب شرارت کی تو کھانا نہیں دوں گی۔ میں شرارت کرتا تھا اور وہ مجھے پورے گاؤں میں ڈھونڈ کر کھانا کھلاتی تھی لیکن نئی ماں کہتی ہے کہ شرارت کی تو کھانا نہیں دوں گی اور وہ اپنا کہا پورا کرتی ہے۔ آج دو دن ہو گئے ہیں انہوں نے مجھے کھانا نہیں دیا۔''

مرسلہ: منشی عزیز مئے۔ لڈن، وہاڑی

قطعہ

ہمارا ہے منشور لوگوں کی خدمت
بُرا لاکھ ہم کو کہے گو زمانہ
یہ بجلی کا ہر وقت جاجا کے آنا
''لہو گرم رکھنے کا ہے اِک بہانہ''

شاعر: راؤ تہذیب حسین تہذیب

نئے لہجے نئی آوازیں

تیری یاد میں...

کس بات کی تم کو جلدی تھی
کیوں ہم کو روتا چھوڑ گئیں
باغوں میں پھول کھلے تھے ابھی
تم گھر کو سُونا چھوڑ گئیں
چاند اپنے جوبن پر تھا ابھی
کیوں اس کو تنہا چھوڑ گئیں
سب تیرے بعد ادھورے ہیں
کیوں ہم سب کو تم چھوڑ گئیں
یہ ریت بنائی اللہ نے
ہر اِک کو یہاں سے جانا ہے
جانے کی ہماری باری تھی
کیوں ہم کو اکیلا چھوڑ گئیں
بشریٰ خالد۔کراچی

غزل

اتر جائے گا غفلت کا بخار آہستہ آہستہ
جو ہوں گی مشکلیں سر پر سوار آہستہ آہستہ
ابھی تو کیمیا گر، دے رہا ہے مفت میں نسخے
چمک اٹھے گا اِک دن کاروبار آہستہ آہستہ
ذرا قیدی اسے ناز و ادا کا ہوتو جانے دو
چلا آئے گا خود کھنچ کے شکار آہستہ آہستہ
بہر صورت مری سرکار مجھ سے مانگ لیتی ہے
جمع کرتا ہوں جو یہ دوچار ہزار آہستہ آہستہ
بہت ہے ناز نیرؔ آپ کو ان کی محبت پر
اتر جائے گا اب یہ بھی خمار آہستہ آہستہ
نیرؔ رضاوی۔لیاقت آباد۔کراچی

یہ زندگی......

کیا بتاؤں تابش کہ کیا ہے زندگی
اس بے وفا کی یادوں کا اِک صحرا ہے زندگی
چاہتوں نے اُس کی کیا، اس قدر گھائل
کیا کہوں اب تو زخم زخم ہے زندگی
نیند تو آنکھوں سے کوسوں دُور جابسی
بکھرے بال، سرخ آنکھیں بہت ویراں ہے زندگی
اُس کی چاہتوں نے کیا بدنام اِس قدر
ورنہ ہماری تو تھی گمنام زندگی
میری چاہتوں کی تو اس نے کچھ قدر نہ کی
آج کسی غیر کی بانہوں میں آباد ہے میری زندگی
شاعر: پرنس تابش۔چشتیاں

ایک نظم

یہ زمین پر جواَب
رُل رہے ہیں پیروں میں
وقت کے بھکاری ہیں
آسماں کے پالے ہیں
تیری آنکھوں میں جاناں
بے شمار سپنے ہیں
میری آنکھوں میں جاناں
بے شمار چھالے ہیں
شاعر: ڈاکٹر وقار خان۔ملتان

اِک تیرے جانے سے

میرے ہمسفر، میرے ہم نشیں
اِک تیرے جانے سے
میرے گھر میں
کیسا یہ آسیب اُترا ہے
نگاہ برسی ہے دل تڑپا ہے
گھر کے کونے کونے میں
ویرانی سی چھائی ہے
میرے گھر کے سُونے آنگن میں
شامِ غریباں اُتر آئی ہے
یاسمین اقبال۔سنگھ پورہ۔لاہور

غزل

حیا سے گال بھی تو لال ہوتے ہیں
مری بانہوں میں وہ بے حال ہوتے ہیں
بچاری فاختہ کی زندگانی میں
مصیبت کے ہزاروں جال ہوتے ہیں
اُنہیں میری خبر گیری سے کیا مطلب
کہ ہم جن کے لیے بے حال ہوتے ہیں
جو تم سے دور رہ کر کاٹتا ہوں میں
وہ کچھ لمحے ہزاروں سال ہوتے ہیں
وڈیروں کی حکومت ہو جہاں عادل
وہاں غرباء سدا بدحال ہوتے ہیں
عادل حسین۔کراچی

''عشق''

کبھی غم میں جل کر راکھ ہوئے ہم
کبھی عشق میں لگی آگ ہوئے ہم
سارے جہاں سے ہم کو چنا بس
یوں عشق کے لیے نایاب ہوئے ہم
عشق نے ہر پل دیکھا ہم کو ایسے
عشق کی آنکھ کا خواب ہوئے ہم
عشق ہمیں اوڑھ کے سویا یوں نور
ایسے عشق کی قبر کی خاک ہوئے ہم
سیدہ نورالعین زاہرا۔لاہور

میرا محبوب

میں مقتول بھی ہوجاؤں یہ غم نہیں مجھ کو
وہ قاتل کہلائے یہ گوارا نہیں مجھ کو
شمار کرتا ہے وہ میرا اپنے گناہوں میں
ساری دنیا سے چھپائے رکھتا ہے وہ مجھ کو
نہ روکے گا نہ جانے دے گا میرا محبوب
بس چپ چاپ دیکھتا رہے گا مجھ کو
پھر اس کے بعد موت بھی آجائے تو غم نہیں
بس اِک بار ٹوٹ کے چاہے تو مجھ کو

ہر طوفان سے ٹکرا جاؤں گی میں بشرط
ساحل کی ایک جھلک نظر آجائے گر مجھ کو
شاعرہ:عنبرین نعیم۔کراچی

ساون یاد

یہ ساون کا بھیگا موسم
یہ اَکھیوں سے بہتا کاجل
یہ دل کی ہلچل
یہ کوئل کی کوک
یہ من سے اُٹھتی ہوک
یہ شور مچاتی ہوائیں
بدمست کالی گھٹائیں
یہ کس کو پکاریں یہ کس کو بلائیں
سن او سجناں! دیر نہ کرنا
آجا ساون بیتا جائے
نہ ساون تجھ بن بھائے
فصیحہ آصف خان۔ملتان

محبت

کیا ہوتی ہے یہ محبت؟
زمانہ تو اسے جرم کہا کرتا ہے
مگر پھر بھی......
ہر زباں پہ یہی لفظ ہوا کرتا ہے
لبوں پہ مسکراہٹ ہے اسی اک لفظ کے صدقے
محبت اک نئی صبح، محبت رات بھی نوری
مگر جب رات ہوتی ہے......
تری یادیں میری جاناں، مجھے سونے نہیں دیتیں
نہیں تُو ساتھ اب میرے
چلو اک داغ دامن پہ، محبت نام کا تو ہے
میرے جینے کو بس اتنا۔اے میری جان کافی ہے
مجھے تم سے محبت ہے......
مجھے تم سے محبت ہے......
شہزاد علی۔کراچی

سوال آپ کے......
جواب زین العابدین کے!!

اِس ماہ لیلیٰ گل ۔ بھوربن کا سوال انعام کا حق دار ٹھہرا۔ انہیں اعزازی طور پر دوشیزہ گفٹ ہیمپر روانہ کیا جا رہا ہے (ادارہ)

جیجل میتلو ۔ ڈیفنس، کراچی

☺: امی کہتی ہیں جگ میں رہنا ہے میں سوچتی ہوں اس چھوٹے سے جگ میں ہم سمائیں گے کیسے؟

✎: جیسے اب تک سمائی ہو۔

نسرین یاسین ۔ حیدرآباد

☺: اللہ غنی ہے انسان غمی ہے دولت پانی ہے دنیا فانی ہے پھر کیوں انسان دولت کے لیے دشمنی جانی ہے؟

✎: اس کے پیچھے چھپی شیطان کی کارستانی ہے۔

سید محمد علی ۔ لاہور

☺: حسن اتفاق کسے کہتے ہیں؟

✎: جب دور سے خوب صورت نظر آنے والی لڑکی قریب آنے پر لڑکا نکلے؟

نعمانہ بٹ ۔ وزیرآباد

☺: محبت اور دولت میں سے آپ کس چیز کا انتخاب پہلے کریں گے؟

✎: محبت حاصل کرنے کے لیے پہلے دولت کا انتخاب کرنا ہوگا۔

کاشف ندیم ۔ گوجرانوالہ

☺: اعتماد کی دیوار کب گر جاتی ہے؟

✎: جب شک کے تیز جھکڑ چلنا شروع ہوجائیں۔

ندا امتیاز ۔ واہ کینٹ

☺: وہ کون ہے جسے دیکھ کر دل کی کلی کھل اٹھتی ہے لیکن جب وہ جاتا ہے تو نقصان پہنچا کر چلا جاتا ہے؟

✎: قاضی!

اشرف علوی ۔ سکھر

☺: دل کا دیا کس طرح روشن کیا جاسکتا ہے؟

✎: کسی دوسرے کی ماچس سے۔

قمر فاطمہ ۔ پڈعیدن

☺: کیا محبت کا اظہار کرنا ضروری ہے؟

✎: آج کل تو ضروری ہے کیونکہ یہ پہلے آیئے پہلے پایئے کی بنیاد پر کی جاتی ہے۔

جمیل شاہ۔ملتان

☺:سنو! وہ بے غرض اور بے لوث دوستی کے زمانے کدھر گئے؟

✎:ابھی تو یہیں تھے۔اچھی طرح ڈھونڈو۔

دردانہ حفیظ۔لاہور

☺:پرسکون زندگی گزارنے کے لیے شوہر کے پاس کس چیز کا ہونا ضروری ہے؟

✎:بہرہ پن۔

رحمٰن خان۔میرپور

☺:ہمارے ملک کی بڑی بڑی سیاسی پارٹیاں کون سی ہیں؟

✎:ہمارے ملک میں ہر سیاسی پارٹی بڑی ہے

روشن علی شاہ۔اسلام آباد

☺:بھیاجی! آپ بتائیں ہر روز میرا ہی ستارہ کیوں گردش میں رہتا ہے؟

✎:اخبار الٹا تو نہیں پڑھتیں آپ۔

سید زاہد علی۔لائل پور

☺:میں بلوچستان میں **CNG** اسٹیشنز کھولنے کا ارادہ رکھتا ہوں کیا کروں؟

✎:ارے بھائی پہلے وہاں عام پبلک تک گیس تو پہنچادو۔
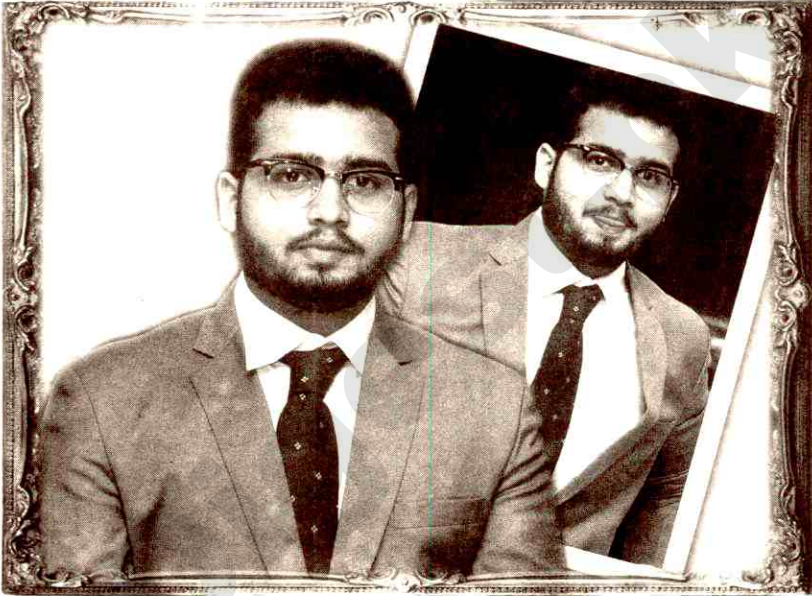
سید بدر عالم۔ایبٹ آباد

☺:سنا ہے، پہلے زمانے میں فلمیں پردے پر چلا کرتی تھیں؟

✎:میں نے بھی سنا ہی ہے۔

محمد فرخ۔کوٹری

☺:تارے آسمان پر ہی چمکتے ہیں کیا؟

✎:اکثر سر پر بھی چمکنے لگتے ہیں۔

نسیم ظہیر۔ساہیوال

☺:رومن اعداد،نصاب میں کیوں شامل ہیں؟

✎:تاکہ مجھے اور آپ کو گھڑی کا استعمال آجائے۔

اوج فرحان۔سجاول

☺:بھیا کراچی میں کوئی ایسی عمارت ہے جو جنوں نے بنائی ہو؟

✎:یہ کام جنات ہی کرتے ہیں، آدمی تو بس......

صبیحہ خان۔کراچی

☺:زین جی، اگر مہینہ ساٹھ دن کا ہوتا تو؟

✎:تو بھی کوئی فرق نہ پڑتا، ہم یہی سب کچھ، تب بھی کر رہے ہوتے۔

لیلیٰ گل۔بھوربن

☺:پہیہ چلتے رہنے سے کیا فائدہ ہے؟

✎:پیٹرول، بادل بنا رہا ہے۔

احمد کامل۔گجرات

☺:زین بھائی، چڑیا لائی چنے کا دانہ اور چڑا کیا لایا؟

✎:پورا پیزا......اب چڑیا چڑا بھی موڈی ہو گئے ہیں۔

غزل مقصود۔بلوچستان

☺:زین بھائی تشہیر کا سب سے تیز ذریعہ کون سا ہے؟

✎:آج بھی وہی اپنی بی جمالو ٹائپ، آنٹیاں۔

غیاث الدین۔پشاور

☺:**Instant** لفظ کس کی ایجاد ہے؟

✎:جس نے ایجاد کیا، جلدی میں تھا۔نام بتانا بھول گیا۔

روبینہ سعید۔میلسی

☺:اگر کسی دن سورج طلوع نہ ہو تو کیا ہوگا؟

✎:اگلے ایک ہفتے تک کی بریکنگ نیوز یہی چلے گی۔

جوہری عارف خان۔لانڈھی، کراچی

☺:ملک الموت اور ڈاکٹر میں کیا فرق ہے؟

✎:سوچنا پڑے گا۔

زاہد بشیر۔چھم جوڑیاں

☺:اگر موبائل ایجاد نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟

✎:موبائل سے پہلے کیا تھا......؟

آیان فخر۔کوٹ ڈیجی خان

☺:سیاستدان اور سائنس دان میں کیا فرق ہے؟

✎:دونوں ہی کچھ تباہ کرنے کا سوچتے ہیں۔

☆☆......☆☆

"یہ ہوئی نا بات" کے لیے میرا سوال یہ ہے...

____

____

کوپن برائے نومبر 2014ء

نام: ______________________

پتا: ______________________

اِک ذرا بکرمنڈی تک

آگے بڑھے تو ایک جگہ دو خوبصورت گائیں نظر آئیں۔ انہوں نے اپنے آپ کو جنت کی حوریں کہہ کر تعارف کرایا اور قیمت تین لاکھ بتائی۔ قیمت سُن کر ذہن کو ایسا جھٹکا لگا جیسے ان میں سے ایک گائے نے لات ماردی ہو۔ گائے بیل کی ایک اور جوڑی ہیر رانجھا کے نام......

بقرعید کے موقع پر لکھی گئی ایک تحریر خاص، جو آپ کو ضرور گدگدائے گی

بقرعید کیا آئی کہ گائے بکروں کی بن آئی۔ جدھر جاؤ بنے سنورے، اچھلتے کودتے اور اٹھلاتے ہوئے گزر رہے ہیں۔ ہر طرف میں، میں کی پکار ہے۔ گویا اپنے وجود کا احساس دلا رہے ہیں اور انسانوں سے کہہ رہے ہیں کہ تم کیا اور تمہاری اوقات کیا۔ بس میں ہی میں ہوں۔ یقین نہ آئے تو اپنے اور میرے دام کا فرق دیکھ لو۔ تمہیں کوئی دو کوڑی کو بھی نہیں پوچھتا اور میں، جی ہاں میں تین لاکھ کی قیمت رکھتا ہوں یا رکھتی ہوں۔

ایک بکرے نے تو بڑے نخرے سے کہا۔ ''تم لوگ آپس میں ایک دوسرے کو بزدل (بُز = بکری، دل = قلب) کہتے ہو۔ یعنی جس کسی کو کمزور یا بے حیثیت گردانتے ہو، اسے بزدل کہہ کر پکارتے ہو۔ آج ہمارے سامنے بڑے سے بڑا بہادر بھی بزدل ہے۔ اگر نہیں، تو ذرا بیچ سڑک کے کوئی ہماری طرح بکرامستی کر کے دکھائے، ہماری قیمت چکائے۔ ہم نے سڑک کے گرد جو ڈیرے ڈال رکھے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم میں سے بیشتر کے سڑک پر صرف قیام کا پچاس تا سو روپے یومیہ کرایہ ہے، جو ہم اپنی ہی طرح بہادر پولیس کے اہلکاروں کو دیتے ہیں۔ قیام کے علاوہ طعام اور اس کے مابعد نتائج واثرات کے لیے ہمیں سڑکوں پر جو آزادی میسر ہے، تم انسانوں میں ہے کوئی مائی کا لال یا لعل جو یہ سب کچھ کر کے دکھائے۔''

ہم نے بکرے کی لمبی چوڑی تقریر سن کر کہا، کچھ اور بکنا ہو تو بک دے۔ اس نے ایک بار پھر دانت بند کیے اور منہ کھول کر ایک خاص انداز سے اوپر اٹھایا۔ پھر ہم نے غور سے سنا تو وہ کچھ یوں بک رہا تھا۔

''ہاں تو جناب، ہماری قیمت کے علاوہ معاشرے میں قدر کا اندازہ یوں کرلو کہ آج کل ہر جگہ ہمارا ہی تذکرہ ہے۔ جہاں جاؤ ہم ہی موضوع گفتگو نظر آئیں گے۔ ہمارے مقابلے میں آج کے دن بڑے سے بڑے صاحبِ حیثیت ومنصب کا کوئی

مرتبہ و مقام نہیں، بلکہ وہ خود ہمارا ذکرِ خیر کرتا ہوا نظر آئے گا۔ اخبارات میں ہماری خبریں ہیں۔ گلیوں، بازاروں، گھروں اور محلوں میں ہمارے چرچے ہیں۔ ڈراموں اور تھیٹروں میں ہمارا نام نامی اسم گرامی بڑی آن بان اور شان سے لیا جاتا ہے۔ مثلاً اسٹیج پر پیش کیے جانے والے بعض ڈراموں کے نام کچھ اس طرح ہیں۔ بکرے دل والے، مزاحیہ بکرے، آزاد بکروں کی عید، قیدی بکروں کی بقرعید، شہری بکرے، پہاڑی بکرے، آؤ بکرا منڈی چلیں، بکرا سستا قصائی مہنگا، بکرا قسطوں پہ وغیرہ۔

دوسروں کے مال و دولت پر بکر کود کرنے والے انسان ہم بکروں کو یہ طعنہ دیتے ہیں کہ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی، آخر تو چھری کے نیچے آئے گی۔

''تو عرض ہے کہ ہم تو کچھ عرصے خیر منا بھی لیتے ہیں، تم انسانوں اور خاص طور پر بزدل انسانوں کا تو آج تک ایک لمحہ بھی خیر سے نہیں گزرا۔ تمہاری گردن تو ہمیشہ چھرے تلے یا بندوق کے سامنے رہتی ہے اور ہر لمحہ موت و زیست کی کشمکش میں گزرتا ہے۔ کیا یہ مصرع کسی بکرے کا ہے

مجھے کیا برا تھا مرنا، اگر ایک بار ہوتا

ظاہر ہے کہ کوئی بکرا ایسی بات نہیں کہہ سکتا، کیونکہ وہ جب تک زندوں میں ہے اپنی ہی زندگی گزارتا ہے اور جب چھری تلے آتا ہے تو پھر راہِ خدا میں قربان ہو جاتا ہے۔ تبھی تو اس کو ذبح کرتے وقت نہایت شقی القلب قصائی تک بسم اللہ، اللہ اکبر کہنے پر مجبور ہوتا ہے۔ لیکن تم انسان جب ایک دوسرے کو ذبح کرتے ہو تو جسم و ذہن سے اس قدر ناپاک ہوتے ہو کہ ایسا کوئی کلمہ خیر تمہاری زبان پر آ ہی نہیں سکتا۔

ہم میں اور تم میں قربانی کا جذبہ ''مشترک'' ضرور ہے مگر فرق یہ ہے کہ ہماری قربانی کا ایک عظیم اور واضح مقصد ہوتا ہے جبکہ تمہاری قربانی اکثر بے مقصد ہوتی ہے۔ اور اگر کبھی مقصد ہو بھی تو بیشتر صورتوں میں وہ مقصد نہایت گھٹیا ہوتا ہے۔''

ہم اس دانا و بینا بکرے کی باتیں بُزاخفش کی طرح سر ہلا ہلا کر سن رہے تھے کہ قریب سے کچھ آوازیں آنے لگیں جو بھیں بھاں سے زیادہ سمجھ میں نہ آئیں۔

قریب گئے تو کچھ دوسری قسم کے جانور نظر آئے جو قد کاٹھ میں کچھ بڑے تھے۔ انہوں نے اپنا تعارف گائے، بیل کے طور پر کرایا اور شجرۂ نسب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کے بچھڑے سے ملایا۔ گائے کو عام طور پر غریب اور بے زبان جانور سمجھا جاتا ہے لیکن بیل کو منہ زور اور اگر وہ بگڑا بیل ہو تو شہ زور بھی کہا جاتا ہے۔

ایک گائے نے اپنے آپ کو دلہن ایک رات کی قرار دیا۔ سبب اس کا یہ بتایا کہ میرا جو بناؤ سنگھار تم آج کی رات دیکھ رہے ہو وہ صبح تک خاک میں مل چکا ہوگا۔ ایک قصائی آئے گا، میرے گلے پر چھری پھیرے گا اور میں دلہن ایک رات کی سے قتیل ایک دن کی ہو جاؤں گی۔

آگے بڑھے تو ایک جگہ دو خوبصورت گائیں نظر آئیں۔ انہوں نے اپنے آپ کو جنت کی حوریں کہہ کر تعارف کرایا اور قیمت تین لاکھ بتائی۔ قیمت سن کر ذہن کو ایسا جھٹکا لگا جیسے ان میں سے ایک گائے نے لات مار دی ہو۔

گائے بیل کی ایک اور جوڑی ہیر رانجھا کے نام سے مقبول تھی لیکن اس کی قیمت بھی ہمیں قبول نہ تھی کیونکہ وہ ہماری اپنی جوڑی کی قیمت سے کہیں زیادہ تھی۔

ایک دیہاتی اپنے بیل کی نکیل تھامے کھڑا تھا۔ ہم نے اس کا نام اور دام پوچھا تو پتا چلا کہ موصوف

ہیبت خان کے نام سے موسوم ہیں اور قیمت ان کی بھی لاکھوں میں ہے۔نکیل کے بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اب نام ہی ہیبت خان رہ گیا ہے۔ جب سے ان کی بچھیا جدا ہوئی ہیں، دبیل خاں ہوکر رہ گئے ہیں۔

جدائی کی وجہ پوچھی تو بتایا گیا کہ محترمہ کے یہ محترم جوع البقر میں مبتلا ہوگئے تھے۔ایک حکیم نے ان پر نوازش کی اور ان کے علاج سے موصوف کا یہ حال زار ہوگیا ہے۔

دنبوں، مینڈھوں اور بھیڑوں سے گزرتے ہوئے ہم ایک اونٹ تک پہنچے۔اس کی لمبی ٹانگوں، طویل گردن اور اونچے کوہان سے متاثر ہوئے۔سوچا اس کا سودا کرلیں، شاید یہی ہمارے کام آجائے۔ لیکن بہ نظر غائر دیکھا اور لوگوں سے پوچھا تو پتا چلا کہ اس کی کوئی کل ابھی تک سیدھی نہیں ہوسکی ہے۔ لہٰذا فی الحال اس سے کسی قربانی کی توقع رکھنا فضول ہے۔ یہ محنت کش ضرور ہے لیکن جب غصے میں آتا ہے تو پھر کسی کو نہیں دیکھتا، اپنے مالک کی بھی گردن دبوچ لیتا ہے۔

تنگ آکر ایک گاؤدی بکرے پر اپنا ایک ہاتھ رکھا۔ دوسرا ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھا اور بکرے والے سے کہا کہ ہماری جیب میں جو کچھ ہے وہ تمہارا ہے۔ اس نے ہماری جیب خالی کی اور ہم اس مزاحیہ بکرے کے ساتھ بکر کودکرتے ہوئے گھر آگئے۔

یہاں پہنچ کر خیال آیا کہ دیکھا جائے یہ بکرا دو دانت کا ہے بھی یا نہیں۔ جوں ہی اس کے منہ میں ہاتھ ڈال کر دانتوں کو پکڑا تو اس کی پوری 'بتیسی' ہمارے ہاتھ میں آگئی۔ اس نے بغیر دانتوں کے مسکرا کر ہماری طرف دیکھا اور نہایت خفیف آواز میں دو مرتبہ ''میں، میں'' کہا اور ہم بھی ممیا کر رہ گئے۔

☆☆......☆☆

ڈی۔ خان

کومل رضوی حب الوطنی فیور میں

ٹیلنٹڈ اداکارہ، گلوکارہ کومل رضوی عرصے بعد لائم لائٹ میں واپس آگئی ہیں۔ اور شاید یہ جذبہ دھرنوں میں عوام کا جوش وخروش دیکھ کر اُن میں جاگا ہے۔ بہت جلد آپ اور ہم مس (آہم) رضوی کو کسی بھی عوامی جلسے میں حب الوطنی کے گیت گاتے سُنیں گے۔ اور ہاں ساتھ میں ''پرفارم'' کرتے ہوئے بھی۔

کنگ خان اور کاجل پھر سے ایک ساتھ

لیجیے دوستو! کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے اور اب ماضی کی یادگار جوڑی پھر سے ایک بار شائقینِ فلم کے دلوں پر راج کرنے آرہے ہیں۔ شاہ رخ خان اور کاجل کو روہیت سیٹھی نے اپنی آنے والی نئی فلم میں کاسٹ کیا ہے جو کہ
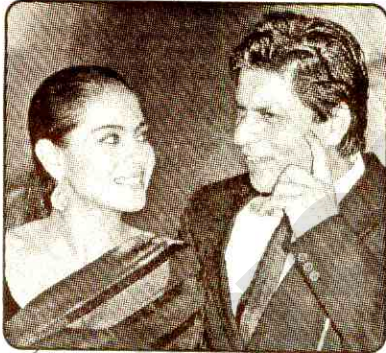
2016ء میں نمائش کے لیے پیش کردی جائے گی۔ خبریں گرم ہیں کہ رنویر سنگھ، ارجن کپور اور ورون دھون بھی کاسٹ میں شامل ہوں گے۔

موہنجوداڑو، پچاس کروڑ میں

بولی وڈ اسٹار ہریتک روشن اپنی نئی فلم 'موہنجوداڑو' کے لیے پچاس کروڑ معاوضہ حاصل کریں گے۔ جس نے انہیں ہندی سنیما کی تاریخ کا مہنگا

ترین اداکار بنادیا ہے۔ ایک سال میں ایک فلم میں کام کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا ہریتک روشن نے معاوضے کی دوڑ میں بولی وڈ خانز کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ موہنجو داڑو آشوتوش گواریکر کی تاریخی ڈرامہ فلم ہے۔

کنگ خان اور الیانا ڈی کروز

بولی وڈ اداکارہ الیانا ڈی کروز کو شاہ رخ خان کے ساتھ

کام کرنے کا موقع مل گیا۔ فلم 'فین' میں دونوں پہلی بار جلوہ گر ہوں گے۔ فلم 'برفی' سے بولی وڈ میں قدم رکھنے والی الیانا کو لیش راج کے بینر تلے بننے والی فلم 'فین' میں شاہ رخ خان کے ہمراہ کاسٹ کرلیا گیا ہے اور پوری اُمید ہے کہ **2015**ء کے اختتام تک یہ فلم نمائش کے لیے پیش کردی جائے گی۔

انجلی پاٹل کی اُمیدیں

تازہ ترین بولی وڈ ایوریج ہٹ 'فائنڈنگ فینی' میں

دپیکا' ارجن' ڈمپل اور نصیرالدین شاہ کے ساتھ ایک اور بھی کردار تھا۔ جس کی صرف چندمنٹ کی انٹری تھی۔ اور جی ہاں انجلی پاٹل نے جیسا سوچا ویسا ہی ہوا۔ ایک خوبصورت فلم میں چندمنٹ کی انٹری نے جیسے چاندنی میں جوہی چاؤلہ کو ''ڈر'' دلوادی تھی۔ اسی طرح انجلی بھی ناقدین اور فلم والوں کی نظروں میں آ گئی ہے۔ دیکھیے جی اب اسے کون بریک دیتا ہے۔ سو پلیز ویٹ اینڈ واچ، گڈ لک انجلی۔

سشانت سنگھ راجپوت اور پانی

بہت خبریں تھیں کہ شیکھر کپور کی فلم پانی میں سشانت سنگھ کاسٹ کرلیے گئے ہیں۔ کائی پوچے کے ہٹ ہونے کے بعد سشانت کی ساری اُمیدیں اس پراجیکٹ پر تھیں۔ مگر ہائے ری قسمت! اب تازہ ترین اسٹیٹمنٹ یہ سامنے آیا ہے کہ سشانت شیکھر کی پانی میں
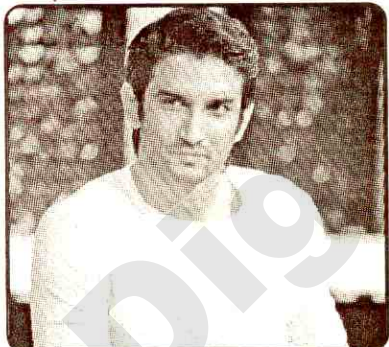
قطعاً نہیں ہیں۔ بلکہ ان کی جگہ یہ رول تو لکھا ہی ہریتک روشن کے لیے گیا تھا۔

ارے بھئی سشانت! دل چھوٹا نہ کرو۔ شروع میں سب ہی نے ایسی اسٹرگل کی ہے۔ آگے تمہارے حق میں یقیناً بہت اچھا ہونے والا ہے۔ ڈونٹ وری۔ بی ہیپی۔

متھیر اماں بن گئیں

پچھلے دنوں لولی وڈ کی بے باک اداکارہ متھیرا ایک بیٹے کی ماں بن گئیں۔ لیجیے ساتھیو! **2013**ء میں

پھرتیاں دکھانے والی متھیرا نے ایک ہائی جمپ مار کر سب

کو شٹ ڈاؤن کر دیا۔ متھیرا اور ان کے بے بی بوائے کے لیے بہت ساری دعائیں اور ہاں متھیرا بے بے بھی اپنے ہی کا نام صغیہ راز میں رکھا ہے۔ اِسے کہتے ہیں۔ آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام۔

محبّ مرزا اور صنم سعید ماریشس میں

اپنے تازہ ترین شو ''فراق'' میں ایک ساتھ نظر آئے۔ اب ان کے فینز کو انتظار تھا کہ وہ اب کیا کرنے

والے ہیں۔ لیجیے انتظار کی گھڑیاں ختم اور اب یہ دونوں ٹیلنٹڈ اسٹارز ماریشس میں اپنی آنے والی فلم ''لوشو'' کی شوٹنگ میں مصروف ہیں۔ ابھی سے سب کو اس شاہکار کا انتظار ہے۔ ساتھیو! آپ سب ان دونوں کو 13 فروری 2015ء کو سلور اسکرین پر دیکھ سکیں گے۔ **Wait & Watch**

میرا کے سپنے

موقع کوئی بھی ہو۔ ہماری لولی وڈ ڈول میرا اپنا حصہ ضرور ڈال لیتی ہیں۔ اور اُس حصے کی بدولت چار دن

خبروں میں بھی ''اِن'' ہو جاتی ہیں۔ اِدھر عوام دھرنوں میں مست تھے اُدھر ہماری اِن نیک بی بی'' کو عمران خان کو دیکھ دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھرتے سنا گیا اور نتیجہ..... کون بنے گا میراپتی، میرا جی نے فوراً بیان ہائی لائٹ کرا دیا کہ وہ عمران خان سے شادی کرنا چاہتی ہیں۔ عمران خان کو بھی تو تھوڑا **Refresh** ہونا تھا۔ اس خبر نے ان کو خوب گدگدایا اور نیا پاکستان کا جذبہ مزید **Strong** ہو گیا۔ سنا ہے میرا نے ایڈوانس میں ریاض کا نجی سے شادی کا جوڑا بھی تیار کرا لیا ہے۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔

کِل دِل کا ٹریلر ریلیز

علی ظفر، رنویر سنگھ، گووندا اور پرینیتی چوپڑا کی فلم ''

کل دل'' کا ٹریلر ریلیز ہوگیا۔ ڈائریکٹر شاد علی کی اس فلم کے ٹریلر کا عوام نے پر جوش خیر مقدم کیا۔ اس رومانٹک، کامیڈی فلم کا ٹریلر جہاں ناقدین میں پسند کیا جارہا ہے وہاں بگ بی نے بھی اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔

رنبیر کپور کی بدقسمتی

'بمبئی ویلوٹ' اپنی شوٹنگ کے پہلے دن سے بحران

کا شکار ہے۔ رنبیر کپور، انوشکا شرما اسٹارر یہ فلم مئی **2015**ء میں ریلیز ہونا تھی۔ مگر انوراگ کیشپ اس فلم میں آئے مسائل کی وجہ سے اب تک 'بمبئی ویلوٹ' مکمل نہیں کر سکے..... آہ! رنبیر اب دیکھو، کب جوانی دیوانی ہوکر تمہارے دن پھیرتی ہے۔

دعوتِ عشق

ادیتیا رائے کپور اور پرینیتی چوپڑا کی نٹ کھٹ

اداکاری سے سجی فلم 'دعوتِ عشق' باکس آفس پر شائقین کو متاثر کرنے میں کامیاب رہی۔

رومینس اور کامیڈی سے بھرپور یہ فلم اپنے پہلے دن میں ساڑھے چار کروڑ کا بزنس کر کے باکس آفس پر کامیاب ثابت ہوئی ہے۔ فلم کی کہانی حیدرآبادی سیلز گرل اور لکھنو کے باورچی پر مشتمل ہے۔ اب فلم کے چٹ پٹا ہونے کی تو یہ کردار پوری گارنٹی دے رہے ہیں۔ اب آپ بھی اِس دعوت عشق میں شامل ہوں اور اِس خوبصورت فلم کا مزا لیجیے۔

ہریتک V/S ٹام کروز

ساتھیو! ہاٹ اسٹار ہریتک روشن کی آنے والی فلم 'بینگ بینگ' کو ہولی وڈ کی ٹام کروز اسٹارر 'نائٹ اینڈ ڈے' کا ری میک قرار دیا جارہا ہے۔ پہلے تو روشن بابا انکار کرتے رہے مگر اب پوسٹر اور اِکا دُکا ٹریلر کی ریلیز
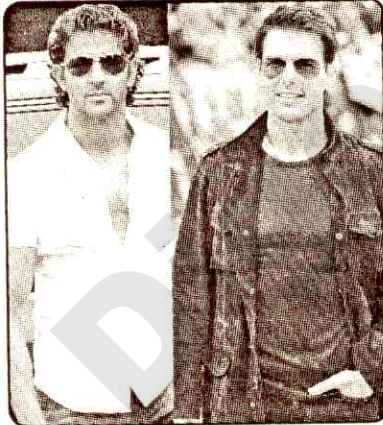
نے ان کا جھوٹ کھول دیا ہے۔ اب روشن جونیئر کہتے ہیں کہ ان کی فلم ''نائٹ اینڈ ڈے'' سے بڑھ کر بہت کچھ ہوگا۔ جو شائقین فلم کو چونکا دے گا۔ آپ نہ بھی کہتے تو بھی ہمیں یقین تھا کہ فلم میں واقعی بہت کچھ ہوگا۔ سو اب انتظار ہے سب کو اس **2014**ء کے معرکۃ الآراء شاہکار کا۔

☆☆......☆☆

نفسیاتی اُلجھنیں اور اُن کا حل

مختار بانو طاہرہ

زندگی اپنے ساتھ جہاں بہت ساری خوشیاں لے کر آتی ہے وہیں بہت سارے ایسے مسائل بھی جنم لیتے ہیں جو اس زندگی کو مشکلات کے شکنجے میں جکڑ لیتے ہیں اِن میں سے بیشتر الجھنیں انسان کی نفسیات سے جڑی ہوتی ہیں اور انہیں انسان از خود حل کرسکتا ہے۔ یہ سلسلہ بھی اُن ہی الجھنوں کو سلجھانے کی ایک کڑی ہے۔ اپنے مسائل لکھ بھیجیں، ہماری کوشش ہوگی کہ آپ ان مسائل سے چھٹکارہ پالیں۔

صوفیہ۔ کوئٹہ

: پیاری باجی! میں ہسٹری کی طالبہ ہوں۔ یونیورسٹی میں سب سے پہلے اخبار پڑھتی ہوں۔ ان خبروں کے بعد میرے دماغ کی جو حالت ہوتی ہے وہ بیان نہیں کرسکتی۔ اس جگہ جہاں اور بہت سے طالب علم مطالعے میں مصروف ہوتے ہیں، میرا دل چاہتا ہے کہ کہیں جا کر چھپ جاؤں، خاص طور پر خواتین کی ذلت برداشت نہیں ہوتی۔ معصوم بچوں اور بچیوں سے کی گئی زیادتی کی لرزہ خیز خبریں کتنی دیر تک دماغ سے چپکی رہتی ہیں۔ یا تو لائبریری جانا چھوڑ دوں یا پھر یونیورسٹی ہی نہ آیا کروں۔ خبروں سے پھر بھی دور نہیں رہ سکتی۔ ٹیلی ویژن جو ہے۔

: صوفیہ نرم دل اور حساس لوگوں پر ہی دوسروں کو پہنچنے والی تکلیف کا اثر ہوتا ہے۔ اس حوالے سے دو طرح کے رویے ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ دوسرے کی تکلیف کو اس طرح محسوس کریں کہ خود کسی کی مدد کرنے کے قابل نہ رہیں۔ جیسا کہ فی الحال آپ کے ساتھ ہو رہا ہے۔ دوسرا یہ کہ کسی کی تکلیف کے بارے میں پڑھیں یا سُنیں تو اس کی مدد کرنے کا جذبہ پیدا ہو۔ اس حوالے سے کوئی قدم اٹھایا جائے مثلاً آپ طالبہ ہیں۔ اخباروں میں مضامین، جن میں معاشرے میں ہونے والے جرائم پر قابو پانے کی تجاویز ہوں۔ ایک بات کا خیال رکھیں جب لائبریری امتحان یا ٹیسٹ کی تیاری کے لیے آئیں تو نصابی کتابیں پڑھیں، تاکہ یونیورسٹی میں پڑھنے کے مقصد کی تکمیل ہوسکے۔

حور فاطمہ۔ گجرات

: پیاری جی! میرا مسئلہ بہت عجیب ہے۔ منگنی کے بعد میرا وزن بڑھنا شروع ہوگیا۔ منگیتر ملک سے باہر ہیں۔ ان سے فون اور انٹرنیٹ پر بات ہوتی رہتی ہے۔ وہ مجھے بات کرتے ہوئے دیکھتے بھی ہیں مگر ان کو ابھی تک خیال نہیں آیا۔ میں ڈرتی ہوں کہ اگر وہ ملنے آگئے تو کہیں انکار نہ کردیں، حالانکہ وہ خود تو بہت ہی معمولی صورت شکل کے ہیں، عمر بھی زیادہ ہے مگر آج کل اچھے رشتوں کی کمی کی وجہ سے ڈر لگتا ہے۔

: حور! آپ کو ایک طرف اپنے وزن کے بڑھنے کا خیال ہے اور دوسری طرف یہ بھی احساس ہے کہ منگیتر معمولی صورت شکل کے ہیں۔ آپ ان کو پسند ہیں جب ہی تو انہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اب خواہ مخواہ اپنے دل و دماغ

میں وسوسوں اور اوہام کو جگہ نہ دیں، اس طرح اعتماد متاثر ہوگا، البتہ اپنا خیال رکھیں، وزن کو زیادہ بڑھنے سے روکنے کی مختلف تدابیر اختیار کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً خوراک پر کنٹرول اور ورزش وغیرہ۔

لائبہ عرفان۔ لاہور

پیاری باجی! میرے شوہر کی ملازمت کچھ اس نوعیت کی تھی کہ وہ ایک ماہ گھر پر اور چھ ماہ باہر رہتے تھے۔ اس وقت بچے چھوٹے تھے، مجھے ان کی توجہ کی ضرورت تھی مگر انہوں نے اپنے کام پر توجہ دی۔ بچے کچھ بڑے ہوئے تو میں نے بھی مصروفیت تلاش کر لی۔ اپنا بوتیک بنالیا۔ کپڑوں کی سلائی میں تو بچپن سے ماہر تھی، ڈیزائن کرنا بھی سیکھ لیا۔ اب میرا کاروبار اچھا چل رہا ہے اور وہ فارغ گھر پر بیٹھے رہتے ہیں۔ بچے بڑے ہوگئے ہیں، سب اپنی اپنی جگہ مصروف ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ شوہر مجھ سے خواہ مخواہ ناراض ہیں۔ انہیں غصہ آتا ہے تو صرف مجھ پر، اگر کوئی نفسیاتی مسئلہ ہے تو وہ بھی کہتے ہیں کہ تمہاری وجہ سے ہے۔ اس وقت میرا دل نہیں چاہتا کہ ان کے ساتھ رہوں۔

لائبہ! بات صرف اتنی ہے کہ ان کو آپ کی توجہ اور وقت چاہیے۔ انہوں نے مالی طور پر بے فکر رکھا، اسی لیے آپ نے بھی کام کرنا شروع کر دیا، باقی آپ کی صلاحیت اور محنت ہے جو ترقی ہوتی گئی۔ وہ خواہ مخواہ ناراض نہیں ہیں، ان کا حق ہے کہ گھر میں ان کی اہمیت اور موجودگی کو محسوس کیا جائے اور ان سے بے زار نہ ہوں۔

سہیل خان۔ حیدر آباد

باجی! میرا چھوٹا بھائی بہت ذہین ہے۔ جب وہ بات کرتا ہے تو کوئی اس کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا۔ ہر موضوع پر مدلل گفتگو کرنے کی صلاحیت ہے۔ مجھے خود اتنی معلومات نہیں۔ ہمارے رشتے دار اور دوست اس سے حسد کرتے ہیں، کہتے ہیں یہ تو نفسیاتی ہے مگر اس کو پروا نہیں ہوتی۔ ایک مسئلہ ہے وہ پہلے ہر کلاس میں نمایاں پوزیشن لیتا تھا اور اب کبھی ایک پیپر چھوڑ دیتا ہے تو کبھی پریکٹیکل نہیں دیتا۔ ہم لوگ سمجھاتے ہیں، ابو تو ڈانٹتے بھی ہیں۔ اس حوالے سے بھی اس کے پاس لمبی چوڑی باتیں ہوتی ہیں، جنہیں سُن کر ہم کچھ کہہ نہیں پاتے۔ دنیا کچھ بھی کہے، وہ کہتا ہے میں سب سے ٹھیک ہوں۔

بھیا! آپ کے خط کا آخری جملہ توجہ طلب ہے۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ کوئی ایک فرد پوری دنیا کے مقابلے میں اتنا ٹھیک ہو کہ اس کو کبھی بھی اپنی اصلاح کی ضرورت نہ ہو۔ ٹھیک وہ ہوتے ہیں جو دنیا کہے یا نہ کہے اپنی اصلاح و تربیت کرتے رہتے ہیں۔ ایک ذہین طالب علم کے لیے بلاوجہ پیپرز نہ دینا یا پریکٹیکل نہ کرنا اور امتحان پوری طرح نہ دینا اس کے بعد خود کو صحیح سمجھنا کسی بھی طرح مناسب نہیں۔ ذہین اور حاضر جواب لوگ بھی نفسیاتی مریض ہوسکتے ہیں اور ان کی پہچان اسی وقت ہوتی ہے جب یہ اپنی اہم ذمہ داریاں انجام دینے میں شدید کوتاہی اور سنگین غلطی کر بیٹھتے ہیں۔ اس پر اٹل بھی رہتے ہیں۔ بعض لوگ بڑی بڑی رقوم کاروبار کے نام پر ڈبو دیتے ہیں اور الزام دوسروں کو دیتے ہیں۔ ذہنی صحت کی علامت ذہنی امراض کی عدم موجودگی نہیں بلکہ معمولات اور معاملات کی درستگی ہے۔

نوٹ: اپنا مسئلہ بھیجتے ہوئے لفافے کے ایک کونے پر ''نفسیاتی مسائل'' ضرور لکھیں تاکہ آپ کے خطوط براہِ راست متعلقہ شعبے تک پہنچائے جاسکیں۔
خط وکتابت کے لیے:
110 آدم آرکیڈ، شہید ملت روڈ، بہادر شاہ ظفر روڈ۔ کراچی

نادیہ طارق

پیارے ساتھیو۔عیدالاضحیٰ کا تہوار جہاں مذہبی جوش و جذبے کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ وہیں عید کے موقع پر خواتین اور کچن لازم وملزوم ہوجاتے ہیں۔اسی مناسبت سے اس ماہ گوشت سے بنائے جانے والے دلچسپ پکوان کی تراکیب کچن کارنر کا حصہ ہیں۔اُمید ہے یہ تراکیب اپنی لذت اور انفرادیت کے باعث آپ کو داد دلائیں گی۔

گوشت کا پیزا

اجزاء

انڈر کٹ (لمبے ٹکڑے کرلیں)	آدھا کلو
دہی	125 گرام
پسا ہوا لہسن ادرک	2 چائے کے چمچے
کُٹی ہوئی لال مرچ	2 چائے کے چمچے
پسا ہوا دھنیا	2 چائے کے چمچے
چھنا ہوا میدہ	آدھا کلو
سُوکھا ہوا دودھ	3 کھانے کے چمچے
خمیر	3 چائے کے چمچے
چینی	2 کھانے کے چمچے
انڈے	2 عدد
ٹماٹر (چوپ کرلیں)	1 کلو
پیاز (چوپ کرلیں)	1 عدد
پسا ہوا ادرک	2 چائے کے چمچے
اوریگانو	آدھا چائے کا چمچہ
دارچینی	2 ٹکڑے
نمک	حسبِ ذائقہ
تیل	حسبِ ذائقہ
پنیر	6 سلائس

ترکیب:

میدے میں سُوکھا ہوا دودھ، خمیر، چینی، نمک، انڈے اور 2 چائے کے چمچے تیل ڈال کر گرم پانی سے گوندھیں اور آدھے گھنٹے کے لیے کسی گرم جگہ پر رکھ دیں۔ ٹماٹو ساس بنانے کے لیے فرائنگ پین میں ٹماٹر، ادرک، اوریگانو، دارچینی، پیاز اور آدھا چائے کا چمچہ نمک شامل کر کے گاڑھا کریں۔ ایک علیحدہ فرائنگ پین میں تیل گرم کر کے انڈر کٹ، دہی، لہسن، ادرک، لال مرچ، دھنیا اور حسبِ ذائقہ نمک ڈال کر گوشت نرم ہونے تک پکائیں۔ آٹے کی روٹی بیل لیں۔ روٹی کو سانچے میں سیٹ کر کے اس کے اوپر ٹماٹر کے ساس، گوشت اور پنیر کی تہہ لگائیں۔ سانچے کو پہلے سے گرم اوون میں 200°C پر 12 منٹ کے لیے پکا کر نکالیں اور ٹکڑے کاٹ کر پیش کریں۔

کباب بریانی

اجزاء

گائے کا قیمہ	آدھا کلو
ڈبل روٹی کا چورا	2 کھانے کے چمچے
ہری مرچیں	15 عدد
پسا ہوا لہسن	1 چائے کا چمچہ
پسی ہوئی لال مرچ	ڈیڑھ کھانے کا چمچہ
پسی ہوئی ہلدی	آدھا چائے کا چمچہ

پسا ہوا گرم مسالا	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
نمک	حسبِ ضرورت
چاول	آدھا کلو
ٹماٹر	3 عدد
پیاز (باریک کاٹ لیں)	3 عدد
ہرا دھنیا (چوپ کرلیں)	آدھی گڈی
پودینہ (چوپ کرلیں)	آدھی گڈی
آلو بخارا	آدھا پیالی
دار چینی	3 ڈنڈیاں
بڑی الائچیاں	3 عدد
لونگیں	4 عدد
گھی	آدھا پیالی
تیل	تلنے کے لیے

ترکیب:

چاول کو دو گھنٹے بھگونے کے بعد ایک کنی تک اُبال لیں۔ پیاز کو لال تل کر کاغذ پر نکال لیں۔ چوپر میں قیمہ، لہسن، 5 ہری مرچیں، آدھا کھانے کا چمچہ لال مرچ، ہلدی، آدھا چائے کا چمچہ گرم مسالا، ڈبل روٹی کا چورہ اور نمک ڈال کر باریک پیس لیں۔ قیمے کے آمیزے کے لمبوترے کباب بنا کر انہیں چند منٹ کے لیے اسٹیمر میں رکھیں اور پھر انہیں تیل میں تل لیں۔

فرائنگ پین میں تھوڑا سا گھی گرم کر کے دار چینی، لونگیں اور بڑی الائچیاں ڈال کر کڑکڑا لیں۔ اس میں ٹماٹر، آلو بخارا، ایک کھانے کا چمچہ لال مرچ، ایک چائے کا چمچہ گرم مسالا، نمک، آدھی تلی ہوئی پیاز اور 5 ہری مرچیں ڈال کر اچھی طرح سے بھون لیں۔ قورمے کے 3 حصے کرلیں۔ ایک دیگچی میں قورمے کے ایک حصے کی تہہ لگا کر اس میں آدھا چاولوں کی تہہ لگا دیں۔ چاولوں کے اوپر قورمے کا دوسرا حصہ، تھوڑا سا پودینہ، تلی ہوئی پیاز اور باقی ہری مرچیں چوپ کر کے ڈال دیں۔ اوپر سے باقی چاول ڈال کر ان کے اوپر کباب رکھیں۔ اب باقی پودینہ، دھنیا، باقی تلی ہوئی پیاز اور بچا ہوا قورمہ ڈال دیں۔ گھی گرم کر کے اس میں کالا زیرہ ڈال کر ہلکا سا کڑکڑائیں اور چاولوں پر بگھار لگا کر دم پر رکھ دیں۔

چپلی کباب

اجزاء

گائے کا قیمہ	1 کلو
پیاز (درمیانے سائز کی)	2 عدد
پسی ہوئی ادرک	1 کھانے کا چمچہ
گرم مسالا	1 کھانے کا چمچہ
پسی ہوئی لال مرچ	1 کھانے کا چمچہ
کُٹا ہوا دھنیا	1 چائے کا چمچہ
انڈے	2 عدد
انار دانہ	1 کھانے کا چمچہ
ہری مرچیں	3 عدد
ہرا دھنیا (چوپ کرلیں)	آدھی پیالی
ٹماٹر	4 عدد
مکئی کا آٹا	100 گرام
نمک	حسبِ ذائقہ
تیل	تلنے کے لیے

ترکیب:

چوپر میں قیمہ، پیاز، ہری مرچیں، لال مرچ، انار دانہ، ادرک، 2 ٹماٹر، نمک، مکئی کا آٹا اور انڈہ ڈال کر پیس لیں۔ اس آمیزے کو پیالے میں ڈال کر ہرا دھنیا اور گرم مسالا شامل کر کے ہاتھوں کی مدد سے یکجان کریں اور تھوڑی دیر کے لیے رکھ دیں۔ 2 ٹماٹروں کے گول قتلے کاٹ لیں۔ فرائنگ پین میں تھوڑا سا تیل ڈالیں۔ قیمے کا آمیزہ ہاتھ میں لے کر اسے ٹکیہ کی صورت میں فرائنگ پین میں ڈالیں اور ان کے اوپر ایک، ایک ٹماٹر کا ٹکڑا رکھ دیں۔ ایک جانب سے سنہری ہو جائے تو پلٹ کر پکائیں اور پھر

ڈش میں نکال لیں۔

☆گرم مسالا بنانے کے لیے 2 چائے کے چمچے کالی مرچ، 2 چائے کے چمچے سفید زیرہ ،2 چائے کے چمچے دھنیا اور 12 لونگیں باریک پیس لیں اور اس میں سے حسبِ ضرورت استعمال کریں۔

چلی ملی بیف

اجزاء

گائے کا گوشت	آدھا کلو
پسا ہوا لہسن ادرک	1 کھانے کا چمچہ
پسا ہوا پپیتا	2 کھانے کے چمچے
لیموں کا رس	4 کھانے کے چمچے
املی کا گودا	2 کھانے کے چمچے
ٹماٹو کیچ اپ	2 کھانے کے چمچے
چاٹ مسالا	آدھا چائے کا چمچہ
کٹی ہوئی لال مرچ	1 چائے کا چمچہ
کالی مرچ	1 چائے کا چمچہ
نمک	حسبِ ذائقہ
تیل	5 کھانے کے چمچے
شاشلک اسٹک	حسبِ ضرورت

ترکیب:

گوشت میں پپیتا، لہسن ادرک، 1 کھانے کا چمچہ تیل اور نمک لگا کر کم از کم 5 گھنٹوں کے لیے رکھ دیں۔ ہر شاشلک اسٹک پر 4 سے 5 بوٹیاں لگا کر چوڑے پیندے کے فرائنگ پین میں 4 کھانے کے چمچے تیل کے ساتھ ڈال دیں۔ فرائنگ پین پر ڈھکن ڈھانک کر گوشت گلنے تک پکائیں۔ درمیان میں ایک مرتبہ پلٹیں۔ ایک علیحدہ پیالے میں ٹماٹو کیچپ، لیموں کا رس، املی کا گودا، چاٹ مسالا، لال مرچ اور کالی مرچ ڈال کر آمیزہ تیار کرلیں۔ جب گوشت گل جائے اور پانی کم رہ جائے تو کیچپ کا آمیزہ شامل کرکے پانی خشک ہونے تک پکائیں۔ مزیدار بیف چلی ملی کو سرونگ ڈش میں نکال کر گرما گرم پیش کریں۔ چاہیں تو پیش کرنے سے پہلے کوئلے کی دُھونی دیں۔

گوشت اور پنیر کے کباب

اجزاء

گائے کا گوشت (بغیر ہڈی کا)	آدھا کلو
چیڈر پنیر	آدھا پیالی
ہری مرچیں	2 عدد
پیاز	2 عدد
پسا ہوا لہسن ادرک	1 کھانے کا چمچہ
انڈہ	1 عدد
بیسن	2 کھانے کے چمچے
ناریل کا پاؤڈر	4 کھانے کے چمچے
پسی ہوئی دار چینی	آدھا چائے کا چمچہ
ثابت سفید زیرہ	1 چائے کا چمچہ
پسا ہوا گرم مسالا	1 چائے کا چمچہ
پسی ہوئی لال مرچ	2 چائے کے چمچے
نمک	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
تیل	تلنے کے لیے آدھا پیالی

ترکیب:

پنیر کے لمبائی میں ٹکڑے کاٹ لیں۔ گوشت کو پیاز اور ہری مرچوں کے ساتھ چوپر میں ڈال کر باریک پیس لیں۔ آمیزے میں بیسن، ناریل پاؤڈر، گرم مسالا، زیرہ، نمک، دار چینی، لہسن ادرک، لال مرچ اور انڈہ ڈال کر یکجان کرلیں۔ ہاتھ میں ہلکا سا پانی لگا کر تھوڑا سا آمیزہ لے کر اس کے درمیان میں پنیر کے ٹکڑے رکھ کر لمبے کباب بنالیں۔ فرائنگ پین میں آدھا پیالی تیل گرم کریں اور کباب اس میں درمیانی آنچ پر سنہری رنگ آنے تک تلیں۔ کبابوں کو جاذب کاغذ پر نکال کر پیش کریں۔

☆☆......☆☆

حکیم جی!

محمد رضوان حکیم

ساتھیو! اکثر ہمیں کسی ایسی بیماری سے سامنا کرنا پڑتا ہے جس کے لیے ہمیں سمندر کی تہہ یا آسمان کی بلندیوں، جنگل بیابانوں یا پہاڑوں تک پر جانا پڑ جاتا ہے مگر...... جان ہے تو جہان ہے۔ خدا اگر بیماری دیتا ہے تو اُس نے شفاء بھی دی ہے۔ قدرت کے طریقۂ علاج کا آج بھی کوئی مول نہیں۔ حکمت کو آج بھی روزِ اول کی طرح عروج حاصل ہے۔ اسی لیے طبیب اور حکیم صاحبان کو خدائی تحفہ کہا جاتا ہے۔ آپ کی صحت اور تندرستی کے لیے ہم نے یہ سلسلہ بعنوان 'حکیم جی' شروع کیا ہے۔ اُمید ہے ہمارے مستند اور تجربہ کار حکیم صاحب آپ کی جملہ بیماریوں کے خاتمے کے لیے اہم کردار ادا کریں گے۔ نیا سلسلہ حکیم جی! آپ کو کیسا لگا؟ اپنی آراء سے ضرور آگاہ کیجیے گا۔

شوگر ختم کرنے کے لیے بہترین نسخے:

☆ شوگر کن وجوہات کی بنا پر ہوتی ہے۔
(1) لبلبے کی خرابی (2) انسولین کی کمی (3) اعصابی کمزوری (4) ڈپریشن

ذیابطیس:

جس کو حروف عام میں شوگر بھی کہا جاتا ہے یہ ایک ایسا مرض ہے جو زندگی کی رعنائیوں کو ختم کر کے انسان کو کم حوصلہ بنا دیتا ہے۔ یہ مرض لبلبلہ کی خرابی اور انسولین کی کمی سے پیدا ہوتا ہے۔ مگر قدرت نے انسولین کی کمی کو پورا کرنے کے لیے مختلف جڑی بوٹی اور سبزیوں کو انسان کی خوراک کے طور پر پیدا کیا ہے۔

وجوہات:

جب خون میں شکر کی مقدار بڑھ جاتی ہے تو جسم میں ہارمونز کی پیدائش کا عمل رک جاتا ہے۔ جس کی بناء پر کمر میں درد، جوڑوں میں درد، ہاتھ پیر کا سُن ہونا، بھوک زیادہ لگنا، دل کمزور ہو جانا، مثانے کی کمزوری، بار بار پیشاب آنا، چکر آنا، غصہ آنا، جسم میں خون کی کمی ہونا اور جسم پر ورم آ جانا، کم عمر میں

بڑھاپا محسوس کرنا۔
شوگر اور کمزوری کے لیے جو نسخے ہیں وہ یہ ہیں۔

نسخہ نمبر (1)

اندر جو تلخ	50 گرام
گڑمار بوٹی	50 گرام
پنیر ڈوڈی	50 گرام
اندرائن	50 گرام
تخم برس	50 گرام
کلونجی	50 گرام
کریلا خشک	50 گرام
میتھی دانہ	50 گرام

ان سب چیزوں کا سفوف بنا کر صبح و شام ایک ایک چائے کا چمچہ پانی سے کھائیں۔

نسخہ نمبر (2)

چرائتہ نیپالی	50 گرام
تخم جامن	50 گرام
تخم نیم	50 گرام
قسط شیریں	50 گرام
شاہترہ	50 گرام
مُنڈی بوٹی	50 گرام
عناب	50 گرام
رسوت	50 گرام

ان سب چیزوں کا سفوف بنا کر صبح و شام ایک ایک چائے کا چمچہ پانی سے کھائیں۔

نسخہ نمبر (3)

بادام	50 گرام
بھونے۔ چنے کالے	100 گرام
اندر جو تلخ	50 گرام
کاہی	50 گرام
گوند کتیرا	50 گرام
تخم علبہ	50 گرام
ثابت ہلدی	25 گرام
چاکسو	25 گرام

ان تمام چیزوں کا سفوف بنا کر صبح شام بکری کے دودھ کے ساتھ ایک ایک چائے کا چمچہ استعمال کریں۔

شوگر کی کمزوری سے نجات کا خاص نسخہ:

سفید موسلی انڈین	50 گرام
ستاور	50 گرام
اسگندھ	50 گرام
تخم نبولہ	50 گرام
قند شیریں	50 گرام
تالمکھانہ	50 گرام
گوند ببول	50 گرام
گوکھرو	50 گرام
گوند موچرس	50 گرام
لاجونتی	50 گرام
سورنجان شیریں	50 گرام

ان تمام چیزوں کا سفوف بنا کر صبح شام دودھ کے ساتھ ایک ایک چائے کا چمچہ روز استعمال کریں۔

پرہیز:
تمام میٹھی چیزوں اور تلی ہوئی چیزوں سے پرہیز کریں۔

☆☆......☆☆

آپ کے جانے پہچانے، اسکن اسپیشلسٹ **ڈاکٹر خرم مشیر**

ہر ماہ آپ کی بیوٹی سے متعلقہ مسائل کے حل کے ساتھ

قارئین! اس ماہ آپ کے گھونگریالے بالوں کو نیا لُک دینے کے کچھ ٹپس آپ کو دے رہا ہوں۔ امید ہے آپ اِن سے ضرور فائدہ اٹھائیں گی۔ یہ تو حقیقت ہے کہ گھونگریالے بال کسی کسی وقت بُری طرح اُلجھ جاتے ہیں اور عجیب وغریب لگنے لگتے ہیں مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ جن کے بال لمبے اور سیدھے ہیں، وہ گھونگریالے بالوں والی خواتین

ٹپس:

سچی بات یہ ہے کہ قدرتی گھونگریالے بال ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو اسٹائل دینا بہت مشکل ہوتا ہے اور ہر کسی کو پسند بھی نہیں آتا ہے۔ شارٹ کٹ بارش کے چند قطرے پڑتے ہی اُلجھ جاتے ہیں۔ نمی والی ہوا سے بھی یہ بال خراب ہوجاتے ہیں۔ درمیانی لمبائی والے بال ہوا تیز ہوتو پریشان کرتے ہیں اور

سے حسد کرتی ہیں جبکہ گھونگریالے بالوں والی سیدھے بالوں سے سے۔

جن خواتین کے لمبے اور گھونگریالے بال ہیں ان کو چاہیے کہ وہ ان پر توجہ دیں اور اسٹائل اپنانے میں احتیاط سے کام لیں۔

اگر بال زیادہ لمبے ہیں تو یہ ایسے نظر آئیں گے جیسے چڑیا کا گھونسلہ...... خوش قسمتی سے ان بالوں کو سنوارنا آسان ہوتا ہے۔ کئی اسٹائل ہیں جن کو آپ اپنا سکتی ہیں۔

☆ آخر گھونگریالے بال کیوں اُلجھ جاتے ہیں؟

اگر آپ ایک خاص عمل کرتی ہیں تو اچھے سے اچھا

شیمپو بھی آپ کے بالوں کو درست نہیں کر سکے گا......
آپ بالوں کو جلد از جلد شیپ میں لانے کے لیے گرما گرم ہوا بالوں پر ڈالتی ہیں مگر اس سے یہ ہوتا ہے کہ بال خشک تو ہو جاتے ہیں مگر ان میں قدرتی لہریں پیدا نہیں ہو پاتی ہیں اور یوں آپ کے بال اپنی اصلی شکل کھو جاتے ہیں۔

☆ بالوں کو حرارت پہنچانے کا ایک اور ذریعہ اسٹریٹنگ آئرن ہے۔ درست انداز میں کام کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آئرن خوب اچھی طرح گرم ہو، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بال وقتی طور پر سیدھے ہو جاتے ہیں مگر اس کی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے اور یہ کہ جب بال خشک اور ٹھنڈے ہو جاتے ہیں تو اُلجھ جاتے ہیں۔

☆ بال اگر شارٹ کٹ ہوں تو نتیجہ فوراً سامنے آنے لگتا ہے اور بال ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے لگتے ہیں۔ لمبے بال ہوں تو نتیجہ ذرا دیر میں نظر آتا ہے اور بالوں کے سرے دو منہ والے ہو جاتے ہیں۔ سیدھے لمبے بال والی خواتین جو بالوں کو رنگ کرتی ہیں، ان کے لیے بھی یہ عمل فائدہ مند نہیں ہے اور اس عمل سے بچنا چاہیے۔

☆ اس وقت دو ٹپس بہت زیادہ کارآمد ہیں۔ ایک تو یہ کہ شیمپو کی جگہ کنڈیشننگ پروڈکٹس کا زیادہ استعمال کیا جائے اور دوسرے یہ کہ بال جب قدرے گیلے ہوں تبھی انہیں اسٹائل دینے کی کوشش کرنی چاہیے۔ گھونگریالے بالوں کو آپ کون سا اسٹائل دینا چاہیں گی اس کا انحصار بالوں کی کٹ پر ہے۔ درمیانی کٹ کے لیے بالوں میں انگلیاں پھیر لینا ہی کافی ہوتا ہے۔

☆ جن خواتین نے مصنوعی طریقے سے بال گھونگریالے کر رکھے ہیں ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اچھے کنڈیشنر کا استعمال کریں۔ ایسے بالوں کو خشک نہیں چھوڑنا چاہیے ورنہ یہ سیدھے ہو جائیں گے۔ ان میں اور کچھ نہیں تو تیل لگا لیا کریں، ایسا تیل جو بالوں کی غذائیت سے بھرپور ہو۔

خاص بات:

اگر سیدھے بال کرلی کیے جا رہے ہوں تو بالوں کے ایک حصے کے ساتھ یہ عمل کریں اور بالوں کو سپورٹ دینے کے لیے کلپس اور پنوں کا استعمال کریں۔ اس طرح یہ ہوگا کہ اگر آپ کو اسٹائل پسند نہیں آئے گا تو بالوں کا ایک حصہ ہی متاثر ہوگا۔ بالوں کو اسٹائل دینے کے بعد پچھتانے سے بہتر ہے کہ بالوں کے ایک مختصر حصے کو اسٹائل دے کر دیکھ لیا جائے۔ اس طرح وقت اور پیسے دونوں کی بچت ہوگی۔

☆☆......☆☆